جدید اضافہ شدہ ایڈیشن

محبوبِ الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات

فوائد الفواد (اُردو) کا علمی مقام

قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبوی کی روشنی میں

مولانا سید اخلاق حسین قاسمی مدظلہ

مکتبہ اسعدیہ
(ناشرِ کتب)
پاکستان چوک، کراچی

حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیار حمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات

فوائد الفواد کا علمی مقام

قرآنِ کریم اور احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں

رشحاتِ قلم

حضرت مولانا سید اخلاق حسین قاسمی دہلوی مدظلہ

مفسر قرآن، مؤلف کتب کثیرہ

مہتمم مدرسہ عالیہ عربیہ فتح پوری مسجد دہلی

ناشر

مکتبہ اسعدیہ

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد روڈ، پاکستان چوک، کراچی

درود شریف

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی
اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ، اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی
مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ
وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ○

سلسلۂ اشاعت : ۱۳

اشاعت اول : محرم الحرام ۱۴۲۷ھ/فروری ۲۰۰۶ء

کتاب : فوائد الفواد کا علمی مقام

تحقیق : مولانا سید اخلاق حسین قاسمی مدظلہ

صفحات : ۴۲۴

کمپوزنگ : حامد احمد شرفی

اہتمام : مولانا ابن الرشید الحسینی

ناشر : مکتبۂ اسعدیہ، کراچی

قیمت : 180/=

اسٹاکسٹ

مکتبۂ رشیدیہ بالمقابل مقدس مسجد اردو بازار کراچی

فون:2767232

ملنے کے پتے

۱ : اسلامی کتب خانہ علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ ٹاؤن کراچی

۲ : حاجی امداد اللہؒ اکیڈمی مارکیٹ ٹاور حیدر آباد

۳ : مجیدیہ کتب خانہ اردو بازار بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

۴ : مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور

۵ : مکتبۂ قاسمیہ الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور

۶ : کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار، راول پنڈی

۷ : مکتبۂ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ

فہرستِ مضامین

عرض ناشر

اولیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عظیم شخصیات تھے، جن کو قرآن و حدیث اور فقہ پر بلکہ ائمہ اربعہ کے مذاہب کے دلائل پر بھی عبور تھا۔ آج کل اولیاء اللہ رحمہم اللہ سے نام نہاد محبت کا دعویٰ کرنے والوں نے ان کی تعلیمات کو ایسا رول بیک کیا کہ اصلیت ہی چھپ گئی، سطحی نظر رکھنے والا یہ ہی سمجھتا ہے کہ یہ تو (معاذ اللہ) مبتدع تھے۔ حالاں کہ ملفوظات اولیا سے موحد ہی معلوم ہوتے ہیں اور الحمد للہ ایسے ہی تھے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہٗ العزیز کے ملفوظات ''فوائد الفواد'' میں جو نکتے اور باریکیاں تھیں ان کو ہمارے مخدوم ومکرم حضرت مولانا سید اخلاق حسین صاحب قاسمی دہلوی دامت برکاتہم (مہتمم مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی اور خطیب مسجد مدرسہ حسین بخش دہلی) نے خوب خوب وضاحت کے ساتھ ان کے علمی مقام کو اجاگر فرمایا ہے۔ حقیقتاً ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی خدمات کتنی عظیم تھیں۔

حضرت قاسمی مدظلہ عمر کے اس دور میں جس میں ضعف بڑھتا ہی چلا جارہا ہے، اتنا عظیم کام تصنیف و تالیف کا انجام دے رہے ہیں، میں سمجھتا ہوں یہ صرف بائیس خواجوں کی چوکھٹ ''دلی'' کی سرزمین کا اثر اور برکت ہے۔ اللہ رب الرحمٰن مزید کام لے۔ آمین۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو صحت جسمانی اور ایمانی کے ساتھ طویل عمر عطا فرمائے۔ آمین

حضرت قاسمی مدظلہ نے زیر نظر کتاب ''فوائد الفواد کا علمی مقام'' ادارۂ رحمت عالم دہلی سے شائع فرمائی تھی۔ اس کا ایک نسخہ حسب سابق اپنے ہم عصر حضرت جدا مجد مولانا قاری شریف احمد صاحب مدظلہم کو بھی روانہ فرمایا۔ اس کو سامنے رکھ کر اسے جدید کمپوز کرایا گیا۔ حضرت قاسمی مدظلہم نے اس میں مزید اضافہ فرمایا اور اس کا مسودہ دہلی سے بذریعہ ڈاک ارسال فرمایا، ہم اس کے لیے حضرت کے ممنون ومشکور ہیں۔ وہ اضافہ کتاب کے آخر میں شامل ہے۔

تصحیح کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ لیکن پھر بھی ضرور کوئی نقص رہ گیا ہوگا۔ قارئین کرام سے گذارش ہے کہ اگر غلطی نظر آئے تو ناشر کو مطلع فرمائیں۔ بہ صد شکریہ اصلاح کی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کی اشاعت کو اولیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ سے محبت کا ذریعہ بنائے۔ آمین

ابن الرشید الحسینی غفرلہٗ

۱۹؍جمادی الثانی ۱۴۲۴ھ

۱۸؍اگست ۲۰۰۳ء

تقریظ

حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہٗ

خلف اکبر

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی علیہ الرحمہ

(بانی و مہتمم دارالعلوم (وقف) دیوبند)

حضرت المکرم مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی زید مجدکم تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج ''معارف التفسیر، اسلام کی کامیاب رہنمائی اور فوائد الفواد کا علمی مقام'' کے ناموں سے موسوم آں محترم کی جانب سے وقف کردہ ہدیہ گراں بہا موصول ہوا کہ جس نے راقم ممنون کو بہ حیثیت خادم ممنونیت وشکر گذاری کے حق واجب کی ادائیگی سے رسماً نہیں بلکہ حقیقتاً اعتراف عجز پر مجبور کردیا۔ آں محترم کے علمی مقالات سے اگر چہ وقتاً فوقتاً استفادے کا موقع ملتا رہتا ہے لیکن موصولہ کتب ثمینہ سے ان شاء اللہ قدرے فایدہ اٹھانے کا موقعہ میسر آئے گا۔

آں محترم کی ذات گرامی اس وقت دہلی جیسے مرکزی شہر میں وقت وبخت سے اعلام امت کی الحمد للہ مؤثر ترین قایم مقام ہے اور وقت وبخت کی اس قایم مقامی پر وہ شان انفرادیت پیدا کردی ہے کہ دور دور کوئی آں محترم کا ہم عنان وہم مقام نظر نہیں آتا۔

حق تعالیٰ محترم ذات گرامی کے اس فیض عمیم کو تادیر جاری رکھے اور ہمہ جہت قبولیت ارزانی فرمائے۔

ابتھل الی اللّٰہ عزوجل ان یعینک علی ھذہ المکانۃ المرفوعۃ وان یبارک فی جھودک ویجزیک خیر الجزاء.

(والسلام مع الاحترام)

احقر محمد سالم قاسمی

۸؍اگست ۱۹۹۵ء

تقریظ

جناب خلیق احمد نظامی مرحوم کا مکتوب گرامی

۲۵ر مئی ۱۹۹۵ء

محترمی، سلام مسنون

فوائد الفواد کا علمی مقام" پا کر بے حد مسرت ہوئی۔ اس ارمغان علمی کے لیے شکر گزار ہوں۔ آپ نے اس سلسلے میں جو محنت اور جاں فشانی کی ہے وہ لائق ستائش اور مبارک باد ہے۔

آج سے تقریباً ۴۰ سال قبل میں نے حیات عبدالحق محدث دہلویؒ میں لکھا تھا کہ فوائد الفواد کو پڑھتے وقت تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علم حدیث کا ایک ناپیدا کنار سمندر موجیں مار رہا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ نے تبصرہ کرتے ہوئے اس جملہ پر بالخصوص اعتراض کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ ایک اچھی کتاب کی غیر متوازن وصف آرائی ہے۔ آپ کی کتاب نے ثابت کر دیا کہ میں نے جو کچھ لکھا تھا وہ صحیح تھا۔

اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ یہ بہت اہم کام انجام پا گیا۔

والسلام
مخلص
خلیق احمد نظامی

پیش لفظ

۱۹۸۴ء کا واقعہ ہے کہ یہ ناچیز سلطان المشائخ حضرت مولانا نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی علیہ الرحمہ کے ملفوظات فوائد الفواد کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اس میں صَدقہ اور صدقہ (خیرات اور مہر) کی حکیمانہ تحقیق پر شیخ علیہ الرحمہ کی تقریر نظر سے گذری اور یہ زمانہ مسلم پرسنل لاء کی تحریک کا تھا۔

شیخ علیہ الرحمہ نے ان دونوں لفظوں کے اصل مادہ صدق (سچائی) کے لحاظ سے عورت کے مہر دین کو مرد و عورت کے ازدواجی رشتے کی سچائی کا نشان اور محبت و مودت کی علامت قرار دے کر عورت کے اخلاقی مقام کی اہمیت واضح کی ہے۔

یہ بحث فوائد الفواد (جلد اول) کی ۳۳ویں مجلس میں کی گئی ہے۔

یہ تحقیق حضرت محبوب الٰہی علیہ الرحمہ کے حوالے سے میں نے شایع کی اور اسے بہت پسند کیا گیا۔

میں اس فوائد الفواد کے مطالعے اور شیخؒ کے ارشادات عالیہ کے ساتھ عقیدت کی برکت ہی کہوں گا کہ انھی دنوں اس ناچیز کو خواب میں شیخ علیہ الرحمہ کی بشارت ہوئی۔

اس خاک سار نے دیکھا کہ حضرت سلطان جی علیہ الرحمہ ایک دیہاتی جھونپڑی میں قیام فرما ہیں۔ نہایت پر فضا مقام ہے۔ نہایت پر کشش شخصیت ہے۔ یہ ناچیز کافی دیر تک خدمت میں حاضر رہا۔ پھر حضرتؒ نے ایک پیالے میں سے پہلے خود کچھ نوش فرمایا اور اس کے بعد اس ناچیز کو عطا کیا جسے اس گناہ گار نے پی لیا۔

آنکھ کھل گئی، طبیعت پر کافی دیر تک اثر رہا، صبح کی اذان ہو رہی تھی۔ دل میں یہ احساس موجود تھا کہ یہ حضرت محبوب الٰہی علیہ الرحمہ تھے جن کی خواب میں زیارت نصیب ہوئی۔

راقم نے اپنے اس مبارک خواب کا تذکرہ اپنی خودنوشت یادداشت میں کیا ہے جو ناچیز کے مجموعہ مقالات (خطبات دہلی) کے ساتھ ۱۹۹۰ء میں شایع ہوئی ہے۔

لیکن اس خواب کے آٹھ سال کے بعد اس کی تعبیر آج میرے سامنے ہے اور

میں حضرت کے ملفوظات کی تشریح وتوضیح پر یہ کتاب پیش کر رہا ہوں۔ فالحمد اللہ علی ذلک

دیوبندی مکتبِ فکر کے مشائخ صوفیہ اگر چہ چاروں سلسلوں میں بیعت کرتے ہیں لیکن ہمارے شیخ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ فرماتے تھے کہ ہمارے اکابر پر چشتی نسبت غالب ہے۔ چناں چہ تفسیر، حدیث اور فقہ کی اعلا تعلیم و تدریس اور تحریک آزادی کی مجاہدانہ قیادت اور اس کے نتیجے میں قید و بند اور اسارت مالٹا کی قربانیوں کے ساتھ چشتی سلوک و تصوف (محبت خلق اور صبر و رضا) کی راہ میں ان حضرات کو جو بلند مرتبت حاصل ہوئی وہ اسلامی ہند کی تاریخ کا روشن باب ہے۔

اور اس ناچیز کی یہ علمی کاوش بھی انھی مشائخ کی نسبت کا ثمرہ ہے۔ ۱۹۸۴ء کے خواب کی تعبیر کس طرح سامنے آئی؟

اتفاق سے برخوردار ڈاکٹر شریف حسین قاسمی استادِ فارسی، دلّی یونی ورسٹی نے مجھ سے کہا کہ آپ نے فوائدالفواد کی ایک فقہی تحقیق کو جس انداز سے شائع کیا تھا اسی انداز سے اگر آپ پوری کتاب پر کام کریں تو یہ بڑا اہم کام ہوگا، اس کی ضرورت ہے۔

میرے لیے یہ مشورہ ایک الہامی اشارہ ثابت ہوا اور میں نے کام شروع کر دیا۔ الحمد للہ! خدا تعالیٰ کے خاص فضل و کرم اور حضرت شیخ علیہ الرحمہ کی روحانی توجہ سے فوائدالفواد کی ۱۸۸ مجالس میں سے اہم مجلسوں پر یہ تحقیقی کام مکمل ہوگیا۔

حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے مصنف جناب ڈاکٹر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے:

> ''کشف المحجوب کی سطریں جن ہاتھوں نے لکھی ہیں اور فوائدالفواد کے جملے جس زبان سے بولے گئے ہیں ان کے عظیم المرتبت (عالم) ہونے میں شبہ کرنا علم و دیانت کے خلاف ہے۔ فوائدالفواد پڑھتے وقت تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علم حدیث کا ایک ناپیدا کنار سمندر موجیں مار رہا ہے۔'' (صفحہ ۳۸)

یہ ایک حقیقت ہے، لیکن فوائدالفواد کو صرف حکایات کی ایک کتاب سمجھ کر پڑھنے

والے اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔

یہ کام اہلِ علم کا تھا لیکن بعض نزاعی مسائل اور بعض خانقاہی رسوم میں دونوں طرف سے انتہا پسندانہ جذبات کی فراوانی نے اہلِ علم کو فوائدالفواد جیسی اہم کتاب سے دلچسپی لینے سے باز رکھا۔

حالاں کہ حضرت محبوب الٰہی علیہ الرحمہ نے انسانی قلوب کے تزکیہ اور تحلیہ (صفائی اور سنوار) کے عظیم مشن کی انجام دہی کے ساتھ جو تاریخی کام انجام دیا وہ شریعت اور طریقت کے درمیان پیدا کی گئی دوری ختم کرنا تھا۔ اور یہ وہ عظیم کام تھا جو دوسری صدی ہجری میں مشہور جلیل القدر امام حدیث امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے بحسن و خوبی انجام دیا تھا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تصوف اور علم باطن کے لطائف و اشارات پر سب سے پہلے دوسری صدی ہجری کے مشہور صوفی حارث ابن اسد المحاسبیؒ نے قلم اٹھایا اور اس باب میں چند کتابیں تصنیف کیں۔

اگر چہ المحاسبیؒ سے پہلے بڑے بڑے جلیل القدر صوفی گذر چکے تھے، جن میں حبیب عجمیؒ، فضیل ابن عیاضؒ، ابراہیم ابن ادہمؒ، شقیق بلخیؒ اور ذوالنون مصریؒ جیسے اکابر شامل ہیں، مگر تصوف کے مسائل کو باقاعدہ کتابوں میں ظاہر کرنے والے المحاسبیؒ تھے۔

ان کتابوں سے پہلے اہلِ علم کی طرف سے حضرات صوفیہ کے خیالات اور اعمال پر صرف اشاروں اور کنایوں میں نکتہ چینی ہوتی تھی، لیکن جب المحاسبی کی کتابیں بازار میں آئیں اور مسلمانوں میں ان کتابوں کو قبول عام حاصل ہوا تو اب صوفیت پر کھلے عام سخت تنقیدیں شروع ہوگئیں۔

حد یہ ہے کہ المحاسبیؒ کے ہم عصر امام المحدثین حافظ ابوذرعہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کتابوں کے بارے میں یہ فرمایا:

هٰذَا كُتُبُ بِدْعٍ وَّضَلَالَاتٌ.

(تاریخ خطیب بغدادی۔ جلد ۸، صفحہ ۲۱۵)

"یہ کتابیں بدعت وگم راہی کی ہیں۔"

حافظ ابوزرعہؒ کی علمی جلالت شان کا یہ حال تھا کہ امام احمد ابن حنبلؒ فرمایا کرتے تھے کہ بغداد کے پل سے گذرنے والوں میں حافظ ابوزرعہؒ سے بڑا حافظ الحدیث کوئی نہیں، انھیں چھ لاکھ حدیثیں زبانی یاد تھیں۔

حارث محاسبیؒ نہ صرف تحریری تصوف کے امام تھے بلکہ صاحب حال اور صاحب اثر صوفی بھی تھے۔ حضرت جنید بغدادیؒ، محاسبیؒ کی مجلسوں کے فیض یافتہ تھے۔

محاسبیؒ کی شہرت سن کر امام احمد ابن حنبلؒ نے اسماعیل ابن اسحاق نیشاپوریؒ سے کہا کہ تم ایسا انتظام کرو کہ محاسبیؒ کو دعوت دو اور مجھے ایسی جگہ بٹھا دو جہاں سے میں ان کی باتیں سن سکوں مگر نظر نہ آؤں۔

اسماعیل ابن اسحاقؒ خود ایک بلند پایہ محدث اور امام احمدؒ کے شاگردوں میں سے تھے اور المحاسبیؒ سے بھی ان کا تعلق تھا۔

چناں چہ ایک مجلس کا اہتمام ہوا اور امام احمدؒ نے حارث محاسبیؒ کی زبان سے محبت، روحانیت، اور باطنی اخلاق کے رموز ولطائف پر ایک پر اثر تقریر سنی۔

اسماعیلؒ کہتے ہیں کہ حارثؒ اخلاق وروحانیت پر گفتگو فرما رہے تھے، اہلِ مجلس پر رقت طاری تھی یہاں تک کہ آدھی رات ہوگئی۔

اب میں نے اوپر جا کر امام احمدؒ کو دیکھا تو وہ روتے روتے بے ہوش ہو چکے تھے۔ میں پھر نیچے آگیا یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔

فَصَعِدْتُ اِلٰی اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ وَھُوَ مُتَغَیِّرُ الْحَالِ۔

(صفحہ ۲۱۵)

پھر میں اوپر گیا تو میں نے ابوعبداللہ احمد ابن حنبلؒ کو بدلی ہوئی حالت میں پایا، میں نے پوچھا اے عبداللہ! آپ نے ان لوگوں کو کیسا پایا تو، وہ بولے:

مَا اَعْلَمُ اِنِّیْ رَاَیْتُ مِثْلَ ھٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ وَلَا سَمِعْتُ عِلْمَ الْحَقَائِقِ مِثْلَ کَلَامِ ھٰذَا الرَّجُلِ۔

"میں نہیں جانتا کہ میں نے اس قسم کے لوگوں کو کبھی دیکھا ہے اور نہ میں

نے علم الحقائق پر ایسی گفتگو کبھی سنی ہے جو اس شخص سے سنی ہے۔"

اس وقت امام احمد ابن حنبلؒ کو خلافت عباسیہ کے ہاتھوں خلق قرآن اور کلام الٰہی کی محبت پر ظلم وستم برداشت کرنے پر مسلمانوں میں جو قبول عام اور محبت حاصل ہوگئی تھی اس کی مثال ائمہ دین میں کم ہی نظر آتی ہے۔

جس میدان میں امام کی نماز جنازہ ادا کی گئی، اس کی پیمائش کر کے یہ لکھا گیا ہے کہ اس میں تیرہ لاکھ آدمی سما سکتے ہیں۔ یہ میدان نمازیوں سے بھرا ہوا تھا اور ان میں مسلمانوں کے علاوہ یہود، نصاریٰ اور مجوسی بھی شریک تھے، جن میں سے چودہ ہزار کفار نے اسلام قبول کیا۔ (حلیۃ الاولیا، جلد ۹، صفحہ ۱۰)

اس مقبول عام ہستی نے جب صوفیاء کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا اور اس طبقے کی صداقت پر کھل کر اظہار خیال فرمایا تو فضا بدل گئی، تشدد اور انتہا پسندی اعتدال اور توازن میں تبدیل ہوگئی۔

پھر کون تھا جو اس جلیل القدر امام حدیث وفقہ کی تردید کرتا؟ پھر تاریخ کا لب ولہجہ ان الفاظ میں سامنے آیا:

"حارث محاسبیؒ ان پانچ عظیم ہستیوں میں سے ہیں جو علم ظاہر اور علم باطن دونوں قسم کے علوم کی جامع تھیں اور یہ پانچوں ایک ہی وقت میں جمع ہوگئے تھے، یعنی ابوالقاسم، جنید بغدادی، ابومحمد ردیم، ابوالعباس ابن عطاء، اور عمر ابن عثمان مکی علیہم الرحمہ۔" (تاریخ بغدادی۔ صفحہ ۲۱۵)

شیخ المشائخ محبوب الٰہی علیہ الرحمہ کی علمی اور روحانی شخصیت نے مولوی اور صوفی کے درمیان اتحاد اور اعتدال پیدا کرنے کی وہی جدوجہد کی جو دوسری صدی میں امام احمد ابن حنبلؒ کی طرف سے وقوع میں آئی تھی۔

اور اس ناچیز کے خیال میں شیخ علیہ الرحمہ کے ملفوظات عالیہ کا یہ خاص افادی پہلو ہے۔

شریعت اور طریقت کے درمیان فرق پیدا کرنے اور اہل شریعت کو اہل طریقت کے خلاف غم وغصے کے اظہار کا موقع اس دور میں جن بزرگ کے افادات سے ملاوہ

شیخ محی الدین ابن عربی علیہ الرحمہ ہیں۔ شیخ ابن عربیؒ کا سال ولادت ۵۶۰ ہجری ہے اور فتوحات مکیہ شیخ کی آخری تصنیف (۶۳۸ھ) ہے، اس کی تین سال کے بعد شیخ کا وصال ہوگیا۔

اسی دوران شیخ کی افادات کا سلسلہ جاری ہوا۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ شیخ ابن عربیؒ کے مجمل کلام اور مبہم اشارات کے خلاف جو طوفان اٹھا اور علامہ ابن تیمیہؒ کی سخت ترین تنقیدات نے سونے پر سہاگے کا کام انجام دیا اس سے حضرت محبوب الٰہیؒ ہندوستان میں بیٹھ کر بے خبر ہوتے۔

شیخ علیہ الرحمہ کا یہ مزاج و مذاق تھا جو ایک عملی صوفی کا ہونا چاہیے کہ آپ نے ہر غلط فہمی کا ازالہ فرمایا مگر اشارے اور کنایے سے بھی یہ ظاہر نہیں کیا کہ آپ کسی کے تصور کی تردید کررہے ہیں۔

حضرت محبوب الٰہیؒ اور ان کے مشائخ کبار اور جانشینان کرام تصوف کے نازک ترین مسئلے وحدۃ الوجود کو زبان پر لانا غلط سمجھتے تھے اور ایک نازک حال کو قال میں لاکر عام لوگوں کو الجھن میں ڈالنا ان حضرات کے نزدیک درست نہیں تھا۔

شیخ ابن عربیؒ وحدۃ الوجودی صوفی ہیں اور نازک حقایق کو ایسی اصطلاحوں میں عام لوگوں کے سامنے رکھتے ہیں جن کا سمجھنا ان کے بس کی بات نہیں۔

شیخ علیہ الرحمہ، شیخ ابن عربیؒ کا تذکرہ کرنے سے بھی گریز فرماتے ہیں اور تصوف و احسان کے مسائل کو براہ راست احادیث نبوی اور آثار صحابہ اور اقوال مشائخ کبار کی روشنی میں بیان کرتے ہیں۔

تاریخ تصوف ہند پر نظر رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ مشہور چشتی بزرگ حضرت سید محمد گیسو دراز علیہ الرحمہ جو حضرت محبوب الٰہیؒ کے خلیفہ حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے خلیفہ ارشد ہیں، وحدۃ الوجود کے خلاف کتنا سخت نظریہ رکھتے ہیں؟

محبوب الٰہیؒ کے دوسو سال کے بعد علامہ ابن عبدالوہاب شعرانیؒ نے الیواقیت والجواہر (تالیف ۹۵۵ھ) لکھی اور اس میں شیخ اکبرؒ کی فتوحات کی تصریحات کے

ذریعے شیخ اکبرؒ کے معترضین کو جواب دینے کی کوشش کی۔

لیکن ایک عملی صوفی جو اپنے اعلا اخلاق، حسن عبادت اور حسن خدمت کے ذریعے مقبول عام وخاص تھا اس کی زبان فیض ترجمان سے تصوف و طریقت کا چہرہ گردوغبار سے جس طرح صاف ہوا وہ صرف کتابی تردید و توضیح سے ممکن نہیں تھا۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ شریعت اور تصوف کی اس مرج البحرین کو نہ صرف عوام بلکہ خواص تک پہنچانے کی بھی پوری کوشش نہیں کی گئی۔

پچھلے سات سو برس کے اندر بقول محدث ہند حضرت شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ خاندان چشتیہ کے اس اہم دستور العمل کو اس کے علمی اور روحانی دونوں پہلوؤں کی تشریح اور توضیح کے ساتھ مختلف زبانوں میں شایع کیا جانا چاہیے تھا۔ اور تصوف کے ماننے والے اہل علم اس ذمے داری کو انجام دیتے لیکن ان بزرگوں کے مزارات پر ہونے والے عوامی ہنگاموں سے بے زار ہوکر اہل علم کا یہ طبقہ اس اہم علمی اور دعوتی کام سے بے تعلق رہا۔

آج جب کہ ہندوپاک کا جارحیت پسند طبقہ صوفیائے ہند کے خلاف بدگمانی پھیلانے میں مصروف ہے اور ہندوستان کے عقیدت پسند غیر مسلم عوام کو درگاہوں سے دور کرنے کی مہم میں لگا ہوا ہے، اس غفلت کا احساس ہونا چاہیے۔

کیا ہمارے پاس ہندو پاکستان کی مختلف مقامی زبانوں میں مشائخ ہند کی انسانی محبت، خدمت خلق اور وطن دوستی کے عظیم کارناموں پر ضروری لٹریچر موجود ہے؟

یہ بات اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے کہ مسلمان اہل علم کا ایک طبقہ (سلفیت پسند) صوفیائے کبار کے خلاف ایسے حالات میں گم راہ کن پروپیگنڈے میں لگا ہوا ہے، اور یہاں تک لکھا جارہا ہے کہ صوفیائے کبار کے ذریعے ہندوستان میں تبلیغ اسلام کا پروپیگنڈہ انگریزوں کی اس ڈپلومیسی کا حصہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر سے قربانی اور جہاد کا جذبہ ختم کردیا جائے۔ ڈاکٹر آرنلڈ کی پریچنگ آف اسلام کو اسی برطانوی ڈپلومیسی کی کتاب بتایا جارہا ہے کیوں کہ اس انگریز مصنف نے ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ کا سہرا صوفیائے کبار کے سر باندھا ہے۔

اس پڑھے لکھے گروہ کو صوفیائے ربانی کی کرامات کی مخالفت کے جوش میں یہ بھی نظر نہیں آتا کہ اس کتاب کی ترتیب واشاعت میں سرسید کی کوششوں کا بڑا دخل تھا اور سرسید کرامات اولیا تو کجا، معجزات انبیا کو بھی تسلیم نہیں کرتے تھے۔

بہر حال ہمیں شکر گزار ہونا چاہیے جناب خواجہ حسن ثانی صاحب کا کہ انھوں نے اپنے مرحوم والد حضرات خواجہ حسن نظامیؒ کی وصیت کے مطابق فوائد الفواد کا نہایت عمدہ اردو ترجمہ مع فارسی متن کے بڑے سلیقے واحتیاط سے مسلمانوں تک پہنچایا ہے۔

اسی کی مدد سے یہ ناچیز شیخ علیہ الرحمہ کے ملفوظات گرامی کے علمی اور حدیثی پہلوؤں کی تشریح پر یہ کتاب پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ کی ۱۸۸ مجالس میں سے ہر مجلس ایسی ہے جس میں حضرت شیخؒ نے اپنی فصیح وبلیغ فارسی زبان میں قرآن کریم اور احادیثِ نبوی کے مطالب کو کہیں تفصیل کے ساتھ اور کہیں اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔

مفصل احادیث کو چھوڑ کر اگر مختصر حدیثی اشارات کو بالاستیعاب لیا جائے، ان کی تشریح کی جائے اور ان کے مآخذ واضح کیے جائیں تو اس سے اصل کتاب کے مقابلے میں کئی ضخیم تر کتابیں وجود میں آجائیں گی۔

اس لیے اس ناچیز نے تشریح وتوضیح کے لیے ان خاص خاص مقامات کا انتخاب کیا ہے۔ جن میں احادیثِ نبوی تفسیر قرآن کریم کے اہم نکات ولطائف مضمر اور پوشیدہ ہیں اور ان سے شریعت وطریقت کے درمیان فرق کرنے والے تصورات کی تردید ہوتی ہے۔

اسی کے ساتھ بالاختصار شیخ علیہ الرحمہ کی تعلیمات کے عنوان سے شیخؒ کی ان نصیحتوں کو ترتیب دے دیا ہے جو عام مسلمانوں کے لیے مفید ہیں تاکہ پیش نظر مجموعہ اہلِ علم اہلِ تصوف اور عام مسلمانوں کے مطالعے اور استفادے کے لیے آسان ہو جائے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض مسائل (دو تین ہی ہوں گے) فقہائے شریعت اور صوفیائے طریقت کے درمیان شروع ہی سے مختلف فیہ چلے آرہے ہیں۔ ان مسائل

کی تشریح میں اس ناچیز نے نہایت اعتدال کے ساتھ سنجیدہ بحث کی ہے اور اس میں مناظرانہ رنگ پیدا نہیں ہونے دیا ہے۔ تاکہ تصوف پسند اور حضرات مشائخ سے وابستہ طبقہ ان مسائل کا مطالعہ کرتے ہوئے کسی قسم کا تکدر محسوس نہ کرے اور جو اصل مقصد فوائد الفواد کا اس ناچیز نے اوپر بیان کیا ہے، وہ قایم رہے اور پورا ہو۔

تو اب میں امید کرتا ہوں کہ اس محتاط انداز واسلوب میں لکھی جانے والی یہ تشریحی کتاب فوائد الفواد کے مقصدی مضامین کا ان شاءاللہ خلاصہ ثابت ہوگی۔

فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذَالِکَ.

اخلاق حسین قاسمی

۳ ر رجب المرجب ۱۴۱۳ھ

مطابق ۲۸ ر دسمبر ۱۹۹۲ء

تفسیر قرآن کریم پر شیخ المشائخ ؒ کی وسیع نظر

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا O (الفرقان: ۲۵)

شیخ علیہ الرحمہ کی نظر جس طرح احادیثِ نبوی پر نہایت وسیع اور محققانہ تھی، اسی طرح قرآن کریم کی تفسیر پر بھی آپ کو بڑا عبور حاصل تھا اور افادات کے وقت قرآنی لطائف و معارف آپ کے ذہن میں مستحضر رہتے تھے۔

قرآن کریم اور احادیثِ نبوی اسلام کے دو بنیادی اور اصولی ماخذ ہیں اور ان میں تمام دینی علوم تصریح کے ساتھ یا اشارات میں موجود ہیں۔ ایک عالم اگر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں صاحب نظر ہے تو وہ جملہ علوم دینی میں صاحب نظر تسلیم کیا جائے گا۔ فرق یہ ہے کہ کسی عالم کا خاص موضوع قوانینِ شریعت ہیں تو وہ فقیہ ہے اور اس کی پوری توجہ اسی موضوع پر ہوتی ہے، دوسرے موضوعات اس کی دل چسپی کا مرکز نہیں ہوتے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے قرآنی علوم کو پانچ بنیادی علوم پر تقسیم کیا ہے۔

۱۔ علم الاحکام: یہ علم فقہاء کا خاص موضوع ہے۔
۲۔ علم المناظرہ: یعنی باطل فرقوں کے عقاید کی تردید، یہ علم متکلمینِ اسلام کا موضوع ہے۔
۳۔ علم تذکیر بالآء اللہ: یعنی انعامات الٰہی کے ذریعے نصیحت کرنا۔
۴۔ علم تذکیر بایام اللہ: یعنی حوادث تاریخی کے ذریعے وعظ و نصیحت کرنا۔
۵۔ تذکیر بعد الموت: یعنی موت کے بعد واقع ہونے والے حوادث کے ذریعے وعظ و نصیحت کرنا۔

آخری تین علوم واعظوں اور معلمین اخلاق کا موضوع ہیں۔ (الفوز الکبیر، ص۴)

اس تقسیم کا تعلق عام معلومات سے نہیں ہے بلکہ خاص دل چسپی اور خاص مہارت سے ہے۔ اس تقسیم کے لحاظ سے شیخ علیہ الرحمہ المناظرہ کے منفی پہلو کے علاوہ پانچوں علوم پر حاوی نظر آتے ہیں۔

ردوکد اور تنقید چوں کہ تصوف کی روح سے مناسبت نہیں رکھتی، اس لیے اس کا اثر شیخؒ کے افادات میں محسوس نہیں ہوتا۔

علم الاحکام کے تعلق سے عبادت، طہارت، صدقہ اور مہر کی بحثیں، علم المناظرہ کے مثبت پہلو کے تعلق سے ایمانِ باس، ایمانِ غیب اور توبہ پر گفتگو۔ علم التذکیر کے تعلق سے ترغیب اور ترہیب۔

اور خوف ورجاء پر مشتمل حکایات کے ذریعے تزکیۂ اخلاق و عادات کا حصہ۔ جو ملفوظات میں غالب نظر آتا ہے۔ نحو ولغت جو علوم آلیہ کہلاتے ہیں، ان پر بھی شیخؒ کی گفتگو موجود ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

تفسیر کشاف اور تفسیر بیضاوی کا دور:

تفاسیر میں شیخ علیہ الرحمہ کا دور علامہ زمخشریؒ اور قاضی بیضاویؒ کی تفاسیر کا تھا۔ فوائد الفواد میں بیضاوی کو تفسیر ناصری کہا گیا ہے۔ یعنی اسے اس کے مصنف کے نام کی مناسبت سے موسوم کیا گیا ہے۔

علامہ جار اللہ زمخشریؒ:

علامہ جار اللہ محمود ابن عمر زمخشریؒ (ولادت ۴۶۷ھ/۱۰۷۵ء) کی تفسیر کشاف، علامہ ابن خلدونؒ کی رائے کے مطابق ایک بہترین تفسیر ہے مگر مصنف نے اس میں اپنے فاسد نظریات کی پرزور وکالت کی ہے۔ کشاف کا مطالعہ کرنے والا اگر اہلِ سنت کے عقاید سے واقف ہو کر اس کا مطالعہ کرے تو اس کا مطالعہ ضرر رساں نہیں۔ فقہ کے مسلک میں یہ حنفی تھے۔ (مقدمہ ابن خلدون:۴۹۱)

علامہ تاج الدین سبکیؒ نے زمخشریؒ کو حضرات انبیاء اور صالحینِ امت کی شان میں بے ادبی کرنے والا لکھا ہے، وہ اپنے والد علامہ تقی الدین سبکیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ وہ فرماتے تھے:

"زمخشری نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی ہے، اس لیے میں نے اس کتاب کی تدریس حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حیاء کرتے ہوئے بند کردی۔" (النماذج الخیریہ:۳۱۰)

شیخ علیہ الرحمہ نے ایک مجلس میں کشاف سے الحمد للہ کی نحوی ترکیب پر تقریر فرمائی اور اپنے شیخ الشیوخ خواجہ حسن بصریؒ کی قرأت پر حضرت ابراہیم نخعیؒ کی قرأت کو ترجیح دی اور یہ شیخؒ کے علمی ذوق کا نتیجہ تھا۔ اور پھر آخر میں الحمد کی دال اور اللہ کے لام سے ایک صوفیانہ نکتہ بیان فرمایا۔ یہ شیخ کا اصلی ذوق تھا۔

پھر علامہ زمخشریؒ کی علمی جلالت کا اعتراف کر کے ان کے معتزلانہ عقاید کی مذمت فرمائی اور شیخ صدر الدینؒ کے حوالے سے فرمایا کہ انھوں نے ایک شخص کو خواب میں دیکھا کہ اسے زنجیر میں باندھ کر لے جایا جارہا ہے۔ انھوں نے پوچھا، یہ کون ہے؟ انھیں بتایا گیا کہ یہ نحو مفصل لکھنے والا زمخشری ہے۔ (جلد۳، مجلس۱۱، صفحہ۵۶۱)

زمخشریؒ کے اعتزال کے باوجود اکابر صوفیہ اس تفسیر کی علمی عظمت کے سبب اسے اپنے مطالعے میں رکھتے تھے۔ قاضی حمید الدین صاحب ناگوریؒ کے پاس تفسیر کشاف آٹھ جلدوں میں مجلد رکھی ہوئی تھی۔

خواجہ حسن فرماتے ہیں:

"ایک روز میں نے دیکھا کہ شیخ علیہ الرحمہ کے سامنے تفسیر ناصری (بیضاوی) رکھی ہوئی ہے، آپ نے اس تفسیر کے مصنف قاضی ناصر الدینؒ کی ایک کرامت بیان فرما کر اس تفسیر کی عظمت و مقبولیت پر روشنی ڈالی۔" (جلد۲، مجلس۱۸، صفحہ۳۸۷)

اہلِ علم کی اس رائے کے بعد حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے شیخ صدر الدینؒ کے حوالے سے جو خواب بیان کیا ہے اس پر کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بات بھی ذہن

میں رکھنی چاہیے کہ خود شیخ نے اپنی مبارک زبان سے زمخشریؒ پر جہنمی ہونے کا حکم نہیں لگایا۔ یہ ایک طرف تصوف کے آداب کا تقاضا تھا اور دوسری طرف فقہی اصولوں کی رعایت تھی۔

فقہاء کا متفقہ اصول یہ ہے کہ جس غلط قول کی تاویل صحیح ہو سکتی ہے اور تاویل کر کے اس میں صحیح مفہوم کا پہلو نکالا جا سکتا ہے، اس قول پر کفر و ضلالت کا فتویٰ نہیں لگایا جا سکتا۔

کفر و جہنمی قرار دینے کے لیے ناقابلِ تاویل (کفر بواح) فاسد نظریہ ہونا چاہیے، خواب خواب ہی ہے۔ اور مذکورہ خواب کی یہ تعبیر بیان کی جا سکتی ہے کہ زمخشریؒ کے فاسد نظریات کی طرف اس خواب میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ورنہ فرقہ معتزلہ پر علمائے اہلِ سنت کی طرف سے جہنمی اور کافر ہونے کا فتویٰ نہیں لگایا گیا۔

امام عبداللہ ناصر الدین بیضاویؒ:

ان کا لقب ناصر الدین ہے اور بیضاوی نسبت ہے، شافع المسلک تھے، آذر بائیجان علاقے کے عظیم ترین عالم اور زاہد و عابد شمار کیے جاتے تھے، ان کی ولادت ۶۸۵ھ (۱۲۸۶ء) میں ہوئی۔ ان کی تفسیر کو علومِ حدیث، بلاغت، نحو اور درایت کے اصولوں پر مشتمل نہایت اعلا تفسیر کہا گیا ہے۔

فضائل کی موضوع روایات:

علامہ زمخشریؒ نے (اعتزالیت سے قطع نظر) ہر فن میں اپنی جلالت کا لوہا منوایا ہے۔ اسرائیلی روایات سے بھی اپنا دامن بچانے میں انھوں نے بڑی احتیاط اختیار کی ہے۔ مگر تعجب ہوتا ہے کہ علامہ نے قرآن کریم کی سورتوں کے فضائل میں ضعیف روایات کو بغیر کسی تامل کے نقل کر دیا ہے۔ زمخشریؒ کے بعد امام بیضاویؒ ہیں، ان کی محققانہ شان بھی ہر فن میں اپنی عظمت کو تسلیم کراتی ہے اور معتزلانہ تصورات کی تردید میں بھی قاضی صاحبؒ کسی اہلِ سنت مفسر سے پیچھے نہیں ہیں۔ مگر فضائل کی موضوع روایات

کے نقل کرنے میں قاضی صاحب علامہ زمخشریؒ کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔

قاضی صاحبؒ بڑے صاحب دل عالم تھے، صاحب کرامت تھے، ضعیف روایات نقل کرنے کے معاملے میں قاضی صاحبؒ کو مخلص عالم قرار دے کر معذور قرار دیا گیا ہے۔

صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے:

"قاضی صاحبؒ ایک صاحب اخلاص آدمی تھے۔ وہ لوگوں میں قرآن کریم کا ذوق و شوق پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اس باب میں چشم پوشی سے کام لیا۔" (جلد اول، صفحہ ۱۲۷)

اس دور کے مشائخِ تصوف کے سامنے یہی دو تفسیریں رہی ہیں، اس لیے ان حضرات کا کلام فضائل کی ان احادیث سے متاثر ہوا ہے۔

البتہ صاحب سیر الاولیاء امیر خوردؒ نے شیخ علیہ الرحمہ کے حوالے سے بعض آثار و اقوال ایسے نقل کیے ہیں جو فوائد الفواد میں نہیں ہیں اور نہ شیخ علیہ الرحمہ جیسے تحقیقی مذاق اور عشق نبوی سے منور دل و دماغ رکھنے والے بزرگ کی زبان پر ان کے جاری ہونے کا یقین کیا جا سکتا ہے۔

ان میں ایک وہ اثر ہے جس میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور سرور کون و مکاں صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان محبت کا جھوٹا افسانہ بیان کیا گیا ہے۔ (ہزار بار العیاذ باللہ)

اسی قسم کی روایات و آثار کو دلیل قرار دے کر پاکستان کے مشہور عالم پروفیسر یوسف سلیم صاحب چشتیؒ نے تاریخ تصوف میں چشتی حضرات کے افادات و ملفوظات میں الحاق و اضافے کا دعویٰ کیا ہے اور چشتی تصوف میں باطنیت اور شیعیت کی ملاوٹ دکھائی ہے۔ اس ناچیز نے الگ عنوان کے تحت اس پر بحث کی ہے۔

تصوف کی اشاراتی تفسیریں:

شیخ علیہ الرحمہ تفسیر قرآن کے باب میں اہلِ سنت مفسرین و محدثین کے مسلک پر قایم تھے اور تصوف کی اشاراتی تفاسیر کے لطائف بھی آپ کے افادات میں راہ نہیں

پاتے تھے اور تفسیر قرآن کا نازک باب اسی احتیاط کا مقتضی تھا۔

مولانا رومیؒ نے اپنی مثنوی میں حکایتوں کے ذریعے پند و موعظت کے دفتر کے دفتر تحریر کر دیے ہیں۔ لیکن مولاناؒ تفسیر کے معاملہ میں محدثین و فقہاء کے مسلک کی ترجمانی کرتے ہیں۔

معنی قرآن ز قرآن پرس و بس
وز کسے کاتش زدست اندر ہوس
پیش قرآن گشت قربانی و پست
تاکہ عین روح قرآن شدہ است

"یعنی قرآن کا مطلب قرآن سے پوچھو اور بس۔ ورنہ اگر تم اِدھر اُدھر ہوئے تو ہلاکت میں پڑ جاؤ گے۔ قرآن کے سامنے اطاعت کی گردن جھکا دو تاکہ تم قرآنی روح میں ڈھل جاؤ۔"

اشاراتی تفسیروں میں ایک تفسیر مشہور عارف باللہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ (۵۶۸ھ/۱۱۷۳ء) کی ہے اور ایک تفسیر مولانا رومیؒ کے ہم عصر ابو محمد شیرازی (وفات ۶۰۶ھ/۱۲۱۰ء) کی۔

صوفیہ کی اشاراتی تفسیروں کے متعلق اہلِ سنت کے عقائد کی مشہور کتاب العقائد النسفی میں لکھا ہے:

"نصوص کو ان کے ظاہر پر محمول کیا جائے گا، ظاہری معنی سے عدول کر کے ایسے معانی مراد لینا جن کا دعویٰ باطنیہ فرقے کے لوگ کرتے ہیں، دہریت اور الحاد ہے۔" (صفحہ ۱۴۳)

تاویل بعید کی مذمت محققین صوفیا کے ہاں:

مولانا رومیؒ قرآن کریم کی تفسیر کی اہمیت کو سمجھتے تھے کہ اس بنیادی کتاب ہدایت میں من مانی تاویلات کا دروازہ کھول دیا گیا تو اصل تعلیمات دین کی شکل و صورت بدل سکتی ہے، جس قسم کی تاویلات قادیانی اور مرزائی فرقے کی طرف سے کی جاتی

ہیں۔ اس لیے مولاناؒ فرماتے ہیں:

کردہ تاویل حرف بکر را
خویش را تاویل کن نے ذکر را
بد ہوا تاویل قرآں مے کنی
پست و کژ شد از تو معنی سنی
صاحب تاویل باطل چوں مگس
وہم او بول خرو تصویر خس

"یعنی اپنے آپ کو بدل، قرآن کریم کو کیوں بدلتا ہے؟ باطل تاویل جو شریعت کے مسلمہ عقائد و اصول کے خلاف ہو اس کی مثال بول خر کی طرح گندی اور ذلیل ہے۔"

گم راہ فرقے اپنے باطل نظریات کو سہارا دینے کی غرض سے حضرات صوفیا کرامؒ کے اشاراتی تصورات کو استعمال کرتے ہیں۔ مولانا رومیؒ نے اس کی مذمت کی ہے۔

موضوع تفسیری روایات کی تاویل:

حضرت سلطان المشائخ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً کی شان نرالی تھی، آپ دل کے صوفی تھے اور دماغ کے فقیہ تھے اور جس مقام پر دل اور دماغ کی کش مکش ہو جاتی تھی آپ پوری قدرت اور مہارت سے دونوں میں مصالحت کرا دیتے تھے۔

اب اس نزاکت کو سمجھے کون؟ غور کیجیے!

ایک موقع پر آپ نے سورۂ والنازعات کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"جو شخص نمازِ عصر کے بعد سورۂ والنازعاتِ غرقاً کی تلاوت کرتا ہے، اسے حق تعالیٰ زیادہ دیر تک قبر میں نہیں رکھتا اور وہ ایک نماز کی مقدار سے زیادہ قبر میں نہیں ٹھہرتا۔"

حضرت شیخؒ نے یہ احتیاط کی کہ اسے حدیث نہیں فرمایا۔ حالاں کہ یہ بشارت فضائل قرآن کی انھی موضوع روایات میں سے ہے جو مفسرین نے نقل کی ہیں۔

شیخ علیہ الرحمہ نے عام مسلمانوں کو ترغیب دینے کے خیال سے اسے نقل ضرور
کردیا، اور جس جذبے سے کیا وہ جذبہ بھی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کی صورت
میں ظاہر ہوگیا۔ شیخؒ پر رقت طاری ہوگئی۔ جو اس بات کی علامت تھی کہ یہ فضیلت بیان
کرنے والا اس وقت خشیتِ الٰہی سے مغلوب ہے اور سورۂ والنازعاتِ غرقاً کے معانی
اور مطالب (موت کی سختی اور عالمِ نزع کی وحشت) اس کے دل پر طاری ہیں۔

پھر ایک عقلی سوال شیخؒ کے دل میں پیدا ہوا جو ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہو سکتا
ہے جو عقل وفہم کے ساتھ اس فضیلت کو پڑھے گا۔

"فرمود کہ کسے کہ در گور نماند چگونہ باشد؟ گفت آنچنان باشد کہ
روح بکمال مے رسد، چوں روح کامل شد قالب را جذب می
کند!" (جلد۲، مجلس ۳۱، صفحہ ۴۶۳)

"جو شخص قبر میں نہیں رہتا تو یہ کیسے ہوتا ہے؟ جواب دیا، اس طرح ہوتا ہے
کہ جب روح انسانی کمال کو پہنچ جاتی ہے تو وہ جسم وقالب کو جذب کر لیتی
ہے۔"

علمائے متکلمین اور اہلِ عقل محدثین نے اس بات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ
روح انسانی جب کمال کو پہنچ جاتی ہے تو وہ جسم کی مادیت پر غالب آجاتی ہے اور جسم پر
روح کے آثار اور روح کی کیفیات (لطافت اور نورانیت) کا غلبہ ہوجاتا ہے۔

اس مفہوم میں جسم قبر سے غائب ہوجاتا ہے۔

امام ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اس مسئلے پر خاص طور پر روشنی ڈالی ہے اور اس کی
وضاحت کے لیے عالم مثال کی اصطلاح وضع کی ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ کا یہ باب مطالعے کے قابل ہے۔ جس سے عالمِ برزخ اور عالمِ قبر
کے بارے میں جو عقلی اشکالات پیدا ہوتے ہیں وہ دور ہوجاتے ہیں۔

خواجہ حسنؒ کا تفسیر میں تحقیقی ذوق:

سائل اور مجیب (خواجہ حسنؒ اور شیخ علیہ الرحمہ) دونوں کی نظر قرآن کریم پر گہری

تھی اور اسی لیے سوال وجواب میں تفسیر قرآن کے اہم نکات واضح ہوجاتے تھے۔
چناں چہ شیخ علیہ الرحمہ نے خواجہ جلال الدین تبریزیؒ کے حوالے سے یہ واقعہ نقل فرمایا
کہ کسی نے آپ سے سوال کیا کہ ایک شخص روزہ تو رکھتا نہیں، البتہ سحری کا کھانا کھاتا
ہے تو اس شخص کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

آپ نے فرمایا: اسے سحری کے ساتھ دن اور رات کا کھانا بھی کھانا چاہیے البتہ
اس کھانے سے جو قوت اسے حاصل ہوئی اسے خدا کی عبادت میں صرف کرنا چاہیے
اور گناہوں سے بچنا چاہیے۔

ظاہر ہے کہ یہ سوال وجواب نفلی روزے سے متعلق تھا۔ ورنہ فرض روزے کا رکھنا
تو لازمی ہے۔

خواجہ حسنؒ بولے، قرآن کریم کی اس آیت کا یہی مطلب ہے۔

كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ. (مومنون:۵۱)

"پاکیزہ چیز کھاؤ۔"

شیخ علیہ الرحمہ نے اس آیت کا دوسرا فقرہ ارشاد فرما کر اسے مکمل کیا۔ فرمایا پوری
آیت یہ ہے۔

كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا.

"پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔"

خواجہ حسنؒ نے اصحاب کہف کے قول کا حوالہ دے کر پوچھا، اس آیت میں
طیبات کے معنی پاکیزہ ہیں تو اصحابِ کہف کے اس قول کے کیا معنی ہیں۔ انھوں نے
اپنے ایک ساتھی کو کھانا لینے بازار بھیجا اور اس سے کہا۔

فَلْيَنْظُرْ أَيُّهَا أَزْكَى طَعَامًا. (کہف:۱۹)

"وہ کھانا لانے والا یہ دیکھے کہ کونسا کھانا پاکیزہ ہے۔"

عربی لغت کے اعتبار سے طیبات اور ازکی دونوں کا مفہوم پاکیزہ ہے اور اہلِ
تراجم نے دونوں جگہ پاکیزہ ترجمہ کیا ہے۔

خواجہ حسنؒ کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ دونوں جگہ ایک ہی مفہوم ہے یا دونوں

میں کوئی فرق ہے؟

شیخ علیہ الرحمہ نے بڑا لطیف فرق بیان کیا اور کہا:

''طعامے خواستند کہ طبائع بدان مائل باشد۔''

''یعنی ان کی مراد مرغوبِ طبع کھانا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ کھانا لانے والا ہمارا ساتھی ہے۔ جانتا ہے کہ ہمیں کونسا کھانا پسند اور مرغوب ہے۔ وہی کھانا بازار سے خرید لائے۔''

اصحابِ کہف (۳۰۹) برس کے بعد کرامتی نیند سے جاگے تھے اور اس شہر کی دنیا اتنے عرصہ میں بالکل بدل چکی ہوگی۔ اس لیے انھوں نے اپنے رفیق سے کہا کہ جو کھانا ہمیں مرغوب ہے وہ خرید کر لانا، خدا جانے اب بازار میں کس کس قسم کے کھانے پک رہے ہوں۔

زمخشریؒ جیسے نکتہ سنج مفسر نے ازکی کو حلال، طیب، اکثر اور ارخص (سستا) کے معنی میں لیا ہے۔

تفسیر مدارک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ اثر نقل کیا گیا ہے کہ اس شہر کے لوگ بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے، اس لیے اصحابِ کہف نے اپنے رفیق کو ہدایت کی کہ وہ ایمان والوں کا حلال ذبیحہ خرید کر لائے۔

سوال یہ ہے کہ اگر اصحابِ کہف کی یہی مراد ہوتی تو قران کریم کے پاس لفظ حلال موجود ہے وہ سیدھا اس لفظ کو استعمال کرتا۔

اسی طرح زمخشریؒ نے جن الفاظ سے تفسیر کی ہے وہ بھی قرآن کریم کے عربی لغت میں موجود ہیں، قرآن کے لیے ان الفاظ کا استعمال کرنا کیا مشکل تھا؟

قرآن کریم میں کئی جگہ، حلال اور طیب، **حَلٰلًا طَیِّبًا** دونوں لفظوں کو ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے، (بقرہ:۱۶۸، مائدہ:۸۸) مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ محاورۂ عرب ہے۔ اہلِ عرب دونوں لفظوں کو ساتھ ساتھ بہ طور تاکید کے بولتے تھے اور ایک قول مفسرین کا یہ ہے کہ بمعنی مستلذ بہ (جس سے کھانے والے کو لذت حاصل ہو) ہے۔ (جلالین۔ صفحہ۲۴)

حدیثِ نبوی میں شیخ المشائخؒ کی محققانہ بصیرت

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی O اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی O

(النجم:۵۳)

شیخ علیہ الرحمہ نے (۱۸۸) مجلسوں میں شریعت اور طریقت کے مختلف موضوعات پر روشنی ڈالی ہے اور ہر مسئلے میں قرآن کریم کی تفسیر، احادیثِ نبوی اور فقہ حنفی سے استدلال کیا ہے۔

جیسا کہ پیش لفظ میں کہا گیا ہے کہ صوفیائے کبار میں سلطان المشائخ کا علمی مقام آپ کی ولایت کی طرح ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے اور یہ امتیازی حیثیت آپ کے تحقیقی اور محدثانہ ذوقِ کامل کی وجہ سے نمایاں ہوتی ہے۔

عام طور پر تصوف کی کتابوں میں حدیثِ نبوی کے بارے میں تحقیق و تدقیق کا کام نہیں لیا گیا اور اس سہولت پسندی کی وجہ سے یہ بات مشہور ہوگئی کہ صوفیوں کی احادیث غیر معتبر ہوتی ہیں۔ لیکن یہ کمزوری حضرت سلطان المشائخؒ کے ملفوظات میں نظر نہیں آتی۔ یہاں حضرت شیخؒ کے اسی ماہرانہ ذوق کی وضاحت کی گئی ہے۔

ناچیز نے حضرت شیخ علیہ الرحمہ کی بیان فرمودہ احادیث کی تشریح و توضیح کے معاملے میں حضرت شیخ ہی کے اس اصول کو سامنے رکھا ہے کہ بخاری اور مسلم کی احادیث ہی صحیح ہیں۔ چناں چہ شیخ علیہ الرحمہ کی بیان فرمودہ احادیث کی صحاح کی حدیث کے ساتھ مطابقت کی جاتی ہے اور احادیثِ صحاح کے الفاظ اور متن کو سامنے رکھ کر تشریح کی جاتی ہے شیخ علیہ الرحمہ نے اپنا یہ اصول اس وقت بیان کیا جب ملفوظات کے مرتب حسن سجزی علیہ الرحمہ نے اپنے مرشد سے پوچھا۔ حضرت والا! یہ حدیث کیسی ہے؟

اَلسَّخِیُّ حَبِیْبُ اللّٰہِ وَاِنْ کَانَ فَاسِقًا ایک نسخہ میں کَافِرًا ہے۔یعنی سخی اللہ کا دوست ہے اگر چہ وہ فاسق یا کافر ہو؟ جواب میں فرمایا: لوگ اس کو نقل تو کرتے ہیں۔ایک صاحب بولے، چہل حدیث کے مجموعے میں اسے نقل کیا گیا ہے۔فرمایا:

''آنچہ در صحیحین است، آں صحیح باشد۔''

''جو کچھ صحیحین (بخاری و مسلم) میں ہے وہی صحیح ہے۔''

(مجلس ۹، جلد۲، صفحہ ۵۳۸)

اس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ علیہ الرحمہ کی نظر اس روایت پر تھی جو صحیح ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔پیش کردہ روایت کے الفاظ کو اس صحیح روایت کے الفاظ سے مختلف پا کر شیخ علیہ الرحمہ نے اس کی طرف سے بے اطمینانی کا اظہار فرمایا۔

صحیح ترمذی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

اَلسَّخِیُّ قَرِیْبٌ مِّنَ اللّٰہِ، قَرِیْبٌ مِّنَ الْجَنَّۃِ، قَرِیْبٌ مِّنَ النَّاسِ بَعِیْدٌ مِّنَ النَّارِ وَالْبَخِیْلُ بَعِیْدٌ مِّنَ اللّٰہِ، بَعِیْدٌ مِّنَ الْجَنَّۃِ، بَعِیْدٌ مِّنَ النَّاسِ، قَرِیْبٌ مِّنَ النَّارِ، وَالْجَاھِلُ سَخِیٌّ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ مِنْ عَابِدٍ بَخِیْلٍ.

''سخی اللہ سے قریب ہے، جنت سے قریب ہے، لوگوں سے قریب ہے، جہنم سے دور ہے اور بخیل اللہ سے دور ہے، جنت سے دور ہے، لوگوں سے دور ہے آگ سے قریب ہے اور جاہل سخی عبادت گذار کنجوس کے مقابلے میں اللہ کے نزدیک زیادہ محبوب ہے۔'' (مشکوٰۃ۔صفحہ ۱۶۴)

یہ بھی واضح رہے کہ صحیحین کے مصنف امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہم نے اپنی صحیحین میں تمام صحیح احادیث کا احاطہ کرلیا ہے اور ان احادیث کے علاوہ جتنی احادیث ہیں وہ غیر صحیح ہیں۔ چناں چہ ان دونوں حضرات سے جو صحیح احادیث رہ گئیں انھیں امام ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ اور ابن ماجہؒ نے مرتب کیا۔تو گویا ان چاروں کتابوں کی مرویات بھی صحت کے لحاظ سے صحیحین ہی کی روایات کہلائیں گی۔

شیخ علیہ الرحمہ نے اعمال صالحہ اور عبادات کی ترغیب کے سلسلے میں مشائخ کے عام طرز عمل کا لحاظ رکھا ہے اور اس باب میں آپ کمزور احادیث و آثار بھی نقل فرماتے ہیں اور ترغیب اور فضیلت اعمال کی روایات بھی بیان کرتے ہیں۔ عام طور پر امام غزالی علیہ الرحمہ کی احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت ان حضرات کے پیش نظر رہی ہیں اور احادیث کے معاملے میں امام غزالی علیہ الرحمہ نے جس توسع سے کام لیا ہے وہ اہل علم پر واضح ہے۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم کے مقدمے میں اس توسع اور نرمی کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

تَلَطُّفًا فِیْ اِسْتِدْرَاجِ الْقُلُوْبِ.

''نرمی کے ساتھ دلوں کو اس کتاب کے مضامین کی طرف مائل کرنے کے لیے ایسا کیا ہے۔''

یہی مصلحت حضرات صوفیا کے حلقے میں معمول کے طور پر نظر آتی ہے۔ اور حضرات محدثین وفقہا کا تعلق قانون اسلامی کی ترتیب و تنقیح سے ہوتا ہے اس لیے وہ حضرات صوفیائے کرام کے توسع پسندانہ نظریے سے اتفاق نہیں کر سکتے۔

احیاء العلوم کا حوالہ:

طبقہ صوفیا میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی تحقیقات کو درجۂ سند حاصل رہا ہے۔ چناں چہ شیخ علیہ الرحمہ نے ایک مجلس میں فرمایا:

''بیانے با تحقیق است اورا، آں گاہ فرمودہ کہ در احیاء العلوم مے آرد کہ الصوم نصف الصبر والصبر نصف الایمان۔''

''امام بڑی تحقیق سے بات کہتے تھے، احیاء العلوم میں آیا ہے کہ روزہ آدھا صبر ہے اور صبر آدھا ایمان ہے۔''

پھر شیخ نے اس کی تشریح فرمائی:

ایک مجلس میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے نمازوں کی تین قسمیں

بیان فرمائیں۔

۱۔ وہ نمازیں جن کا تعلق اوقات سے ہے۔ بعض ان میں روزانہ ادا کی جاتی ہیں۔ ایک نماز آٹھویں دن ادا کی جاتی ہے۔ دو نمازیں (عیدین کی) جو سال بھر کے بعد پڑھی جاتی ہیں۔

۲۔ وہ نمازیں جن کا تعلق سبب سے ہے، یہ دو نمازیں ہیں، ایک استسقاء کی دوسری سورج گرہن اور چاند گرہن کی۔

۳۔ وہ نمازیں جو نہ وقت سے تعلق رکھتی ہیں اور نہ کسی سبب سے، یہ صلوٰۃ التسبیح اور صلوٰۃ السلام (سلامتی کے لیے نماز) ہے۔

اسی مجلس میں نفل نماز با جماعت کے اختلافی مسئلے کا ذکر فرمایا، فقہا کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف ہے، شیخ علیہ الرحمہ نے حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے مطابق فرمایا: نفل با جماعت ادا کیے جا سکتے ہیں۔ حضرت بابا صاحبؒ نے مجھے شب برات میں نفل نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے کا حکم دیا اور مجھ سے اس کی امامت کرائی۔ (جلد۲، مجلس ۳۷، صفحہ ۴۸۴)

حاصل بحث یہ ہے کہ شیخ علیہ الرحمہ نے ترغیب اور ترہیب کے باب میں امام غزالیؒ کی کتابوں کو سامنے رکھا ہے اور محدثین کی وہ رائے اختیار کی ہے کہ اس باب میں توسع کی اجازت ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ نے اس قسم کی موعظت میں کہیں کہیں امام غزالیؒ کا نام لے دیا ہے ورنہ اکثر مجالس میں حوالہ دیے بغیر ترغیبی احادیث بیان فرمائی ہیں۔

تذکرہ نگاروں نے شیخ علیہ الرحمہ کی تعلیمی زندگی کے سلسلے میں صرف مشارق الانوار (حدیث کی اہم کتاب) کی تحصیل کا ذکر کیا ہے اور دلی کے چند مشہور محدثین سے حدیث کی سماعت نقل کی ہے۔

حیات شیخ محدث دہلویؒ کے مصنف لکھتے ہیں:

بعض مصنفین کا خیال ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے پہلے ہندوستان کے مسلمان علم حدیث سے ناآشنا تھے اور مشارق الانوار

کے علاوہ حدیث کی کسی کتاب سے واقفیت نہ رکھتے تھے، یہ خیال غلط ہے۔ آگے لکھتے ہیں۔

اگر اسلامی ہند کے ابتدائی دور کی کتابوں کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس زمانے میں علم حدیث کافی ترقی کر چکا تھا۔

کشف المحجوب کی سطریں جن ہاتھوں سے لکھی گئیں ہیں اور فوائد الفواد کے جملے جس زبان سے بولے گئے ہیں ان کے عظیم المرتبت ہونے میں شبہ کرنا علم و دیانت کے خلاف ہے۔ فوائد الفواد پڑھتے وقت تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علم حدیث کا ایک ناپیدہ کنار سمندر موجیں مار رہا ہے۔ (صفحہ ۳۸)

شیخ علیہ الرحمہ نے مشارق الانوار کے مصنف مولانا رضی الدین صنعانیؒ کے متعلق لکھا ہے کہ جب وہ بدایوں پہنچے تو وہاں کافی علما و محدثین موجود تھے۔

حضرت شیخ حمید الدین ناگوریؒ کے علم حدیث کے بارے میں یہ جملے ملتے ہیں:

''مرد را بست ہزار حدیث یاد باید تا محدث شود۔''

''انسان کو بیس ہزار حدیثیں یاد ہونی چاہئیں تا کہ وہ محدث ہو جائے۔''

اس سے اس دور علم حدیث کے چرچے کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

(مشائخ چشت)

حدیثِ نبوی کے مقابلے میں صوفیائے کرام سے اختلاف!

شیخ علیہ الرحمہ نے حدیثِ نبوی کے گہرے مطالعے کے ساتھ صوفیائے کرام کے خیالات و تصورات پر غور کیا ہے، چوں کہ خود صوفی ہیں، طبقۂ صوفیا سے عاشقانہ وابستگی رکھتے ہیں، اس لیے صوفیائے کرام کے عام تصورات میں سے جب کسی تصور کو حدیثِ نبوی کے خلاف سمجھتے ہیں تو صوفیانہ ادب آداب کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ اس اختلاف میں بھی شیخ علیہ الرحمہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کو اپنا ماخذ قرار دیتے ہیں، جو صرف ایک محدث و متکلم و فقیہ ہی نہیں بلکہ صوفی کامل بھی ہیں۔

صبر اور رضا کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے اور حالتِ رضاء میں دعا کی ضرورت واہمیت تسلیم کرتے ہوئے شیخ علیہ الرحمہ نے شیخ فرید الدین عطارؒ کے حوالے سے صوفیائے کرام کے عام تصور سے اختلاف کیا ہے۔

اور اس اختلاف میں شیخ علیہ الرحمہ کے سامنے صحیحین کی احادیث رہی ہیں اور ان احادیث کی تشریح میں امام غزالیؒ کا محققانہ کلام رہا ہے۔ (جلد۲، مجلس۹)

تفصیل آگے آرہی ہے۔

درسِ حدیث:

شیخ علیہ الرحمہ کو مشارق الانوار حفظ یاد تھی اور آپ نے امیر خوردؒ کے بیان کے مطابق اپنے استاد حدیث مولانا کمال الدین زاہدؒ (جو ایک واسطے سے مصنف کے شاگرد تھے) سے مشارق الانوار کی احادیث کا درس لیا اور احادیث پر بحث کر کے علم حدیث کے غوامض کو حاصل کیا اور صحت سند، واقعات وروایات کی انتہائی تحقیق کی۔
(سیر الاولیا، صفحہ ۳۰۷)

مشارق الانوار مولانا رضی الدین صنعانیؒ کی تالیف ہے، یہ بہت بڑے عالم حدیث وفقہ تھے اور حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے ہم عصر تھے۔ شیخ علیہ الرحمہ نے مولانا صنعانیؒ کی بڑی تعریف کی ہے۔

خواجہ حسن علیہ الرحمہ کے بیان سے ہمیں یہ بات معلوم ہوئی کہ شیخ علیہ الرحمہ مشارق الانوار کا درس بھی دیتے تھے، چناں چہ ایک ملاقات میں خواجہ حسنؒ نے دیکھا کہ شیخ علیہ الرحمہ اپنے ایک رشتہ دار خواجہ نوح کو مشارق الانوار پڑھا رہے ہیں اور کتاب الطہارت کی احادیث پر روشنی ڈال رہے ہیں اور اس درس میں طہارت جسمانی کے ساتھ روحانی طہارت کا ذکر بھی چھیڑ رکھا ہے جو شیخ علیہ الرحمہ کے تزکیہ اخلاق والے مشن سے تعلق رکھتا ہے۔ فرمایا:

راہ چلتے اگر کسی غیر محرم خاتون پر نظر پڑ جائے اور نفس کا میلان اس طرف ہو جائے تو اسے چاہیے کہ گھر جا کر اپنی اہلیہ سے ملے تاکہ نفس کے اندر پیدا ہونے والا

وسوسہ بالکل ختم ہو جائے۔ ازدواجی زندگی کی برکت کا اظہار کرتے ہوئے آخری فقرہ یہ فرمایا:

"یک خیریت مرد متاھل ایں است۔"

"ازدواجی زندگی کی ایک برکت یہ بھی ہے۔"

(مجلس ۴۸، جلد ۲، صفحہ ۴۸۸)

یہ حدیث کتاب النکاح عن جابرؓ (مشکوٰۃ صفحہ ۲۶۹ بہ حوالہ مسلم) کی ہے اور آخری فقرہ شیخ علیہ الرحمہ کا تشریحی ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ کے سامنے کتاب الطہارت کی حدیث **اَلْمُؤْمِنُ لَا یَنْجُسُ** (مومن نجس نہیں ہوتا) ہے اور تشریح کرتے ہوئے کتاب النکاح کی حدیث پر گفتگو شروع ہو جاتی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شیخ علیہ الرحمہ درس وتعلیم کے وقت یا ملفوظات کی تحریر کے وقت زیر نظر آیت وحدیث کے تمام ظاہری اور مخفی پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر اظہار خیال فرمایا کرتے تھے۔

حدیثِ نبوی کی پرکھ:

خواجہ حسن علیہ الرحمہ نے ایک مجلس میں ایک حدیث کے بارے میں تحقیق کی اور عرض کیا:

"یہ جو طریقہ ہے کہ ایک آدمی پانی پیتا ہے اور دوسرا اپنے ہاتھ آگے بڑھائے رکھتا ہے، کیا یہ طریقہ سنت ہے؟"

شیخ علیہ الرحمہ نے غور فرمایا: ایک صاحب مجلس میں سے بولے، یہ حدیث ہے کہ جو شخص کسی کے پانی پیتے وقت ہاتھ بڑھائے رکھتا ہے وہ ضرور بخشا جائے گا۔ اس شخص نے عربی کی ایک عبارت بھی پڑھی۔ اب شیخؒ نے فرمایا:

حدیث کی معتبر کتابوں میں یہ حدیث موجود نہیں ہے، ممکن ہے کہ یہ حدیث ہو، کسی حدیث کو سن کر یہ نہ کہنا چاہیے کہ یہ حدیث نہیں ہے۔ (مجلس ۱۰، جلد ۵، صفحہ ۹۷۵)

شیخ علیہ الرحمہ کا مطلب واضح ہے کہ کسی شخص کی نظر اتنی وسیع نہیں ہو سکتی کہ وہ حدیث کے متعلق یہ دعویٰ کرے کہ یہ حدیث نہیں ہے۔

خواجہ حسنؒ کا حدیث میں تحقیقی ذوق:

شیخ علیہ الرحمہ کے ملفوظات کے مرتب خواجہ امیر حسن سجزی علیہ الرحمہ کے علمی مذاق کی وجہ سے بھی شیخ علیہ الرحمہ کا تحقیقی مزاج کھلا ہے۔

حضرت محدث دہلویؒ نے اخبار الاخیار میں خواجہ حسنؒ کے متعلق یہ بات صحیح لکھی ہے کہ اور ادر میان فضلاے عصر عزتے ومکانے دیگر بود۔

”انھیں اپنے عہد کے علما میں خاص عزت ومنزلت حاصل تھی۔“

چناں چہ خواجہ حسنؒ شیخ کے ارشادات کو آنکھیں بند کر کے محض عقیدت کے ساتھ جمع نہیں کرتے تھے بلکہ ادب آداب کی رعایت کے ساتھ سوالات کرتے تھے اور ان کے سوالات کی وجہ سے حدیث و روایت کی حیثیت واضح ہو جاتی تھی۔

چناں چہ خواجہ حسنؒ نے ایک مجلس میں شیخ علیہ الرحمہ سے یہ روایت سنی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: عائشہ! سورج کے سامنے مت بیٹھو، اس سے چہرے کی طراوت اور تازگی جاتی رہتی ہے۔ اس روایت کے صحیح ہونے میں خواجہ حسنؒ کو تامل ہوا اور دوسری مجلس میں شیخ سے عرض کیا: بندے نے پچھلی مجلس میں آپ سے یہ روایت سنی تھی۔ اس پر یہ خیال آیا تھا کہ آپؒ سے پوچھوں کہ یہ حدیث کیسی ہے؟

شیخ علیہ الرحمہ سمجھ گئے کہ خواجہ کو شبہ ہوا ہے اور ٹھیک ہوا ہے۔ فرمایا: میں نے یہ روایت حدیث کی کسی کتاب میں نہیں دیکھی، بلکہ مولانا علاء الدین اصولیؒ سے سنی ہے جو بدایوں میں میرے استاد تھے۔ ”ایں حدیث در کتابے ندیدہ ام۔“ پھر مولانا کے فضائل بیان فرمائے۔ (مجلس ۳۴، جلد ۳، صفحہ ۲۴۰)

کمزور حدیث کو حکایت کہا:

خواجہ حسن علیہ الرحمہ نے شیخ علیہ الرحمہ سے حدیث کے نقل کرنے میں جو احتیاط

کی اس کی ایک مثال یہ ہے کہ شیخ نے غزوۂ احد کے بارے میں ایک واقعہ بیان فرمایا۔ خواجہ حسنؒ کے الفاظ یہ ہیں:

”آنگاہ ملائم ایں احوال حکایت فرمود کہ در حرب احد...... الخ۔“

جو واقعہ بیان فرمایا وہ حدیث کی کسی مستند کتاب میں مروی نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ تاریخ و سیرت کی کسی کمزور کتاب میں منقول ہو، اس لیے اس واقعہ پر حکایت کا اطلاق کیا، حدیث کے لفظ کا اطلاق نہیں کیا۔

واقعہ یہ بیان فرمایا کہ غزوۂ احد میں بہت سے صحابۂ کرامؓ شہید ہو گئے، جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور عرض کیا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ بھی ایک لمحے کے لیے ان شہدا کے درمیان لیٹ جائیں۔ یہاں تک کہ خدا کے غصے کی گھڑی گزر جائے۔ (جلد ۲، مجلس ۵، صفحہ ۳۴۹)

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ شیخ علیہ الرحمہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے صحابۂ کرامؓ کے اصحاب کہف کے غار تک اڑ کر جانے اور انھیں اسلام کی دعوت دینے کا حیرت انگیز واقعہ سنایا۔ خواجہ حسنؒ کہتے ہیں:

”سخن در قدرت باری عز اسمہٗ افتاد، دریں معنی حکایت فرمود کہ۔“

”قدرت خداوندی کے بارے میں شیخ علیہ الرحمہ نے حکایت بیان فرمائی۔“ (جلد ۳، مجلس ۳، صفحہ ۵۰۶)

یہ معلوم ہے کہ خواجہ حسنؒ ملفوظات کی تحریر کے بعد شیخ علیہ الرحمہ کی خدمت میں مسودہ پیش کرتے تھے اور شیخ اس کی تصحیح فرما دیتے تھے، وہ تصحیح شدہ خواجہ حسنؒ کے ذریعے ہم تک پہنچا۔

تقریر کے دوران حدیث کے الفاظ:

شیخ علیہ الرحمہ کی زبان مبارک پر احادیث نبوی کے خاص الفاظ چڑھے ہوئے تھے اور آپ ان لفظوں کے ذریعے اپنی بات میں ایک خاص مفہوم پیدا کر دیتے تھے، لیکن ان الفاظ کے اصل مفہوم کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔

ملفوظات کے اردو مترجم صاحبان بھی ان الفاظ کی باریکی کو سمجھنے سے قاصر رہے اور اس وجہ سے شیخ علیہ الرحمہ کی بات کا حقیقی مفہوم اردو داں طبقے کے سامنے نہ آسکا۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ شیخؒ نے مردوں اور عورتوں کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے مشائخ کے توسل کی بحث میں فرمایا:

''نیک زنان غریب باشند۔''

مترجم صاحب نے اس کا ترجمہ کیا: ''نیک عورتیں کم ہوتی ہیں۔''

گفتگو یہ تھی کہ مشائخ نیک عورتوں اور نیک مردوں کے وسیلے اور حرمت سے دعا کرتے ہیں اور اس دعا میں نیک عورتوں کو مقدم رکھتے ہیں۔ اس کا سبب بیان کرتے ہوئے شیخؒ نے اوپر والا فقرہ ارشاد فرمایا۔ (جلد ا، مجلس ۲۰، صفحہ ۲۵۸)

شیخؒ کی گفتگو میں اگر غریب کا عربی لفظ قلیل کے معنی میں ہو تو یہ دلیل بے معنی ہو جاتی ہے۔ شیخؒ نے یہ لفظ مشہور حدیثِ نبوی کا استعمال فرمایا، حدیث میں آیا ہے۔

بَدْءُ الْاِسْلَامِ غَرِيبًا وَسَيَعُوْدُ غَرِيبًا فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَآءِ۔

''اسلام کی ابتداء اس حال میں ہوئی کہ وہ ایک اجنبی چیز تھا اور جب آخر وقت آئے گا تو پھر ایک اجنبی اور عجیب چیز بن جائے گا۔''

سو بشارت ہے ان لوگوں کے لیے جو اس وقت اسلام سے وابستہ ہونے کی وجہ سے خود بھی معاشرے میں اجنبی اور غیر مانوس افراد بن جائیں گے۔

شیخؒ نے اسی مفہوم میں عورتوں کے لیے غریب کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی نیک عورتیں معاشرہ میں گم نام اور غیر معروف ہوتی ہیں۔ لوگ انھیں جانتے بھی نہیں۔

وہ پردہ نشین طبقہ جو نہ امامت کے لیے مصلے پر کھڑا ہو سکتا ہے اور نہ خلافت کا فرض ادا کرنے کے لیے مسند حکومت پر بیٹھ سکتا ہے اور نہ بیعت و ارشاد کی امامت سنبھال سکتا ہے۔

یہی وہ گم نامی ہے جو مردوں کے مقابلے میں عورت کے اعمال خیر کے اندر اخلاص توجہ الی اللہ اور رضائے حق پیدا کر دیتی ہے۔

قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت:

حضرات صوفیا کے یہاں نسبت اور تعلق کی بڑی اہمیت ہے۔ حضرت سید حسن رسول نما علیہ الرحمہ کا قصہ مشہور ہے کہ وہ ایک موضوع حدیث۔ **اَنَا اَحْمَدُ بِلَا مِيْم** میں بلا میم کا احمد یعنی احد ہوں کو رد کرنے کے بجائے اس کی تاویل کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس کا مطلب یہ ہے۔ **اَنَا لِاَحَدٍ كَاَحَدِكُمْ** یعنی تمہارے ہی مانند ایک انسان ہوں۔

ان کا جذبہ یہ تھا کہ جس قول کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو خواہ وہ غلط ہی ہو، اس کا احترام کرنا چاہیے۔ اسی جذبے کے تحت دہلی کے قدم شریف کا یہ طبقۂ صوفیاء ادب کرتا تھا۔

حضرت سید صاحبؒ پر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا اس قدر غلبہ تھا کہ جس شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے دوردشریف بتا دیا کرتے تھے اور وہ اس پر عمل کرتا تھا تو اسے زیارت نبوی کا شرف حاصل ہو جاتا تھا۔

پھر ایک صحیح قول نبوی کی قرأت کی برکت حضرات صوفیا کے یہاں کس قدر ہوگی؟

چناں چہ شیخ علیہ الرحمہ نے مولانا رضی الدین نیشا پوریؒ اور ان کے ایک پڑوسی عالم کا واقعہ نقل کر کے یہ حقیقت لوگوں کو بتائی اور فرمایا:

مولانا بیمار تھے، ان کا پڑوسی عالم عیادت کے لیے آیا اور اس نے ایک حدیث ان کے سرہانے پڑھی۔

اَلْغِيْبَةُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَاءِ۔

''غیبت کرنا بدکاری سے شدید گناہ ہے۔''

مولانا نے ان سے پوچھا کہ اس حدیث کے پڑھنے کا یہ کیا موقعہ محل ہے؟ وہ عالم بولے: میں نے یہ سنا ہے کہ جس بیمار کے سرہانے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث پڑھی جاتی ہے وہ بیمار صحت مند ہو جاتا ہے۔ چناں چہ مولانا نیشا پوریؒ کو اس بیماری سے صحت حاصل ہوگئی۔ (جلد ۵، مجلس ۱۰، صفحہ ۹۷۷)

حضرت اویس قرنیؒ کی روایت:

خواجہ حسن علیہ الرحمہ کو اس اثر میں بھی شبہ ہوا جو خواجہ اویس قرنیؒ کی طرف منسوب ہے۔ جس میں ماہ رجب کے نوافل اور ان میں پڑھی جانے والی دعا کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

خواجہ اویس قرنیؒ یمنی بڑے جلیل القدر تابعی ہیں۔ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد پایا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہونے کا موقعہ نہیں مل سکا، کیوں کہ اپنی ضعیف ماں کی خدمت میں مشغول رہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی غائبانہ بڑی تعریف فرمائی اور انھیں خیر التابعین کے لقب سے نوازا اور حضرت عمرؓ کو ہدایت فرمائی کہ ان سے مل کر ان سے اپنی مغفرت کی دعا کرانا۔

علماء و مشائخ میں حضرت امام حسن بصریؒ کے بعد حضرت اویس قرنیؒ کا مرتبہ تسلیم کیا گیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب **اَلْاِنْتِبَاہُ فِی السَّلَاسِلِ** میں لکھا ہے کہ صوفیا کے بعض سلسلے حضرت اویس قرنیؒ پر ختم ہو جاتے ہیں جو اویسی کہلاتے ہیں۔

حضرت اویس قرنیؒ پر زہد و جذب کا غلبہ تھا، آپ کے ہم عصر تابعی ہرام ابن حیارہؒ کا بیان ہے کہ جب میں نے بڑی تلاش کے بعد کوفہ میں حضرت اویس قرنیؒ سے ملاقات کی اور ان سے درخواست کی کہ آپ کوئی حدیثِ نبوی سنا دیں تا کہ میں اسے آپ کے تبرک کے طور پر محفوظ رکھوں تو آپ نے انکار کر دیا اور فرمایا: مجھے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی روایتیں پہنچی ہیں مگر میں روایت حدیث کا دروازہ کھول کر اپنے آپ کو محدث، فقیہ اور قاضی کہلوانا پسند نہیں کرتا۔ (تابعین دار المصنفین۔ صفحہ ۴۰)

شیخ محبوب الٰہی رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے جب خواجہ حسنؒ نے فضیلت ماہ رجب کے بارے میں حضرت اویس قرنیؒ کے قول کی تحقیق کی کہ یہ قول کیا ہے؟

''فرمود کہ ایں معانی از الہام ہم باشد۔''

(جلد ۴، مجلس ۳۹، صفحہ ۸۳۸)

یہ باتیں الہام سے بھی تعلق رکھتی ہیں۔........سوال کیا تھا کہ

از حضرت رسالت شنیدہ است یا از صحابۂ کرامؓ، یہ فضیلت حضرت اویس قرنیؒ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی یا حضرات صحابۂ کرامؓ سے سنی؟

آپ نے دونوں کی تردید کی اور اسے الہام حق قرار دیا۔ ظاہر ہے حضرت اویس قرنیؒ کی سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات نہیں ہوئی البتہ آپ نے صحابۂ کرامؓ کو دیکھا اور ان سے ملاقات کی۔

لیکن چوں کہ حضرت اویس قرنیؒ کا صحابۂ کرامؓ سے روایت کرنا بھی ثابت نہیں اس لیے آپ نے اسے الہام قرار دیا۔

اس جواب سے ایک طرف حدیث کے بارے میں حضرت شیخؒ کی وسعتِ معلومات اور کامل احتیاط کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری طرف حضرت اویس قرنیؒ کی جلالت قدر کا اعتراف نکلتا ہے۔

فضائل کی احادیث اور آثار بعض واعظوں سے بھی منقول ہیں جو وعظ گوئی میں رنگ آمیزی کے لیے اس طبقے نے پھیلائی ہیں جیسا کہ جادو کی بحث میں امام ثعلبیؒ کے بارے میں آتا ہے اور جس کی تفصیل جادو کی بحث میں کی گئی ہے۔

حضرت اویس قرنیؒ کا تعلق اس قصہ گو واعظ طبقے سے نہیں تھا بلکہ آپ ایک بلند پایہ عبادت گذار اور دنیا سے مکمل طور پر بے رغبت انسان تھے، اس لیے آپ کی زبان مبارک سے بعض نفل نمازوں اور دعاؤں کی جو فضیلت نکلی اسے الہام کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے؟

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے خواجہ اویس قرنیؒ کے نوافل پر جلد اول مجلس اکیس صفحہ دو سو چھپن میں تفصیل کے ساتھ گفتگو فرمائی ہے۔ وہاں دیکھا جائے۔

طبقۂ صوفیا کو بدنام کرنے کی سازش:

یہ بات تو مسلم ہے کہ حضرات صوفیا فضائل و ترغیب کی روایات کے معاملے میں نہایت توسیع پسند واقع ہوئے ہیں، لیکن یہ بات بھی نا قابل یقین ہے کہ ان حضرات نے اس باب میں ایسی موضوع اور من گھڑت روایات قبول کی ہیں جو منصب رسالت

کے بالکل منافی ہیں اور پڑھنے والا ان روایات کو پڑھ کر انھیں مذاق اور استہزاء کا موضوع بناتا ہے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحمتہ اللہ علیہ (ولادت ۷۰۷ھ) کو مستند مورخین، شیخ عبدالحق دہلویؒ، نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ اور مولانا سید عبدالحی صاحب لکھنویؒ نے علم حدیث وفقہ میں ید طولیٰ کا مالک اور علم ظاہر و باطن کا جامع تسلیم کیا ہے۔ انھی مخدوم صاحبؒ کی طرف ایک کتاب ''سراج الہدایہ'' منسوب ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں فاضل مقدمہ نگار صاحب نے یہ لکھا ہے:

''سراج الہدایہ بخلاف آں می رود۔''

سراج الہدایہ اس رائے کے بالکل خلاف ہے کیوں کہ اس میں کثرت کے ساتھ ایسی احادیث درج ہیں جنھیں محدثین نے متفقہ طور پر موضوع قرار دیا ہے۔

مقدمہ نگار نے اس کتاب کی مخدوم صاحبؒ کی طرف نسبت کو چھ وجوہ سے غلط قرار دیا ہے جس میں سے ایک وجہ یہ ہے۔ (صفحہ ۱۳)

ان موضوع روایات میں مختلف پھلوں کے خواص اور ان کی تاثیرات بیان کی ہیں اور ان پھلوں میں اکثر ایسے پھل ہیں جو عرب میں پیدا ہی نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ فقہی مسائل بھی غلط منقول ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کتاب مخدوم صاحبؒ کی شخصیت کو بے اثر کرنے کی غرض سے شایع کی گئی اور پھر انڈین کونسل دلّی نے ایک فاضل عالم کے مقدمہ اور حواشی کے ہم راہ بڑے اچھے معیار کتابت وطباعت کے ساتھ اسے شایع کیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر جانتے بوجھتے اتنی لاگت لگا کر ایسی غیر مستند کتاب کو (جو فارسی میں ہے) شایع کر کے تصوف یا شریعت یا مخدوم صاحبؒ کی کونسی خدمت کی گئی؟

اسی قسم کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں سے صوفیائے ربانی احادیثِ نبوی کے معاملے میں بدنام ہوئے ہیں۔

شیخ اکبر علیہ الرحمہ کی کتابوں سے پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے والے

علامہ عبدالوہاب شعرانیؒ کے ساتھ جو مفسدانہ حرکت ہوئی اس کا شکوی کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

''فرقہ باطلہ، ملاحدہ اور زنادقہ نے سب سے پہلے امام احمد ابن حنبلؒ پھر امام غزالیؒ کی تصانیف میں اپنی طرف سے تحریف کی۔ نیز اس فرقہ باطلہ نے ایک کتاب جس میں عقاید کی تبلیغ کی تھی، میری زندگی میں میری طرف منسوب کردی اور میری انتہائی کوشش کے باوجود یہ کتاب تین سال تک پھیلی رہی۔'' (الیواقیت، صفحہ ۷)

شیخ برہان الدین بلخیؒ اور شیخ محمد ماریکلیؒ:

شیخ علیہ الرحمہ کو سند حدیث ان کے استاد شیخ محمد ابن احمد ابن محمد الماریکلیؒ (ملقب کمال زاہد) نے عطا کی، جو شاگرد ہیں شیخ برہان الدین بلخیؒ کے۔

شیخ بلخیؒ ان علما میں سے ہیں جو اپنے عہد میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ آپ کی وفات ۶۸۷ھ (۱۲۸۸ء) میں ہوئی۔ شیخ برہان الدینؒ نے مشارق الانوار کی سماعت اس کے مصنف رضی الدین حسن ابن صنعانی (۱) (وفات ۹ رشعبان ۶۵۰ھ مطابق ۱۵/اکتوبر ۱۲۵۲ء) سے کی۔ اور پھر ہندوستان میں اس کتاب کے درس کا سلسلہ شروع کیا۔

صحیحین بخاری اور مسلم کی تعلیم وتدریس کا سلسلہ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (وفات ۷۸۲ھ) نے اپنی خانقاہ میں شروع کیا۔ یعنی تقریباً ایک صدی کے بعد صحیحین کی تعلیم کا دور شروع ہوا۔

مشارق الانوار صحیحین کا انتخاب ہے اور اس میں بخاری شریف کی ۷۴۷۵ روایات اور صحیح مسلم کی دو ہزار روایات جمع کی گئی ہیں۔ احادیث کی ترتیب موضوع کے اعتبار سے نہیں ہیں بلکہ ابجد کے حساب سے ہے۔

مشارق الانوار کا اردو ترجمہ تحفۃ الاخبار کے نام سے مولانا خرم علی بلہوریؒ نے کیا جسے مطبع نول کشور کان پور نے ۱۲۹۱ھ (دسمبر ۱۸۷۴ء) میں شایع کیا۔

اس کتاب کی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ محمد تغلق کے عہد تک ہندوستان میں حدیث کی صرف یہی کتاب زیر تعلیم رہی، تغلق اپنے عہدیداروں سے ایک ہاتھ میں قرآن اور ایک ہاتھ میں مشارق الانوار رکھوا کر حلف وفاداری لیا کرتا تھا۔

اگرچہ مشکوٰۃ المصابیح اور ابوداؤد شریف کے ہندوستان میں پہنچ جانے کی شہادت ملتی ہے مگر ان کی تعلیم کا رواج عام نہیں تھا۔

شیخ علیہ الرحمہ کے استاد شیخ ماریکلیؒ علم وفضل کے ساتھ تقویٰ اور تصوف میں بھی ممتاز درجے پر فائز تھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن (۶۶۴ھ، ۱۲۶۵ء) نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ وہ شاہی امام کا منصب قبول کرلیں تاکہ ان کی برکت سے سلطان کی نمازیں بھی بارگاہ الٰہی میں قبول ہو جائیں۔ شیخ کمال زاہدؒ (ماریکلی) نے فرمایا: ہمارے پاس اعمال صالحہ میں لے دے کر ایک نماز رہ گئی ہے، سلطان اسے بھی ہم سے چھین لینا چاہتا ہے؟

اپنی وفات سے پانچ سال پہلے انھوں نے شیخ علیہ الرحمہ کو حدیث کی سند عطاء کی جو سیر الاولیا میں نقل کی گئی ہے۔ سند جاری ہونے کی تاریخ ۲۲/ربیع الاول ۶۷۹ھ (۲۲/جولائی ۱۲۸۰ء) ہے۔

......☆......☆......☆......

حاشیہ:

(۱) ہندوستان پانچویں صدی ہجری میں سلطان محمود غزنوی کی فوج میں ایک بڑے محدث شیخ محمد اسماعیل بخاری آئے جو حدیث اور تفسیر کے جامع البحرین تھے۔ ان کا وصال ۴۴۸ھ میں ہوا۔ ان کے بعد (۱۵۰) برس تک برعظیم میں ایک قسم کا گھپ اندھیرا رہا۔ ساتویں صدی ہجری کے شروع میں مشارق الانوار کے مصنف امام حسن ابن محمد صنعانی (وفات ۶۵۰ھ) نے علم حدیث کی روشنی پھیلائی۔ ان کا سن پیدائش ۵۷۰ھ ہے ابتدائی تعلیم انھوں نے لاہور میں اپنے والد سے حاصل کی، پھر یمن، حجاز اور عراق جا کر علم کی تکمیل کی اور لغت وحدیث کے امام قرار پائے۔ ۶۱ھ میں عباسی خلیفہ نے معتصم باللہ کی طرف سے بہ طور سفیر ان کا ہندوستان میں تقرر کیا۔ آپ نے مشارق الانوار مرتب کی۔

تفقہ فی الدین میں شیخ المشائخؒ کی مجتہدانہ فکر

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ. (التوبہ:۱۲۲)

حضرت سلطان المشائخ علیہ الرحمہ کو تفسیر وحدیث میں جو رسوخ اور استحکام حاصل تھا وہی ثبات وقرار آپ کو فقہ حنفی میں حاصل رہا۔

ناچیز نے اسے تفقہ فی الدین کی جامع تعبیر کے ذریعے ظاہر کیا ہے، کیوں کہ کتاب اور سنت کے اصولی احکام سے فروعی اور جزوی مسائل کا استنباط واستخراج جس باریک بینی کے ساتھ شریعت حقہ کے حکیمانہ مصالح کو سامنے رکھ کر امام اعظم ابو حنیفہؒ اور ان کے دونوں شاگردوں نے کیا ہے وہ تمام اہل تحقیق کے نزدیک مسلم اور منفرد ہے۔ تو جس عالم کو فقہ حنفی میں تفقہ حاصل ہوگا وہ پورے دین فطرت میں تفقہ کا حامل ہوگا۔

حضرت امام شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

وَكَانَ عَظِيْمُ الشَّانِ فِي التَّخْرِيْجِ عَلٰى مَذْهَبِهٖ دَقِيْقُ النَّظَرِ فِيْ وُجُوْهِ التَّخْرِيْجَاتِ، مُقْبِلًا عَلَى الْفُرُوْعِ اَتَمَّ اِقْبَالٍ. (حجۃ اللہ البالغۃ۔ جلد اول، صفحہ ۱۴۶)

حضرت شاہ صاحبؒ خود اپنی صدی کے عظیم محقق ہیں اور تقلید کے معاملے میں آپ کی وسیع النظری طبقۂ اہل حدیث میں مشہور بھی ہے اور محمود بھی۔

آپ نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کو تخریج مسائل میں صاحب نظر وبصیرت تسلیم کیا ہے۔ حضرت سلطان المشائخؒ نے ایک موقعے پر حضرت امام ابوحنیفہؒ کو علم اور ادب دونوں کا جامع قرار دیا ہے۔

اس ناچیز نے تفسیر کے مبحث میں حضرت شیخ کے متعلق یہ لکھا ہے کہ آپ دل کے صوفی تھے اور دماغ کے فقیہہ تھے۔ اس کا مطلب وہ ہے جو حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اپنے شیخ عبدالوہاب متقیؒ کے حوالے سے مرج البحرین میں تحریر فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:

"فقیہہ صوفی باش نہ صوفی فقیہہ، یعنی اول عمل شریعت وفقاہت رابدست آر، پس ازاں بذورۂ حقیقت برآ۔ (صفحہ ۷۶)

"یعنی فقیہ صوفی بن، صوفی فقیہ نہ بن، مطلب یہ ہے کہ شریعت وفقہ کی پیروی کو مقدم اور اول درجے پر رکھ، پھر اس کے بعد حقیقت وطریقت کا کمال حاصل کر۔"

اسی بحث میں آگے لکھتے ہیں:

"پس تصوف بہ فقہ محتاج است وفقہ از تصوف مستغنی، اگرچہ تصوف اعلیٰ ودارفع است از فقہ درمرتبہ ولیکن فقہ اسلم واعم است درمصلحت۔"

شاہ صاحب نے فقہ وتصوف کے درمیان بڑا نازک فرق بیان کیا ہے۔ یعنی تصوف اپنی حقیقت (اصلاح باطن) کے لحاظ سے فقہ (علم ظاہر) سے مرتبہ میں بلند ہے، لیکن علم فقہ (علم ظاہر کتاب وسنت) انسان کو گم راہی سے محفوظ رکھنے کے لحاظ سے اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے اور مصالح شریعت کی عام رعایت علم فقہ ہی کے اندر ہے۔

اقبال مرحوم کے ایک اشاراتی شعر میں یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

حضرت شیخ علیہ الرحمہ کا شمار انھی صوفیاے کبار میں ہوتا ہے جو فقیہ صوفی تھے۔

دیوبندی مشائخ تصوف میں مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کا مقام عملی طور پر چشتیت کا خاص مظہر تھا۔ آپ نے ایک مکتوب میں فقیہ صوفی اور صوفی فقیہ کے

درمیان فرق واضح کرتے ہوئے تصوف ہی کی ایک تعبیر کے ذریعے تحریر فرمایا:

ہمارے اکابر رحمہ اللہ نے نہایت اعلا اور اشرف طریقہ اختیار فرمایا۔ ان کا ظاہر نقشبندی اور باطن چشتی ہے۔

بلبل نیم کہ نعرہ زنم درد سر دہم
قمری نیم کہ طوق بہ گردن در آورم
پروانہ نیستم کہ بسوزم بگرد شمع
شمعم کہ جاں گدازم ودم بر نیا درم

پھر مولانا مدنیؒ نے اپنے شیخ طریقت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے حوالے سے فرمایا، میں نے حضرت رحمہ اللہ سے سنا ہے:

"وہ فرماتے تھے کہ ہمارے مشائخ چشتیہ کے تین دور تھے۔ پہلے طبقے پر زہد غالب تھا، دوسرے طبقے پر عشق غالب تھا اور تیسرے طبقے پر اتباع سنت غالب ہے۔" (مکتوبات شیخ الاسلام جلد سوم، صفحہ ۶۲)

شیخ مدنیؒ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"واقعہ یہ ہے کہ حضرات چشتیہ کا طریقہ ہی ہمارے حضرات (حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ، حضرت گنگوہیؒ، حضرت نانوتویؒ اور حضرت شیخ الہندؒ) کا اصلی سلوک ہے۔ ان حضرات کی خاص نسبت گریہ وبکا، تڑپ و بے قراری اور عشق وولولہ ہے۔" (ایضاً ۵۸)

مولانا مدنیؒ کی ساری زندگی درس قرآن وحدیث میں گزری، آپ فقیہ صوفی کا صحیح مصداق تھے۔ آپ فرماتے تھے۔

"میں حضرت سلطان الہند خواجہ بزرگ اجمیری علیہ الرحمہ کی زیارت ضمنی طور پر نہیں کرتا بلکہ زیارت کی نیت کر کے حاضر ہوتا ہوں، کیوں کہ ضمنی طور پر حاضر ہونا آپ کے مرتبہ عالیہ کے شایان شان نہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ مولاناؒ کی فقاہت مولاناؒ کے جذبۂ عشق وادب کی راہ میں حائل نہیں ہوئی تھی۔

البتہ حدود شریعت کا احترام ہر قدم پر قایم رہتا تھا۔ حضرت شاہ عبدالحق صاحبؒ فقہ کے جزئیات میں فقہ حنفی کی تقلید کے معاملے میں نہایت مستحکم رائے رکھتے تھے اور آپ کے خیال میں امت جس علمی اور سماجی زوال کے دور سے گزر رہی ہے، اس میں اجتہاد جیسے نازک مسئلے میں بے حد احتیاط کی ضرورت ہے۔

شاہ صاحبؒ کے سامنے عہد اکبری کے گم راہ درباری علما کی وہ نام نہاد اجتہادی گم راہیاں تھیں جن سے پوری شریعت حقہ کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں۔

اس لیے شاہ صاحبؒ کا تقلید شخصی میں سخت رائے رکھنا دین اسلام کے تحفظ کے لیے بے حد اہم تھا، علامہ اقبالؒ نے کہا ہے:

مضمحل گردد چو تقویم حیات — ملت از تقلید مے گیرد ثبات
راہ آبادر کہ ایں جمعیت است — معنی تقلید ضبط ملت است
اجتہاد اندر زمان انحطاط — قوم را بر ہم ہمی پیچد بساط
ز اجتہاد عالمان کم نظر — اقتداء بر رفتگان محفوظ تر

حضرت شاہ صاحبؒ کی اسی صائب رائے کی وجہ سے مشہور اہل حدیث عالم نواب صدیق حسن خان صاحبؒ نے حضرت شیخؒ جیسے عظیم محدث کو — فقیہ حنفی لکھا ہے اور لکھا ہے کہ شاہ صاحبؒ کے محدث ہونے کی شہرت ہے۔ (حیات شیخ۔ صفحہ ۲۹۱)

لیکن اس کا نام تحقیق نہیں بلکہ تعصب ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ بھی تقلید شخصی کے معاملے میں نہایت مستحکم رائے رکھتے تھے، حدیث نبوی پر براہ راست نظر رکھنے کے باوجود آپ نے حنفی فقہ کے دائرہ کی پابند فرمائی۔

فوائد الفواد (۱) کے مقدمے میں تحریر ہے:

"مطالعہ حدیث کا اثر یہ تھا کہ بعض مسائل میں آپ مجتہدانہ روش رکھتے تھے مثلاً حلت سماع، قرأت فاتحہ خلف الامام اور صلوٰۃ جنازہ علی الغائب جیسے مسائل میں آپ حنفی مسلک سے ہٹ کر شافعی مسلک کے پیرو تھے۔"
(صفحہ ۱۴۰)

ان تین مسائل کے متعلق اس ناچیز نے بہت غور کیا مگر اس رائے سے اتفاق کرنا مشکل نظر آیا۔

فاتحہ خلف الامام کے مسئلے میں تو بار بار غور کرنے کے بعد بھی مجھے کسی مجلس میں شیخؒ کا اختلاف نہیں ملا۔

حلت سماع کے بارے میں یہ عرض ہے کہ سماع کا جو مطلب شیخؒ کی مجالس کے ذریعے شیخ رحمہ اللہ کا معمول اور ان کا اپنا تصور ملتا ہے، وہ احناف اور شوافع کے درمیان اختلافی نہیں ہے۔ اس پر اس ناچیز نے سماع کی بحث میں تفصیل سے لکھا ہے۔

البتہ نماز غائبانہ میں شیخؒ کا عمل شوافع کے موافق تھا اور یہ مسئلہ احناف اور شوافع کے درمیان صرف افضل اور غیر افضل کا ہے۔ جائز اور ناجائز کا نہیں ہے اور ایسے اختلافی مسائل میں بڑے بڑے حنفی علما کے ہاں توسع اور تیسیر ملتی ہے (۲)۔

تراویح کی رکعات کے مسئلے میں احناف اور شوافع اور اہل حدیث طبقے کے درمیان بڑا شدید اختلاف ہے۔ حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے اس مسئلے میں پوری قوت سے احناف کے مسلک کی تائید فرمائی۔ فرمایا:

"تراویح سنت است، و جماعت سنت است و یک ختم در تراویح سنت است۔"

"پھر کسی نے سوال کیا کہ تراویح سنت رسول ہے یا سنت صحابہ ہے؟
فرمایا۔ سنت صحابہ ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روایت کے مطابق تین رات اور ایک روایت کے مطابق ایک رات تراویح ادا فرمائی۔

"امامداومت ایں سنت عمر خطاب کرد، رضی اللہ عنہ در عہد خلافت خود۔"

"اس کی مداومت اور پابندی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں فرمائی۔"

پھر کسی نے سوال کیا:

سنت صحابہ اہم سنت گویند؟ فرمود، در مذہب ما گویند، امام درمذہب امام شافعی ہماں سنت است کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم مے کرد۔

کیا صحابۂ کرامؓ کا طریقہ بھی سنت ہے؟ فرمایا ہاں ہمارے مسلک میں اسے بھی سنت کہتے ہیں۔ البتہ امام شافعیؒ کے مسلک میں سنت وہ فعل ہے جسے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔"

(مجلس ۳۳، جلد ۳، صفحہ ۳۷۷)

شیخ علیہ الرحمہ کا اشارہ اس حدیثِ نبوی کی طرف ہے:

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةَ الْخُلَفَآءِ الرَّاشِدِيْنَ.

"تم لوگ میری سنت کو اور میرے ہدایت یافتہ خلفا کی سنت کو لازم پکڑو(۳)۔"

یہ مسلک حنفیہ ہے۔ تعداد رکعات تراویح کی اس گفتگو میں تصریح نہیں کی گئی لیکن ظاہر ہے کہ تراویح سے ۲۰ رکعت ہی مراد ہوگی کیوں کہ حضرت عمر ابن خطابؓ نے اسی تعداد پر حضرت صحابۂ کرامؓ کو جمع کر دیا تھا اور اسی تعداد پر مداومت کی تھی۔

ایک مجلس (نو) جلد نمبر (چار) صفحہ نمبر (نو سو بہتر) میں بسم اللہ کی قرأت (ہر سورت کے شروع میں یا صرف ایک بار تلاوت کے وقت) کے بارے میں احناف اور شوافع کے اختلاف پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے متعلق فرمایا جب آپ سے بسم اللہ پڑھنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔

"از کمال علمی کہ در امام اعظمؒ بود و نگاہ داشت ادب، گفت یک بار۔"

"یعنی حضرت امامؒ نے مسائل کا جواب بڑے علمی کمال اور اخلاقی ادب کا لحاظ رکھ کر یہ دیا کہ بسم اللہ یک بار۔ بسم اللہ ایک بار پڑھی جائے۔"

"مقصود او ہماں حکم او بود، ایشاں ہر گونہ کہ خواہند تصور کنند خواہ

برسر ہر رکعت خواہ برسر ہر سورۃ۔"

"یعنی حضرت امامؒ کی مراد اپنی اسی رائے سے تھی مگر جواب میں ادب کا لحاظ رکھا اور اختصار کے ساتھ فرمایا، ایک دفعہ۔"

اب اس کا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ تلاوت کے وقت ہر رکعت میں ایک مرتبہ بسم اللہ پڑھنا کافی ہے جیسا کہ امام صاحبؒ کی تحقیق ہے اور اس کا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ ہر سورۃ کے شروع میں ایک بار پڑھنا چاہیے۔ جیسا کہ امام شافعیؒ کا مسلک ہے۔ ادب سے شیخ علیہ الرحمہ کا اشارہ اس طرف ہے کہ امام اعظمؒ نے ان فقہا کی تحقیق کا احترام ملحوظ رکھا اور مختصر جواب میں ان کی رائے کی گنجائش کا اظہار فرمایا۔

شیخ علیہ الرحمہ کے تذکرہ نگاروں نے آپ کی تعلیم کے سلسلے میں فقہ کی مشہور ابتدائی کتاب قدوری کا تذکرہ کیا ہے جو آپ نے بدایوں کے مشہور عالم مولانا علاء الدین اصولیؒ سے پڑھی اور جب قدوری کی تعلیم ختم ہوگئی تو مولانا اصولیؒ نے آپ کے دستار فضیلت باندھی۔ (مقدمہ فوائد ۷۹)

امیر خورد نے حضرت مخدوم نصیر الدین رحمہ اللہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک مجلس میں شیخؒ نے مولانا فخر الدین زرّادیؒ اور ان کے ایک ساتھی سے پوچھا تم لوگ کس سے پڑھتے ہو، یہ بولے مولانا فخر الدین ہانسویؒ سے پڑھتے ہیں۔ پھر پوچھا کیا پڑھتے ہو یہ بولے ہدایہ پڑھتے ہیں۔

مخدوم صاحبؒ فرماتے تھے کہ جب میں مولانا ہانسویؒ کی مجلس درس میں شریک ہوتا تھا تو مولانا فخر الدین زرّادیؒ حضرت شیخ المشائخؒ کے بارے میں نہایت تعصب کے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔ میں ان کے اس تعصب کو دور کرنے کے لیے انھیں شیخ علیہ الرحمہ سے ملاقات کرانے آپ کی خدمت میں لایا تھا۔ شیخؒ نے اس ملاقات میں ان سے ان کی تعلیم کے بارے میں سوالات کیے تھے۔ مولانا زرّادیؒ نے ہدایہ کی تعلیم کا ذکر شیخؒ کے سامنے پیش کر کے اس کی وضاحت چاہی۔

شیخ علیہ الرحمہ نے ہدایہ کے اس مسئلے پر وارد ہونے والے شبہات کو دور کرتے ہوئے نہایت عالمانہ تقریر فرمائی، مولانا زرّادیؒ شیخؒ کی تقریر سے حیرت زدہ تھے اور

آپ کے رعب کی وجہ سے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ جب میرے قریب آ گئے تو میرے کان میں چپکے سے کہا۔ میں شیخؒ کا مرید ہونا چاہتا ہوں، شیخؒ نے انکار کیا مگر مولانا کے اصرار پر آپ نے بیعت کر لیا۔ (سیر الاولیاء، صفحہ ۴۱۷)

یہی وہ مولانا زرّادیؒ ہیں جو حدیث و فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کے دور میں ایک صوفی ہونے کی حیثیت سے شیخ علیہ الرحمہ کا تعصب کے ساتھ تذکرہ کرتے تھے اور پھر یہی مولانا زرّادیؒ تھے، جنھوں نے سماع کے جواز پر صوفیا کے مسلک کی تائید میں کتاب لکھی اور سلطان جیؒ کی عقیدت و محبت میں ساری زندگی گزار دی۔

حضرت مخدوم صاحبؒ کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علیہ الرحمہ کو فقہ حنفی کی اس مشہور اور جامع ترین کتاب ہدایہ پر پورا عبور حاصل تھا۔

شیخؒ کے استاد فقہ اصولی کے لقب سے مشہور تھے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مولانا کو اصول فقہ سے خاص مناسبت تھی، چناں چہ شیخؒ نے سماع کے مسئلے میں ایک فقہی اصول سے کام لیا۔ وہ یہ کہ جب کسی مسئلے میں اجتہادی اختلاف واقع ہو جائے تو وہ حرمت کے دائرہ سے نکل جاتا ہے، سماع میں امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کی اجتہادی آراء مختلف ہیں، اس لیے مسلک احناف سے تعلق رکھنے والے علما بھی سماع کے لیے حرام کا فتویٰ نہیں لگا سکتے۔ بہت سے بہت مکروہ کہہ سکتے ہیں۔ دوسرا اصول فقہی یہ ہے کہ حاکم اسلام کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی مملکت میں کسی ایک فقہ کے مسائل کو ترجیح دے کر نافذ کر دے تاکہ سلطنت میں نظم قایم رہے۔

علما نے فیروز شاہ تغلق کو یہی مشورہ دیا مگر شیخؒ کے مشورے پر اس نے اپنا فیصلہ دینے سے گریز کیا۔ کیوں کہ اگر سلطان سماع کے خلاف فیصلہ دے دیتا تو اس کی تعمیل تمام مسلمانوں پر ضروری ہو جاتی۔

حنفی مسلک اور حضرت بابا فرید علیہ الرحمہ:

حضرت سلطان المشائخ علیہ الرحمہ نے اپنے شیخ محترم حضرت بابا فرید علیہ الرحمہ کے فقہی مسلک کے بارے میں فرمایا کہ فقہ حنفی کے متعلق یہ یقین کیا جائے کہ امام اعظم

ابو حنیفہؒ کا مسلک باقی تین مسلکوں سے افضل ہے کیوں کہ یہ مسلک تینوں مسلکوں سے متقدم بھی ہے۔ **اَلْفَضْلُ لِلْمُتَقَدِّم** (راحت القلوم ترجمہ اردو۔ صفحہ ٦٤)

شیخؒ نے تعلیم کی لائن کیوں چھوڑی؟:

شیخ علیہ الرحمہ نے تعلیم و تدریس کی لائن کیوں چھوڑی؟ ایک مجلس میں شیخؒ نے اپنے مرید خاص (جو بعد میں شیخؒ کے مخصوص جانشین ہوئے) حضرت مخدوم نصیر الدین اودھیؒ کو اپنی داستان سناتے ہوئے فرمایا:

میں شیخ الاسلام بابا فرید علیہ الرحمہ کی خدمت میں تھا کہ میرے ایک درس کے ساتھی عالم اجودھن میں مجھ سے ملے اور مجھے پھٹے پرانے کپڑوں میں دیکھ کر بولے:

"مولانا نظام الدین! تم پر کیا مصیبت پڑی کہ تم نے اپنا یہ حال بنا لیا، اب تک تم شہر (غیاث پور) میں تعلیم کے کام میں لگے ہوئے ہوتے تو اپنے وقت کے مجتہد ہوتے اور خوش حال زندگی کے مالک بن جاتے۔" میں نے انھیں کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد جب میں شیخ الاسلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو شیخ الاسلام نے فرمایا۔ "نظام! اگر تمہارا کوئی دوست تم سے یہ کہے کہ تم پر کون سی مصیبت پڑی تھی کہ تم نے اپنا یہ حال بنا لیا (شیخؒ پر وہ ساری گفتگو منکشف ہو گئی تھی) تو تم اس کو کیا جواب دو گے؟" سلطان جیؒ نے کہا آپ جو فرمائیں گے میں وہی جواب دے دوں گا۔ فرمایا، تو ان سے یہ کہو۔

نہ ہمرہی تو مرا راہ خویش گیر برو
ترا سعادت باد امر انگو نساری

"اے دوست! اگر تو میرے ساتھ نہیں چل سکتا تو اپنا راستہ لے، تجھ کو یہ شان و شوکت مبارک ہو اور مجھے یہ عاجزی اور خاک ساری۔"

پھر شیخ الاسلام نے مجھے حکم دیا کہ عمدہ کھانوں کا ایک خوان تم اپنے سر پر رکھ کر اپنے دوست عالم کے پاس لے جاؤ، میں لے کر گیا تو اس نے میری یہ عاجزانہ حرکت دیکھی اور بولا، خدا کا شکر ہے اس نے تمھیں ایسا باکمال شیخ عطا کیا جس نے عبادت

کے ذریعے تمہارے نفس کو اس قدر پاک کر دیا۔ تم مجھے بھی ان کی خدمت میں لے چلو، میرے دوست نے کھانا کھایا اور اپنے خادم کو حکم دیا کہ وہ کھانے کا خالی خوان اپنے سر پر رکھ کر ہمارے ساتھ چلے، مگر میں نے کہا، یہ خوان میں اپنے سر پر اسی طرح اٹھا کر لے چلوں گا جس طرح اسے لایا تھا۔

پھر ہم بابا صاحبؒ کی خدمت میں آئے اور میرے دوست عالم نے بابا صاحبؒ کے سامنے سر نیاز جھکا دیا اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

اس جگہ مرتب نے یہ شعر تحریر کیا ہے۔

از دیدۂ و دل بندۂ شکل تو شدم
یارب! چہ خوش است ایں طریق خوش تو (سیر الاولیا، ص ۳۵۸)

حافظ شیرازیؒ نے بتایا ہے کہ مدرسے سے خانقاہ کا رخ کیوں کیا؟

علم و فضل کہ بچہل سال دلم جمع آورد
ترسم آں نرگس مستانہ بہ یغما ببرد

اقبال کہتا ہے۔

علم میں بھی سرور ہے لیکن — یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں
دل بینا بھی کر خدا سے طلب — آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

حضرت مخدوم چراغ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ شیخ محبوب الٰہیؒ ان افادات سے مشرف فرماتے ہوئے مجھے عبادت و ریاضت کی تلقین فرما رہے تھے اور نہایت محبت انگیز اشعار پڑھ رہے تھے اور زار و قطار روتے جاتے تھے۔

تقلید شخصی کا مطلب:

شیخ علیہ الرحمہ نے حنفی مسلک اور اس کے امام حضرت امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں جو تاثرات بیان فرمائے ان سے آپ کا حنفی ہونا ثابت ہوتا ہے لیکن بعض مسائل میں دوسرے امام اور مجتہد کے اجتہادی اقوال کی ترجیح سے شیخ نے دراصل تقلید شخصی کا مفہوم واضح کیا ہے۔

قریب کے مشائخ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ عبدالرحیم محدث دہلویؒ کے ہاں بھی یہ توسع پایا جاتا ہے اور حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے تو اصولی بحث کر کے اس مسئلے کو واضح کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ایک محقق عالم اگر کچھ مسائل میں اپنے مسلک کے خلاف دوسرے مسلک کو ترجیح دیتا ہے تو اس کا یہ طرز عمل تقلید شخصی کے خلاف نہیں ہے۔

تقلید شخصی کا جو مفہوم آج کل مشہور ہے کہ کسی ایک فقہی مسلک پر مکمل انحصار اور جمود اسے شاہ ولی اللہؒ تسلیم نہیں کرتے۔

شاہ صاحبؒ نے ائمۂ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی معین تقلید پر امت محمدیہ کے اہل اعتبار طبقے کا اتفاق نقل کیا ہے کیوں کہ بڑے مکتب فکر جو کتابوں میں مرتب ہیں چار ہی ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ چار سو سال تک ہر علاقے کے لوگ اپنے اپنے علاقے کے فقیہ اور مفتی کے قول پر عمل کرتے تھے۔ چار سو سال کے بعد امام غزالیؒ کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ نا اہل لوگوں کے ہاتھ میں حکومت آ گئی اور پہلے یہ تھا کہ فقہا مطلوب اور مرجع تھے اب وہ حکمرانوں کے طالب بن گئے اور حکمراں انھیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگے۔ اس سے شریعت کے نظام میں خلل پڑنے کا اندیشہ سامنے آیا اور ضرورت پیش آئی کہ چاروں بڑے فقہا کے اجتہادات پر امت کو جمع کر دیا جائے۔ چناں چہ ایسا ہی کیا گیا۔

شاہ صاحبؒ کے نزدیک فقہائے اربعہ کی تقلید پر انحصار ایک انتظامی مصلحت ہے۔ بعض علما اسے واجب کہتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ کو اس سے اتفاق نہیں معلوم ہوتا۔

شاہ صاحبؒ کے نزدیک اپنے فقہی مسلک سے باہر نہ نکلنا چاہیے، اور یہ ایک فطری تقاضا ہے (مذہبی حکم نہیں ہے) ہر شخص اپنے مقتداؤں کی پسندیدہ باتوں یہاں تک کہ ان کے لباس اور ان کی چال ڈھال کو بھی پسند کرتا ہے۔ اس لیے اس جذبے کو تعصب کہنا (جیسا کہ سلفی طبقہ کہتا ہے) غلط ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کے تجدیدی کارناموں میں سے یہ بڑا کارنامہ ہے کہ آپ نے فقہ حنفی کو قرب الی الصواب قرار دینے کے باوجود اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اہل علم

ضرورت کے وقت دوسرے اجتہادی فیصلے پر چل سکتے ہیں۔اور یہ بات تقلید شخصی کے خلاف نہیں ہے۔(حجۃ اللہ البالغۃ۔جلد ا،صفحہ ۱۴۰)

شاہ صاحبؒ نے جس ضرورت کے تحت دوسرے ائمہ کے اجتہادات سے فایدہ اٹھانے کی اجازت تسلیم کی ہے، اسی کے مطابق عصر حاضر کے علمانے مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کی سرپرستی میں لاپتہ شوہر وغیرہ مسائل میں فقہ حنفی کو چھوڑ کر امام مالکؒ کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔اس سلسلے کی الحیلۃ الناجزہ مشہور کتاب ہے۔

اور تین طلاق، تین یا ایک کے اختلافی مسئلے میں اس جماعتِ علماء کے مشہور مفتی مولانا محمد کفایت اللہؒ نے یہ اجتہادی فتویٰ دیا کہ اگر فریقین مشکلات میں پڑ جائیں اور اہلِ حدیث مفتی سے رجوع کا فتویٰ حاصل کر کے اس پر چلیں تو اس سے درگذر کرنا چاہیے۔یعنی اس کی مخالفت کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔

(کفایت المفتی۔جلد ۶،صفحہ ۳۶۱)

......☆......☆......☆......

حواشی:

(۱) فوائد الفواد، اردو ترجمہ خواجہ حسن ثانی صاحب۔

(۲) ہبہ کے مسئلے میں بھی شیخؒ نے امام شافعیؒ کے مسلک کو ترجیح دی ہے۔(جلد ا، مجلس ۳۳)

(۳) حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کے ایک واقعے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کے فعل پر سنت کے لفظ کا اطلاق فرمایا۔واقعہ یہ ہے کہ شروع میں طریقہ یہ تھا کہ جو مسلمان جماعت شروع ہونے کے بعد جماعت میں شریک ہونے کے لیے آتے اور نماز کی کچھ رکعتیں ہو چکی ہوتیں تو وہ نمازیوں سے اشارے کے ذریعے پوچھتے کہ کتنی رکعتیں ہو چکی ہیں۔نمازی انگلیوں کے اشارے سے بتادیتے۔یہ حضرات پہلے وہ رکعتیں ادا کرتے اور اس کے بعد جماعت میں شریک ہو جاتے۔

ایک روز حضرت معاذؓ مسجد نبوی میں آئے تو دیکھا کہ حضور علیہ السلام قعدۂ آخرہ میں بیٹھے ہیں۔حضرت معاذؓ نے اپنے اجتہاد سے کام لیا اور قعدہ میں شریک ہو گئے اور بعد میں فوت شدہ

رکعتیں پوری کیں۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم حضرت معاذؓ کے اس عمل کو دیکھ رہے تھے، آپ نے صحابۂ کرامؓ رضی اللہ عنہم اجمعین سے فرمایا:

قَالَ سَنَّ لَكُمْ مَعَاذٌ فَهٰكَذَا فَاصْنَعُوْا.

"معاذ نے تمہارے لیے ایک طریقہ نکالا ہے، اب تم اسی طرح عمل کیا کرو۔" (مسند امام احمد۔صفحہ ۲۳۳و۲۴۶)

حضرت معاذؓ خلفائے راشدین میں سے نہیں تھے مگر اپنے علم وعمل میں وہ مقام رکھتے تھے کہ خلفائے راشدینؓ ان کی عظمت کو تسلیم کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے وفات کے وقت فرمایا تھا کہ اگر معاذ ابن جبلؓ زندہ ہوتے تو میں اپنے بعد انھیں اپنی جانشینی کے لیے نامزد کرتا۔

تصوف اور اس کی مختلف تعبیرات

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ کَانُوْا یَتَّقُوْنَ ○ لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ○
(یونس:۱۰)

''خبر دار! بلاشبہ اولیاء اللہ پر نہ خوف طاری ہونے کا کوئی موقع ہے اور نہ رنج وغم طاری ہونے کا یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان والے ہیں اور تقویٰ سے آراستہ ہیں۔ان کے لیے دنیا اور آخرت کی دونوں زندگیوں میں بشارت ہی بشارت ہے۔''

تصوف کی حقیقت کو سمجھانے کے لیے مختلف تعبیریں اختیار کی جاتی ہیں۔تصوف کے لیے عام طور پر علمائے شریعت حدیث جبرئیل کے ''احسان'' کی تعبیر اختیار کرتے ہیں۔جبرئیل امین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر دور حیات میں ایک سائل کی شکل میں آئے اور آپ سے ایمان و اسلام کے عقاید اور عبادات کے بارے میں سوالات کیے۔آپ نے ان کے جوابات دیے۔اور اس طرح صحابہ کرامؓ کے سامنے ایمان واسلام کا پورا نظام واضح ہو گیا۔

اس موقع پر جبرئیل نے آخری سوال یہ کیا:

مَا الْاِحْسَانَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟ قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ.

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم! احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ اے سائل! تو خدا کی عبادت اس تصور کے ساتھ کر کہ گویا تو خدا کو دیکھ

رہا ہے، پھر اگر یہ نہ ہو تو یہ تصور رہے کہ خدا تجھے دیکھ رہا ہے۔"

(مشکوٰۃ:۱۳)

لغت عربی میں احسان کے معنی کسی کام کو حسن وخوبی کے ساتھ کرنا — تو جبرئیل علیہ السلام کا مطلب یہ تھا کہ خدا تعالیٰ کی عبادت نہایت اچھے اور کمال حسن کے ساتھ کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب عطا فرمایا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے حضور علیہ السلام کے جواب کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

حدیث میں رویت (دیکھنے) سے جسمانی آنکھوں سے دیکھنا مراد نہیں ہے یہ دنیا میں ممکن نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان میں ذات حق کے مشاہدے کا یقین اس طرح غالب آجائے کہ وہ ساری کائنات سے غافل ہو جائے اور دنیا کا کوئی خیال اس کے دل میں باقی نہ رہے۔ سوائے تصور حق کے۔

اسے صوفیا تجلیٔ ذات کہتے ہیں اور اسے مکاشفہ بھی کہا جاتا ہے۔

حضور علیہ السلام کی زندگی میں اس کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ کو صلوۃ کسوف میں قبلے کی طرف جنت اور اس کی نعمتوں کا مشاہدہ ہوا اور پھر دوزخ اور اس کے عذاب کا مشاہدہ ہوا۔

صحابۂ کرامؓ میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ طواف کر رہے تھے کہ کسی نے آپ کو سلام کیا اور آپ اس کا جواب دینے سے غافل رہے۔ پھر بعد میں فرمایا۔

ہم اس وقت ذات حق کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

کنانتد یالله فی ذالک المکان.

حضرت معاذ ابن جبلؓ کو تلاوت قرآن کے وقت آسمان پر ایک سائبان کی صورت میں سایہ نظر آیا، جس میں چراغ جل رہے تھے۔ ایک مرتبہ دو صحابی اندھیری رات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے اپنے گھر کے لیے نکلے اور ان کے سامنے دو شمعیں روشن تھیں، پھر جب وہ اپنے اپنے گھروں کی طرف مڑے تو ہر ایک کے ساتھ ایک ایک شمع ہو گئی۔

حدیث میں آتا ہے کہ حبش کے حکمران نجاشیؓ کے مزار پر روشنی نظر آتی ہے۔

(حجۃ اللہ۔ جلد۲، صفحہ۹۳)

شاہ صاحبؒ کا مطلب ان مثالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری شکلیں غلبۂ یقین کی تھیں۔ صحابۂ کرامؓ کے یقین کا غلبہ تھا جو انھیں روشنی کی صورت میں نظر آیا۔ اور دوسرے بھی اسے دیکھتے تھے۔

اسلام میں عبادت صرف ارکان خمسہ (نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج) میں محدود نہیں، بلکہ زندگی کا ہر وہ کام جو اسلامی شریعت کے مطابق ہو، عبادت ہے۔ اب حدیث پاک کا مطلب یہ ہوا کہ مومن کو ہر نیک اور اچھا کام اس تصور وتوجہ سے کرنا چاہیے کہ جس کے حکم کی تعمیل کر رہا ہے اس کی ذات اس کے سامنے موجود ہے۔ حاکم سامنے موجود ہے جو حکم دے رہا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وادی سینا میں جو خطاب الٰہی کیا گیا۔ اس کا اسلوب دیکھیے۔

إِنَّنِيٓ أَنَا اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيٓ ۝ إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ. (طٰہٰ:۲۰)

"میں ہوں، ہاں میں اللہ، میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کر اور نماز قائم کر میری یاد قایم رکھنے کے لیے، بے شک قیامت آنے والی ہے۔"

شاہ صاحبؒ کی اس تشریح کے مطابق تصوف انسان کی باطنی اور روحانی قوت کو باطنی اور روحانی اعمال واخلاق کے ذریعے درجہ کمال تک پہنچانے کا نام ہے۔ اسی روحانیت کاملہ سے یقین کامل پیدا ہوتا ہے۔

قرآنی تعبیر، اخلاص:

تصوف کی قرآنی تعبیر اخلاص ہے۔ یعنی خالص خدا کے لیے عبادت کرنا۔

خدا نے فرمایا:

قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِیْنِیْ O (الزمر:۳۹)

"آپ فرمادیں کے مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں، اس حال میں کہ میں تابع داری کو اسی کے لیے خالص کرنے والا ہوں۔"

قرآن کریم نے اخلاص کے دو درجے متعین کیے ہیں۔

۱۔ اعلا درجہ اخلاص کا یہ ہے کہ ذات حق مطلوب عبادت ہو۔ قرآن نے اس کے لیے وجہ اللہ کی تعبیر اختیار کی ہے۔

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ (دہر:۹) خدا کے خاص بندے یہ کہتے ہیں کہ ہم تمھیں صرف خدا کے لیے کھانا کھلاتے ہیں۔ یعنی جزاء وسزاء سے قطع نظر اپنے مالک کی رضا ہمارا مقصود ہے۔

۲۔ اخلاص کا دوسرا درجہ یہ ہے صرف آخرت کی جزا حاصل کرنے اور آخرت کی سزا سے بچنے کے لیے عبادت کی جائے۔ دنیا والوں سے نہ طمع ہو، نہ خوف ہو۔ نیک لوگوں کے متعلق فرمایا۔

یَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ. (۱۴۱:۵۷)

"یہ لوگ خدا کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔"

اقبالؒ نے اس کی اس طرح ترجمانی کی ہے:

سوداگری نہیں، یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اخلاص کے لیے عاجزی:

اخلاص کے لیے قرآن کریم نے عاجزی، خشوع وخضوع اور اخبات (جھکاؤ) کی صفت کو محرک اور ماخذ ومنبع کے طور پر پیش کیا ہے۔

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ O (بقرہ:۴۵)

"نماز لوگوں پر بھاری ہے مگر ان کے لیے بھاری نہیں جو عاجزی اختیار

کرتے ہیں۔"

وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ O الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ. (الحج:۲۲)

"اور جھکنے والوں کو خوش خبری سنا دیں یہ وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔"

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ خشوع وخضوع کی کیفیت تجلیٔ صفات الٰہی کا مقام ہے۔ انسان جب اس کارخانۂ قدرت پر غور وفکر کرتا ہے اور اس کارخانۂ قدرت میں اس کے مالک وخالق کی صفات اور اس کے عمل وفعل کی جلوہ گری اس کے دل و دماغ میں بیٹھتی ہے تو

فَيَغْلِبُ يَقِيْنُ قُدْرَةِ اللّٰهِ عَلَيْهِ فَيَغِيْبُ عَنِ الْاَسْبَابِ وَيَسْقُطُ عَنْهُ الْخَوْفُ وَالتسبب فَيَبْقٰى خَاضِعًا مَرْعُوْبًا مَدْهُوْشًا. (جلد دوم، صفحہ ۹۴)

"اس پر قدرت الٰہی کا یقین غالب آجاتا ہے اور اسباب ووسائل اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور ان کا ڈر نکل جاتا ہے اور وہ عاجزی، رعب اور حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ اخلاص اسی حالت کی پیداوار ہے۔"

تصوف کی تیسری تعبیر، تقرب الی اللہ:

تصوف کی ایک تعبیر ہے تقرب الی اللہ۔ جسے صوفیائے کرامؒ راہ محبت کہتے ہیں اور یہ مفہوم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ مشہور حدیث قدسی سے لیا گیا ہے۔ حدیث قدسی یہ ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهِ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَالَ مَنْ عَادٰى لِیْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ اِلٰى عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ وَمَا يَزَالُ

عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حتی اِجْتَبَهُ فَاِذَا اَجْبَتُهٗ فَکُنْتُ سَمْعَهٗ اَلَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرِهِ الَّذِیْ یَبْصُرُ بِهٖ وَیَدَهٗ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلِهِ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِهَا وَاِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّهٗ وَلَئِنْ اِسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّهٗ وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَیْءٍ اَنَا فَاعِلُهٗ تَرَدُّدِیْ عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ یَکْرَهُ الْمَوْتَ وَاَنَا اَکْرِهُ مَسَاءَتَهٗ وَلَا بَدَلَهٗ مِنْهُ. (مشکوٰۃ ۱۹۷ بحوالہ بخاری)

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

جو شخص دشمنی کرتا ہے میرے ولی سے تو میں اسے جنگ کا چیلنج کر دیتا ہوں، میرے بندے نے جن اعمال کے ذریعے تقرب حاصل کیا ان میں سب سے زیادہ میرے نزدیک فرائض کے اعمال ہیں اور میرا بندہ نفلی عبادات کے ذریعے میرا تقرب حاصل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کے ہاتھ اور پیر بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے اور چلتا ہے اور جب وہ مجھ سے سوال کرتا ہے تو میں اسے عطا کرتا ہوں او جب مجھ سے پناہ مانگتا ہے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں اور میں اپنے کسی فعل میں تامل نہیں کرتا جتنا تامل میں اپنے بندۂ مومن کو موت دینے میں کرتا ہوں اور وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اسے تکلیف پہنچانا پسند نہیں کرتا لیکن وہ اس کے لیے ضروری ہوتی ہے۔“

حدیث قدسی:

حدیث قدسی محدثین کی اصطلاح میں وحی خفی ہے۔ یعنی الفاظ رسول صلی اللہ علیہ

وسلم کے ہیں اور اس کا مفہوم خدا کی طرف سے ہے۔

یوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال کی حیثیت وحی خفی کی ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بات کو خاص اہمیت دی اور اسے خدا کی طرف منسوب کر کے بیان فرمایا وہ حدیث قدسی کہلاتی ہے۔

ولی کے ساتھ دشمنی:

خدا کے مقبول بندوں کے ساتھ عداوت رکھنا خدا تعالیٰ کو اتنا ناپسند ہے کہ وہ اس شخص کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیتا ہے۔ خدا کی پناہ۔

اسی درجے کا دوسرا ناپسندیدہ گناہ سود خواری ہے۔ قرآن کریم میں اس پر بھی اعلان جنگ کیا گیا ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ.

(سورۂ بقرہ:۲۷۹)

”پھر اگر لوگ سود کھانے سے باز نہ آئے تو خدا اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔“

فرائض کی ادائیگی، فناء الذات:

اوپر والی حدیث میں تقرب پیدا کرنے والے اعمال میں سب سے زیادہ پسندیدہ اعمال فرائض دین کو قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے سب سے زیادہ پسندیدہ اعمال سے جو تقرب حاصل ہوتا ہے وہ سب سے زیادہ اور سب سے بڑا درجہ رکھتا ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں یہ تقرب فنائے ذات ہے۔

محدثین نے اسی وجہ سے تقرب بالفرائض کو تقربِ کامل کہا ہے اور اس تقرب کو فنائے ذات کا درجہ دیا ہے۔

نوافل کی ادائیگی، فناء الصفات:

نوافل کی ادائیگی کے ذریعے مومن کو جو تقرب حاصل ہوتا ہے وہ فناء الصفات

کے درجے کا ہے جو پہلے مقام سے کم ہے۔

محدثین نے یہ فرق اس اصول کے مطابق کیا ہے کہ فرائض کی تعمیل حکم الٰہی سے ہوتی ہے اور یہ ایک قسم کا جبر ہے اور جبر انسانی طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ اس گرانی اور مشقت کی وجہ سے فرائض کی تعمیل کا درجہ بلند ہے اور نوافل میں اختیار ہے اور اختیار میں مشقت نہیں بلکہ سہولت ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے کتاب الاحسان (تصوف) کے مباحث میں اس حدیث قدسی کے پہلے جز (فرائض) کو کوئی اہمیت نہیں دی اور دوسرے جز (نوافل) پر دی گئی بشارت پر اپنے عارفانہ ذوق سے روشنی ڈالی۔

اس ناچیز کے خیال میں شاہ صاحبؒ جیسے محدث اور عارف باللہ نے نوافل کی فضیلت کے پہلو کو اہمیت دی اور فرائض کی فضیلت کے حصے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

اس کی علمی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ نوافل کی ادائیگی میں گو جبر و مشقت کا پہلو نہیں لیکن اس میں نفلی اور زائد عبادات کے ساتھ شوق و محبت کا جذبہ تو نمایاں ہوتا ہے اور اس کی اپنی جگہ خاص اہمیت ہے اور اسی اہمیت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے نفلی عبادات پر وہ بشارت دی جو اس ذات حق کی اپنے بندے کے ساتھ انتہائی تقرب کو ظاہر کرتی ہے۔

مادی تعبیر کا مطلب:

حدیث قدسی کی بشارت میں خدا تعالیٰ نے نوافل گزار بندے کے ہاتھ پیر اور منہ اور آنکھیں بننے کی مادی تعبیر اختیار کی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اس کی یہ تشریح کی ہے کہ

اقول اذا غشی نور الله نفس هذا العبد من جهة قوته العملية المنبة فی بدنه دخلت شعبة من هذا النور فی جميع قواه فحدثت هنالک برکات لم تکن تعهد فی حجری العادة. (حجۃ اللہ۔ جلد ۲، صفحہ ۹۷)

"نفلی عبادات (نفل نماز، نفلی روزہ خیر خیرات ذکر و تلاوت) کی کثرت سے اس بندے کو اللہ تعالیٰ کا نور ڈھانک لیتا ہے اور اسی نور کا کچھ حصہ اس کے تمام اعضائے جسم میں عبادت کے مطابق پھیل جاتا ہے اور ان اعضا سے خلاف عادت برکات پیدا ہوتی ہیں۔"

اور پھر ان برکتی اعمال (کرامات) کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جیسے اس آیت میں ہے۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ. (سورۃ الانفال: ۸)

"اے مسلمانو! تم نے ان دشمنوں کو قتل نہیں کیا لیکن اللہ نے انھیں قتل کیا ہے اور اے نبی! تم نے ان پر مٹی نہیں پھینکی جب تم نے پھینکی لیکن اللہ نے ان پر مٹی پھینکی۔"

یہ غزوۂ بدر میں ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مٹھی کنکریوں کی قریش کے لشکر کے ایک ایک فرد کی آنکھوں میں گری اور وہ شکست کھا گئے اور صحابہ کے ساتھ ملائکۃ اللہ نے مل کر قریش کے لشکر کو مارا۔

یہ کرامت تھی صحابۂ کرامؓ کی اور معجزہ تھا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا۔

تقرب و محبت کی حقیقت:

حضرت شیخ المشائخؒ نے ایک مجلس میں خداوند قدوس اور بندے کے درمیان تقرب اور محبت کے تعلق کی حقیقت کے بارے میں وضاحت فرمائی۔

آپ سے کسی نے سوال کیا۔

حضرت عزت در غایت عظمت و پاکی و فرزند آدم در مقام ادنیٰ، ایں جا چہ نسبت محبت و قرب باشد؟

خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ ایں بزبان راست نیاید و ایں مسئلہ را بحث نیست۔

"یعنی حضرت عزت (خداوند قدوس) عظمت و پاکی کے درجۂ کمال کا

مالک ہے اور اولاد آدم اس کے مقابلے میں ادنا درجہ رکھتی ہے۔ پھر ان
دونوں میں محبت وقربت کا تعلق کیسے قایم ہوسکتا ہے؟ فرمایا۔ یہ گفتگو زبان
پر لانے کی نہیں ہے اور اس پر بحث نہیں کی جاسکتی۔"

پھر خواجہ حسن علاءؒ نے عرض کیا کہ اس پر مجھے یہ مصرعہ یاد آیا ہے۔

عشق رابو حنیفہ درس نگفت

"امام ابوحنیفہؒ نے عشق کا درس نہیں دیا۔"

شیخ علیہ الرحمہ نے دوسرا مصرعہ پڑھا۔

شافعی رادر روایت نیست

(مجلس ۴۳، جلد ۴، صفحہ ۸۰۹)

"امام شافعیؒ سے بھی عشق کے بارے میں کوئی روایت منقول نہیں ہے۔"

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ عشق ومحبت کا تعلق علمی اور نظری مسائل سے نہیں ہے
جس کی تشریح اہلِ علم سے منقول ہو، یہ تو قلبی اور باطنی کیفیات ہیں۔ اہلِ دل ہی سمجھتے
ہیں کہ عشق ومحبت کیا چیز ہے؟

علم کلام کا یہ مشہور مسئلہ ہے کہ خداوند قدوس کی طرف عارضی کیفیات اور عارضی
احوال کی نسبت درست نہیں ہے، کیوں کہ وہ واجب الوجود الحیُّ القیّوم ہے۔

اس کی ذات اور صفات میں کسی طرح کا تغیر اور تبدل اور اتار چڑھاؤ ناممکن
ہے۔ اس لیے محبت، نفرت، غیض وغضب، قرب ومعیت کی صفات کا خدا تعالیٰ پر
اطلاق ان صفات کے ثمرات وعواقب کے لحاظ سے ہوتا ہے۔

محبت اور تقرب کا ثمرہ مہربانی اور لطف وکرم کرنا ہے۔ غیض وغضب کا ثمرہ سزا
اور تکلیف دینا ہے۔

خدا تعالیٰ اچھے عمل کرنے والوں پر لطف وکرم کرتا ہے، انھیں آرام وراحت
پہنچاتا ہے اور برے عمل کرنے والوں کو سزا دیتا ہے۔

قرآن کریم میں تقریب ومعیت کے الفاظ کا استعمال محبت اور تہدید دونوں
موقعوں پر کیا گیا ہے۔ تہدید اور دھمکی کے موقعے پر کہا گیا قرب کا استعمال۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ
وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ. (سورۂ قٓ:۱۶)

"اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم جانتے ہیں ان وسوسوں کو جو اس
کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور ہم اس کی رگِ جان (شہ رگ) سے بھی زیادہ
قریب ہیں۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دھمکی دی ہے کہ جو گم راہ کن خیالات مرنے کے
بعد دوبارہ زندہ ہونے کے بارے میں ان منکرین آخرت کے اندر پیدا ہوتے ہیں، ہم
ان سے پوری طرح باخبر ہیں اور انھیں اس کی سزا ضرور دی جائے گی۔

محبت اور ترغیب کے موقعے پر فرمایا گیا

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ
الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ
لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ. (سورۂ بقرہ:۱۸۶)

"اور جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں تو تم
انھیں بتاؤ کہ میں ان سے قریب ہوں، قبول کرتا ہوں پکارنے والے کی
پکار کو جب وہ پکارے۔"

معیت دھمکی کے موقعے پر:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ
مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ
اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰی مِنْ ذٰلِکَ وَلَآ اَکْثَرَ اِلَّا
هُوَ مَعَهُمْ اَیْنَ مَا کَانُوْا ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا یَوْمَ
الْقِیٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ. (سورۃ المجادلۃ:۷)

"کیا اے مخاطب! تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے آسمان اور زمین
کی تمام باتوں کو جب تین آدمی آپس میں سرگوشی کرتے ہیں تو چوتھا ان

میں اللہ ہوتا ہے۔ اور جب پانچ آدمی ہوتے ہیں تو چھٹا اللہ ہوتا ہے، پھر وہ قیامت کے دن انھیں ان کے اعمال کی خبر دے گا، بے شک اللہ ہر بات کا جاننے والا ہے۔"

معیت محبت کے موقعے پر:

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو فرعون کے پاس تبلیغ حق کے لیے جانے کا حکم دیا۔ انھوں نے خوف ظاہر کیا۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى O
قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى O

(سورۂ طٰہٰ: ۴۵، ۴۶)

"وہ بولے، اے پروردگار! ہمیں ڈر ہے کہ وہ ہم پر ناراض ہوگا یا جوش میں آجائے گا۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا: میں تمہارے ساتھ ہوں، میں سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔"

اس یقین دہانی کا مقصد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے دل میں خوف دور کرنا تھا اور انھیں تسلی دینی تھی۔

جلد اول:
پہلی مجلس:

توبہ کی فضیلت، اور اس کے بعد ترقی درجات،

نبی کے معصوم ہونے اور ولی کے محفوظ ہونے کا مطلب

تقویٰ کے مختلف درجات پر عارفانہ تبصرہ:

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض رسالت و نبوت کی جو ترتیب قرآن حکیم نے قایم کی، اسی کے مطابق شیخ المشائخ حضرت محبوب الٰہی علیہ الرحمہ نے اپنی نورانی مجالس کا آغاز فرمایا۔ قرآن کریم نے کہا:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ
اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ

(سورۃ البقرۃ: ۱۲۹)

وہ رسول محترم صلی اللہ علیہ وسلم انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان لوگوں کو پاک صاف کرتے ہیں (تزکیہ) اصطلاح صوفیا میں اسے تزکیہ و تحلیہ (پاک کرنا اور پھر سنوارنا و آراستہ کرنا) کہا جاتا ہے۔ توبہ کی تعلیم، تزکیہ کی تعلیم ہے۔ حضرت شیخ علیہ الرحمہ توبہ و تزکیۂ نفس کے درس سے اپنی مجالس خیز کا آغاز فرماتے ہوئے توبہ و انابت کی فضیلت و اہمیت سے اہلِ مجلس کو باخبر کرتے ہیں۔

تائب (توبہ کرنے والا) اور متقی دونوں برابر ہیں۔ کیوں کہ متقی (صاحب تقویٰ) وہ ہے کہ اس نے ساری عمر شراب نہ پی ہو یا اس سے معصیت سرزد نہ ہوئی ہو۔ اور تائب وہ ہے کہ اس نے گناہ کیا ہو اور پھر خدا کی طرف رجوع کرلیا ہو۔ (یعنی توبہ کرلی ہو) اور اس برابری کی دلیل یہ حدیث پاک ہے:

اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ.

(عن ابن مسعود، مشکوٰۃ (۲۰۶) بہ حوالہ ابن ماجہ)

"یعنی گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی مانند ہے، جس سے کوئی گناہ نہ ہوا ہو۔"

محدثین اس حدیث کی تشریح کرتے ہیں۔

مواخذہ نہ ہونے میں تائب اور بے گناہ دونوں برابر ہیں۔ بلکہ آیت الفرقان کے مطابق تائب کا درجہ اس لحاظ سے بڑھ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تائب کے گناہوں کو توبہ صادق کی بدولت نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا○

محدثین کے ہاں یہ بحث ہے کہ تائب گناہ گار افضل ہے یا بے گناہ مومن؟ ایک قول یہ ہے کہ تائب افضل ہے کیوں کہ یہ وہ شخص ہے جس نے گناہوں کی لذت حاصل کی اور پھر اس سے لوٹ آیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ بے گناہ رہنے والا افضل ہے۔

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے پہلے قول کو ترجیح دی اور اس کی دلیل یہ بیان فرمائی کہ معصیت سے لوٹ کر اطاعت کی طرف آنے والا فطری طور پر خوب ذوق وشوق سے خدا کی عبادت کرتا ہے اور ذوق وشوق کی عبادت میں عبادت کی لذت وراحت کا محسوس کرنا لازمی امر ہے۔

پس ممکن ہے کہ اس طمانیت وراحت کا ایک ذرہ اور ایک لمحہ اس کے گناہوں کے تمام ذخیرے کو جلا ڈالے۔ حدیث پاک میں تائب اور بے گناہ کو برابر قرار دیا گیا ہے۔ اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ بے گناہ تو اصل میں نبی اور رسول ہیں۔ تو کیا تائب نبی اور رسول کے برابر ہو گیا؟

حدیث کے اسلوب میں مبالغہ پیدا ہو گیا ہے، کیوں **لَا ذَنْبَ لَهٗ.** کا فقرہ لائے نفی جنس کی وجہ سے گناہ کی مطلق نفی پر دلالت کر رہا ہے اور یہ شان صرف حضرات انبیائے کرام کی ہے۔ حدیث میں اگر **لَا يُذْنِبُ** (جملہ فعلیہ) یعنی جو گناہ نہیں کرتا

ہے۔ واقع ہوتا تو پھر بھی مفہوم میں ہلکا پن ہوتا، لیکن رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مبالغے کا اسلوب اختیار فرمایا۔

مشکوٰۃ کے شارح علامہ طیبیؒ نے اس اشکال کو اس طرح دور کیا ہے کہ حدیث بالا میں ناقص (تائب) کو کامل (بے گناہ) سے بہ طور مبالغے کے تشبیہ دی ہے۔ کیوں کہ مشرک تائب نبی معصوم کے برابر نہیں ہو سکتا۔

شارح بخاری حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں بے گناہ سے مراد وہ شخص ہے جو گناہ میں پھنس گیا ہو، لیکن اس میں قایم رہنے کے بجائے اس دلدل سے نکل گیا ہو۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ باب الاستغفار)

شیخ علیہ الرحمہ نے اس الجھن کو دور کرتے ہوئے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی توجیہ کو پسند کیا ہے اور بے گناہ (لا ذنب لہٗ) کی تفسیر لفظ متقی سے فرمائی ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے بے گناہ کی جو تشریح کی ہے۔ اس کا مصداق متقی بنتا ہے اور متقی بھی عام متقی جو تقویٰ کے تیسرے درجے پر فائز ہوتا ہے۔ کیوں کہ شیخ علیہ الرحمہ نے متقی کی تعریف میں فرمایا:

"متقی وہ ہے کہ اس نے ساری عمر شراب نہ پی ہو یا اس سے معصیت سرزد نہ ہوئی ہو۔"

یعنی جو کبیرہ گناہوں اور منکرات سے محفوظ رہا ہو۔

محدثین لکھتے ہیں تقویٰ اور ورع کے تین درجے ہیں:

۱۔ واجب وهو الا جتناب عن المحارم و ذالک للناس کافةً.

۲۔ ندب وهو الوقوف عن الشبهات و ذالک الاوساط.

۳۔ فضيلة وهو الكف عن كثير من المباحات والا قتصار على رقل الضروريات و ذالک لنبيّن والصدقين و الشهداء والصالحين. (مرقاۃ ملا علی قاریؒ)

یہ ترتیب حکم کے لحاظ سے کی گئی ہے، مرتبے کے لحاظ سے ترتیب معکوس ہے۔

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے واجب درجے کے تقویٰ کو اختیار کیا ہے جو تقویٰ عوام

کا ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ ولی کامل تھے۔ آپ متقی کی جگہ (بے گناہ کی تشریح میں) ولی کا لفظ بھی رکھ سکتے تھے۔ لیکن ولی تقویٰ کے اعلا درجے پر فائز ہوتا ہے۔ اگر چہ نبی و رسول کے مقابلے میں اس کا درجہ کم ہوتا ہے۔ اس لیے تائب کو اتنا بڑا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ نبی و ولی کے برابر ہو جائے۔

نبی اور ولی کے تقویٰ کے درمیان کیا فرق ہے؟

اوپر کی تعریف کے لحاظ سے نبی اور صدیق (ولی) ایک ہی زمرے میں آتے ہیں۔ یعنی منکرات اور برائیوں سے بچنے کے علاوہ اکثر مباح چیزوں سے بھی پرہیز کرنا اور طبعی ضرورتوں میں بھی مکمل احتیاط کرنا، تقویٰ کا اعلا مقام ہے۔ نبی و رسول کا برائیوں سے پاک صاف رہنا اصطلاح شریعت میں عصمت کہلاتا ہے اور ولی کا محفوظ رہنا حفاظت کہلاتا ہے۔ چناں چہ نبی کو معصوم اور ولی کو محفوظ کہا جاتا ہے۔ یہ بڑا نازک علمی اور اعتقادی مسئلہ ہے۔ ہمیں اس کی وضاحت کے لیے ایک ایسی شخصیت کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جو علما و صوفیا دونوں طبقوں میں قابل اعتماد مقام کا مالک ہے۔ اور وہ ہیں حضرت شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ۔

شیخ نے اپنی مشہور تصنیف (شریعت اور طریقت دونوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے والی) مرج البحرین میں اس مسئلے پر کئی جگہ گفتگو فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو:

"اعتقاد کمال مطلق کہ ہیچ وجہ نقصان را بداں راہ نباشد مستلزم انکار و تنقیص است برانچہ موجب نقصان نیست بر ہیچ کس اعتقاد کمال مطلق نباید کرد، چہ آدمی خالی از نقص بشریت نبود۔"

"یعنی کمال مطلق کا اعتقاد ذات حق جل مجدہٗ کے سوا کسی دوسرے کے ساتھ رکھنا کفر و انکار کے درجے کا گناہ ہے۔ کیوں کہ کوئی انسان بشری کمزوری سے خالی نہیں۔"

"عصمت مخصوص انبیاء ست و شرط ولایت نیست وجود خطاء و

معصیت بے اصرار و انہماک منافی مرتبہ قرب و درجہ ولایت۔"

(مجلس،۲۶)

"معصوم ہونا حضرات انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے اور ولایت کے لیے خطا اور معصیت کا نہ ہونا شرط نہیں ہے۔ البتہ خطا پر اصرار نہ ہو اور ان باتوں میں انہماک نہ ہو جو قرب الٰہی کے خلاف ہیں۔"

مسئلہ ابھی صاف نہیں ہوا۔ معصوم اور محفوظ کے درمیان واضح فرق سامنے نہیں آیا۔ چناں چہ ایک دوسرے مقام پر حضرت شیخؒ نے شیخ المشائخ حضرت شیخ جیلانیؒ کے حوالے سے اس فرق کو واضح کیا:

"حضرت غوث الثقلین فرمودند کہ با اولیائے حدیث بود و با انبیاء کلام، و انبیاء را وحی است و اولیا را الہام۔

وحی کلام الٰہی است کہ باوے روح دوست کہ روح الامین گویند بمشابہ خاتم کہ بر کتاب کنند و لہٰذا تصدیق وے واجب و رد وے کفر بود و الہام حدیث الٰہی است کہ قابل وے نور یقین و سکینہ است کہ در قلب صحیح ولی نہادہ اند پس کلام در ظاہر و باطن است و حدیث در باطن و تکذیب و انکار کلام کفر و موجب خرابی ظاہر و باطن و انکار حدیث سبب خرابی باطن بود۔" (مجلس،۳۸)

حضرت شیخ جیلانیؒ فرماتے ہیں:

"حضرات انبیا کا خدا کے ساتھ تعلق کلام (خطاب یقینی وحی الٰہی) کے واسطے سے قایم ہوتا ہے اور حضرات اولیا کا تعلق ذات حق سے (خطاب ظنی) یعنی الہام کے توسط سے قایم ہوتا ہے۔

وحی الٰہی کلام حق ہے (جو ذات حق کی صفت ہے) اس کے ساتھ اس کی روح یعنی روح الامین بھی نازل ہوتے ہیں جو اس مہر کی مانند ہیں جو مکتوبات کی تصدیق کے طور پر لگائی جاتی ہے، اس وجہ سے اس کلام کی تصدیق واجب ہے اور اس کا انکار کفر ہے۔ اور الہام وہ خدائی خطاب

ہے جس کا یقین ایک ولی کے قلب میں روشن ہونے والی طمانیت وسکینت
کرتی ہے۔ لہٰذا کلام الٰہی اور وحی خداوندی ایک ظاہری حقیقت بھی ہے
اور باطنی حقیقت بھی۔ اس لیے اس کے انکار سے ظاہر اور باطن دونوں
ہلاکتیں پیدا ہوتی ہیں اور الہام ایک باطنی حقیقت ہے۔ اس کے انکار سے
صرف باطن خراب ہوتا ہے۔ یعنی کفر وانکار کا درجہ پیدا نہیں ہوتا۔''

مطلب یہ کہ وحی الٰہی نبی کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی حجت ہے اور الہام صرف خود ولی کے لیے حجت ہے، دوسروں کے لیے حجت نہیں۔

اب مسئلہ صاف ہو گیا کہ حضرات انبیا کی حفاظت وحی الٰہی کرتی ہے جو امر یقینی ہے جس کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت و پاکیزگی پر یقین رکھنا واجب ہوتا ہے۔ بخلاف اولیا کے۔ جن کی حفاظت الہام کے ذریعے ہوتی ہے اور الہام ایک ظنی چیز ہے اور اس پر یقین رکھنا واجب نہیں۔

حضرت شیخ محدثؒ نے حضرات انبیا کی زُلّات (لغزشوں) کے بارے میں ایک نہا: ت محققانہ بات لکھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن و احادیث میں حضرات انبیا کی طرف خطا و غلطیوں کا انتساب کیا گیا ہے اور حضور علیہ السلام کے متعلق چند واقعات بھی بیان کیے ہیں۔ اس کی کیا حقیقت ہے؟ شیخؒ نے یہ عظیم نکتہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی عظیم کتاب عوارف المعارف کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''الا بعض جزئیات احکام نفس و جبلت بنعت لطافت و نورانیت
نگاہ داشتہ اند و تا ظہور اثر آں صفت نزول وحی و تقریب وضع
احکام شرعیہ درایشاں گردد۔''

''یعنی عظمت و تحفظ کے باوجود بعض بشری اور فطری صفات بڑے لطافت
و نورانیت کے ساتھ حضرات انبیا میں رکھی گئیں تا کہ اس بشری صفت
(بھول چوک اور لغزش) کے ظاہر ہونے پر خدا کی طرف سے موقع و محل کی
مناسبت سے احکام نازل ہوں۔''

مطلب حضرت شیخ الشیوخ سہروردی علیہ الرحمہ کا یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام کی

لغزشیں اور بھول چوک بھی دین کی مصلحت کے تحت نمودار ہوتی ہیں۔ ان لغزشوں میں خود نبی ورسول کی نفسانی خواہش محرک نہیں ہوتی، اگرچہ ظاہری طور پر ایسا نظر آتا ہے۔ لیکن وہ ظاہری اسباب کی خانہ پری ہوتی ہے۔

قرآن کریم میں پانچ ایسے مقام ہیں جہاں خداوند عالم نے رسول محترم صلی اللہ علیہ وسلم پر پیار بھری خفگی کا اظہار کیا ہے۔ بعض تیز قلم مصنّفین نے اسے نہایت سخت الفاظ (ڈانٹ تنبیہ اور عقاب) سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن امام المفسرین حضرت شاہ عبد القادر صاحب محدث دہلویؒ نے ایک نہایت خوب صورت اور باادب لفظ سے تعبیر کیا ہے اور لکھا ہے۔

''اللہ تعالیٰ نے آپ کی تربیت فرمائی۔''

(سورہ آل عمران، آیت نمبر ۱۲۸ کا تفسیری حاشیہ دیکھو)

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے جس کیفیت کو راحت اطاعت فرمایا ہے یہ حدیث پاک کے لفظ **حَلَاوَۃُ الْاِیْمَان** (ایمان کی مٹھاس) کی تفسیر ہے اور بلاشبہ حدیث پاک کے مطابق اس مٹھاس کا اَ۔ لمحہ اتنا ہی بیش قیمت ہے، حدیث پاک یہ ہے:

ثَلٰثٌ مِنْ کُنَّ فِیْہِ ِ جَدَ بِھِنَّ حَلَاوَۃُ الْاِیْمَانِ (۱) مَنْ کَانَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَحَبُّ اِلَیْہِ مِمَّا سِوَاھُمَا (۲) وَمَنْ اَحَبُّ عَبْدًا لَا یَحِبُّہٗ اِلَّا اللّٰہُ (۳) وَمَنْ یُکْرِہُ اَنْ یُعُوْذَ فِی الْکُفْرِ بَعْدَ اَنْ اَنْقَذَہُ اللّٰہُ مِنْہُ کَمَا یُکْرِ یُلْقٰی فِی النَّارِ. (عن انس رضی اللہ عنہ۔ مشکوٰۃ ۱۲ بہ حوالہ متفق علیہ)

''تین باتیں ایسی ہی کہ جس شخص میں وہ پائی جاتی ہیں، وہ شخص ایمانی حلاوت سے بہرہ مند ہو جاتا ہے۔

۱۔ جو شخص ساری کائنات سے زیادہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔
۲۔ جو شخص کسی بندۂ خدا سے محبت کرتا ہے تو وہ صرف خدا کی خوشنودی کے لیے کرتا ہے۔
۳۔ جو شخص ایمان کی دولت پانے کے بعد کفر کی طرف لوٹ جانے کو اور

آگ سے نجات پانے کے بعد پھر آگ میں واپس جانے کو ایسا برا سمجھتا ہے جیسے اسے جیتے جی آگ میں ڈالا جا رہا ہے۔"

محدثین کے الفاظ حلاوۃ الایمان کی تشریح میں یہ ہیں۔

وَمَعْنٰی حَلَاوَۃُ الْاِیْمَانِ اِسْتِلْذَاذُ الطَّاعَاتِ.

(علامہ علی قاری)

مولانا رومیؒ نے توبہ کے بعد ترقی درجات کے فلسفے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ہر کہ نقص خویش رادید و شناخت — اندر است کمال خود دو اسپہ تاخت

زاں نمے پرّد بسوے ذوالجلال — کو گمانے مے برد خود را کمال

علتے بدتر ز پندارِ کمال — نیست اندر جانت اے مغرور ضال

"جو شخص اپنی کمزوریوں کو سمجھ لیتا ہے وہ انھیں دور کرنے اور اپنے اندر کمال پیدا کرنے کے لیے دو گھوڑوں کی بگھی پر دوڑتا ہے، اور جو قوم پندار کمال میں مبتلا ہوتی ہے وہ مردہ ہو جاتی ہے۔"

آگے حضرت شیخؒ نے فرمایا:

"مردانِ خدا خود را پوشیدہ داشتہ اند و حق تعالیٰ ایشاں را ظاہر گردانیدہ است۔"

"خدا کے خاص بندے اپنے آپ کو پوشیدہ رکھتے ہیں اور حق تعالیٰ انھیں ظاہر کر دیتا ہے۔"

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے اس مختصر کلام میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات کا خلاصہ بیان فرمایا ہے۔ ایک ارشاد گرامی ہے۔

اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَیْکُمُ الشِّرْکُ الْاَصْغَرُ قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مَاشِرْکُ الْاَصْغَرِ؟ قَالَ الرِّیَاءُ.

(مشکوٰۃ ۴۵۶ بہ حوالہ احمد)

"تمہارے بارے میں سب سے بڑا خطرہ شرک اصغر (چھوٹے

شرک) کو سمجھتا ہوں حضرات صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم! وہ چھوٹا شرک کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ریاکاری اور نمائش پسندی۔"

اس خطرے سے بچنے کے لیے خدا کے کامل بندے اپنی اچھائیوں اور نیکیوں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے، آپ نے فرمایا:

مَنْ کَانَتْ لَہٗ سَرِیْرَۃٌ صَالِحَۃٌ اَوْسَیِّئَۃٌ اَظْھَرُ اللّٰہُ مِنْھَا رِدَاءً یُّعْرَفُ بِہٖ. (مشکوٰۃ۔ عن عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ، صفحہ ۴۵۶)

ہر شخص کی کوئی مخفی بات اچھی ہو یا بری ہو، اللہ تعالیٰ اسے ایک علامت اور نشان کے ذریعے ظاہر کر دیتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھی یا بری علامت کو رداء (چادر) سے تعبیر فرمایا۔ کیوں کہ چادر انسان کے اوپر پڑی ہوئی ہوتی ہے اور دور سے نظر آ جاتی ہے۔ ایک ارشاد گرامی میں فرمایا:

رُبَّ اَشْعَثَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰہِ لَاَبَرَّہٗ. (عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ، صفحہ ۴۴۶)

"بہت سے لوگ جو پراگندہ بال اور خستہ حال ہوتے ہیں اور انھیں دروازوں سے دھکیل دیا جاتا ہے۔ لیکن اللہ کے نزدیک ان کی مقبولیت کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی معاملے میں خدا کی قسم کھا لیتے ہیں، تو خدا تعالیٰ اسے پورا کر دیتا ہے۔"

غیبی آواز جو خواجہ ابوالحسن نوریؒ نے سنی اس کا یہی مطلب ہے۔

اَلْحَقُّ لَا یَسْتُرُہٗ شَیْءٌ.

"سچائی، عقیدے کی ہو یا عمل کی، اسے کوئی طاقت چھپا نہیں سکتی۔"

اَلْحَقُّ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی.

"سچائی غالب آ کر رہتی ہے۔ ہمیشہ مغلوب نہیں رہتی۔"

بنی اسرائیل کی توبہ:

یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر جانے کے بعد سامری کے

کہنے میں آکر بچھڑے کی پرستش کی، اس گناہ کی توبہ عملی طور پر کرائی گئی، حکم الٰہی ہوا کہ:

فَاقْتُلُوْا اَنْفُسَکُمْ. (بقرہ:۵۴)

"اے یہود! تم اپنے آپ کو ہلاک کرو۔"

علما نے اس کی یہ صورت لکھی ہے کہ اس کے بارے میں یہود کے تین گروہ ہو گئے تھے۔

ا۔ایک گروہ نے پرستش کی۔
۲۔دوسرے نے علاحدگی اختیار کی لیکن لوگوں کو منع بھی نہیں کیا۔
۳۔تیسرا گروہ وہ تھا جو اس فعل سے الگ بھی رہا اور لوگوں کو روکتا بھی رہا۔

دوسرے گروہ کو حکم دیا گیا کہ وہ پہلے مجرم گروہ کو قتل کرے، تا کہ مجرموں کو سزا ملے اور قتل کرنے والوں کو قتل کرنے میں اذیت محسوس ہو، کیوں کہ اس نے اس جرم پر خاموشی اختیار کی تھی، تیسرا گروہ بالکل محفوظ رہا۔

دراصل یہ سزائے مرتد تھی، اسلام میں بھی مرتد کی سزا کچھ تفصیل کے ساتھ یہی ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ لیکن یہ سزا قاضی کے فیصلے کے بعد حکومت جاری کرے گی۔

عوام قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتے، حدود اللہ کے اجراء کا تعلق حکومت سے ہے۔

امام احمد ابن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ توبہ کا یہ طریقہ اسلام سے پہلے تھا۔ اسلام میں جائز نہیں۔ ایک بزرگ کے حوالے سے لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ انھوں نے اپنی ایک آنکھ نکال دی تھی۔ ان سے کوئی خطا ہو گئی تھی۔ امام احمدؒ نے اس سلسلے میں یہ فرمایا کہ ان کے لیے ایک آنکھ نکال دینا جائز نہیں تھا بلکہ سچے دل سے توبہ کر لینا کافی تھا۔

(حیاۃ الحیوان۔جلد ۳، صفحہ ۳۲۵)

جلد اول:
دوسری مجلس:

تصوف وروحانیت میں باپ کے بعد بیٹے کا کوئی مسئلہ نہیں، صلاحیت اور اہلیت کی اہمیت ہے

اکابر صوفیا نے صلاحیت کو اہمیت دی

حضرت ابن عباسؓ کا امت مسلمہ کے زوال پر اہم تبصرہ اور پیشین گوئی

خواجہ حسن علیہ الرحمہ اپنے غلام ملیح کو شیخ علیہ الرحمہ کی خدمت میں لائے اور اپنے مرید ہونے کے شکریے میں اسے شیخ کی نذر کیا۔ شیخ کے سامنے خواجہ حسنؒ نے اسے آزاد کیا اور وہ شیخ کی ارادت میں داخل ہو گیا۔ شیخ علیہ الرحمہ نے ماحول کی مناسبت سے رشاد فرمایا۔

"دریں راہ خواجگی و غلامی درمیان نیست ہر کہ در عالم محبت درست آمد کار او ساختہ شد۔"

"تصوف و سلوک کی دنیا میں آقائی اور غلامی کا کوئی مسئلہ نہیں، جو بھی محبت کی دنیا میں کھرا اترتا ہے اس کا کام بن جاتا ہے۔"

پھر غزنی کے ایک بزرگ کا واقعہ سنایا کہ ان کا ایک غلام زیرک نامی تھا، جو صدق وصلاحیت میں بڑا مرتبہ رکھتا تھا، ان بزرگ کا جب آخری وقت ہوا تو متوسلین نے پوچھا آپ کا جانشین کون ہوگا؟ بزرگ نے فرمایا، میرا غلام زیرک! اس بزرگ کے چار بیٹے تھے۔ زیرک نے اپنے پیر سے عرض کیا کہ آپ کے چار لڑکے ہیں، وہ مجھے آپ کی جگہ کیسے بیٹھنے دیں گے؟ شیخ نے کہا، تم فکر نہ کرو، میں ان کے شر سے تمھیں

بچالوں گا۔ پھر پیر صاحب کا وصال ہو گیا اور زیرک نے اپنے پیر کی جگہ سنبھال لی، بیٹوں نے جھگڑا شروع کر دیا۔ زیرک پیر کے مزار پر حاضر ہوا اور پیر صاحب کو ان کا وعدہ یاد دلایا اور واپس آ گیا۔ چند روز کے بعد غزنی پر دشمنوں نے حملہ کر دیا اور اس لڑائی میں بزرگ کے چاروں بیٹے شہید ہو گئے اور زیرک کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔
(ص ۱۹۷)

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے حکایت کے پیرایے میں قرآن کریم کے اس بنیادی اصول کی طرف اشارہ فرمایا کہ:

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ. (سورۂ حجرات:۱۳)

''بے شک اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ تقویٰ والا ہے۔''

شیخ علیہ الرحمہ نے اپنے دادا پیر حضرت قطب صاحب علیہ الرحمہ کی مثال دے کر فرمایا کہ حضرتؒ کے دو صاحب زادے جڑواں تھے، ایک لڑکے کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔ دوسرے لڑکے کی حالت یہ تھی:

''اما آنکہ بزرگ شد، ہیچ شیخ نمے مانست واحوال او با احوال شیخ، ہیچ نسبتے نداشت فرزند شیخ قطب الدین شیخ الاسلام فرید الدین بود نور اللہ مرقدہما۔''

''دوسرا لڑکا جوان ہوا مگر اسے شیخ قطب صاحبؒ کے ساتھ کوئی نسبت نہ تھی اور اس کے حالات شیخ سے کوئی میل نہ کھاتے تھے۔ شیخ قطب صاحبؒ کے فرزند تو حضرت بابا فرید تھے۔ خدا تعالیٰ ان کی قبروں کو منور فرمائے۔'' (جلد ۲، مجلس ۱۸، صفحہ ۳۹۳)

شیخ علیہ الرحمہ نے شیخ شہاب الدین سہروردی علیہ الرحمہ کے جوان (تیس سالہ) لڑکے عماد کا حال لکھا ہے کہ اسے اپنے باپ کے حالات سے کوئی مناسبت نہیں تھی، چناں چہ جب شیخؒ کا آخری وقت ہونے لگا تو وہ لڑکا شیخ کے خادم کے پاس آیا اور اس سے شیخ کے خزانے کی کنجی طلب کی۔ شیخؒ کی خدمت میں نذرانے بہت آتے تھے مگر شیخؒ

فوراً انھیں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ لڑکے کو بڑی امید ہو گی۔ اس نے اس نازک وقت میں کنجی طلب کی، خادم نے کہا:

''ایں ساعت چہ وقت ست، شیخ در حالت نزع بود۔''

''شیخ پر نزع کی حالت طاری ہے، یہ وقت کنجی مانگنے کا ہے؟''

شیخؒ نے یہ گفتگو سن لی، فرمایا، اسے کنجی دیدو، خادم نے دیدی۔ اس نے شیخ کی الماری کھولی تو اس میں صرف چھ دینار نکلے، اور پھر وہ بھی شیخ کی تجہیز و تکفین پر خرچ ہو گئے۔ (جلد ۴، مجلس ۳۹، صفحہ ۷۹۲)

اس لڑکے کو یہ معلوم نہ تھا کہ میرا باپ تو ان اصحاب فقر کا سرتاج ہے جن کا مشرب یہ ہے۔

دولت فقر خدایا بمن ارزانی دار
کیں کرامت سبب حشمت و تمکین منست

مولانا رومیؒ صلاحیت اور نسب کے بارے میں فرماتے ہیں:

گفت حق نے بلکہ لا انساب شد — زہد و تقویٰ فضل را محراب شد
ایں نہ میراث جہاں فانی ست — کہ بہ انسابش بیابی جانے ست
بلکہ ایں میرا شہائے انبیا ست — وارث ایں جانہائے اتقیاست

''حق تعالیٰ نے اعلان کر دیا ہے کہ زہد و تقویٰ فضیلت کی محراب ہے، نسب اور حسب کا اس سے کوئی تعلق نہیں، انبیا کی میراث اتقیا پاتے ہیں۔ یہ میراث اس جہان فانی کی نہیں، جو اولاد میں تقسیم کی جائے۔''

زوال امت کا پہلا قدم:

اسلام جو اصول علم و عمل کا پیغام دیتا ہے اور نسب و حسب اور رنگ و نسل کی برتری کو مسترد کرتا ہے، اس کے زوال کا آغاز اسی بنیادی تعلیم کے زوال سے ہوا۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

ثَلٰثُ اٰيَاتٍ جَحَدَهُنَّ النَّاسُ قَالَ تَعَالٰى اِنَّ اَكْرَمَكُمْ

عِندَ اللّٰهِ اَتْقٰكُم — وَيَقُولُونَ اِنَّ اَكْرَمَهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَعْظَمُ بَيْتًا وَالْاَدَبَ كُلًّا قَدْ حَجَدَهُنَّ النَّاسُ.

(ابن کثیر سورۂ نور، ص:۲۸۰)

"تین آیات قرآنی ایسی ہیں جن کو لوگوں نے فراموش کردیا ہے، جن میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، تم میں باعزت وہ ہے جس میں پرہیزگاری اور خداترسی کا جذبہ زیادہ ہے اور لوگ یہ کہتے ہیں کہ باعزت وہ ہے جس کے پاس اونچے اونچے مکان ہیں اور رہا ادب و اخلاق کا معاملہ تو اسے لوگوں نے بالکل ہی بھلا دیا ہے۔"

اقبالؒ کہتے ہیں:

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

حضرت ابن عباسؓ اس وقت حیات تھے جب بنی امیہ کی خاندان نوازی کا زور شروع ہوا اور ایمان وعمل اور گفتار و کردار کی صلاحیت پس پشت ڈالی جانے لگی۔ آپ نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

لیکن حضرات صوفیا کی روحانی خانقاہوں میں نسب وحسب کی اہمیت نے ایمان وعمل کی اہمیت اور افضلیت کو ختم نہیں کیا اور صوفیا کا روحانی نظام صلاحیت پر قایم رہا۔ لیکن افسوس زمانۂ حال میں طبقہ علما وصوفیا کے اندر بھی تقویٰ کی برتری کا اصول ختم ہوگیا او. باپ کے بعد بیٹے کے عجمی رواج نے جگہ حاصل کرلی۔

روحانی کمال جدوجہد سے ملتا ہے:

فرمایا: انسان کا روحانی کمال چار باتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

قِلَّتُ الطَّعَامِ، قِلَّتُ الْكَلَامِ، قِلَّتُ الْمَنَامِ، قِلَّتُ الصُّحْبَةِ مَعَ الْاَنَامِ.

"کم کھانے سے، کم بولنے سے، کم سونے سے، لوگوں کے ساتھ کم ملنے

جلنے سے۔"

پھر یہ اشعار سنائے۔

گرچہ ایزد دہد ہدایتِ دین — بندہ را اجتہاد باید کرد
نامۂ کاں بحشر خواہی خواند — ہم ازیں جا سواد باید کرد

"دین کی ہدایت حقیقت میں خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہے لیکن کوشش بندے کو بھی کرنی چاہیے اور جو نامۂ اعمال تمھیں میدان حشر میں پڑھنا ہے اس کی مشق تمھیں دنیا میں کرنی چاہیے، یعنی روزانہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرنا چاہیے۔" (جلد۱، پہلی مجلس، صفحہ۱۹۲)

میرے کھوٹے اعمال واپس نہ کر:

شیخ علیہ الرحمہ نے خدا تعالیٰ کی عنایت بے پایاں کا ذکر کرتے ہوئے شیخ عثمان حرب آبادیؒ کا تذکرہ فرمایا۔ یہ شیخ.....غزنی میں رہتے تھے اور ان کی دال سبزی روٹی کا دکان تھی، لیکن خدا تعالیٰ نے ان پر کیسا فضل فرمایا؟

شیخؒ نے یہ شعر پڑھا ہے۔

حق بشباں تاج نبوت دہد
ورنہ نبوت چہ شناسد شباں

"حق تعالیٰ نے ایک چرواہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا کردی ورنہ چرواہا کیا جانے کہ نبوت کیا ہے؟"

ان کی حالت یہ تھی کہ اگر گاہک انھیں کھوٹے سکے بھی دے جاتے تو یہ انھیں رکھ لیتے۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ شیخ عثمانؒ نان بائی کو کھوٹے کھرے کی تمیز نہیں ہے۔

وفات کا وقت آیا، انھوں نے خداوند عالم سے عرض کیا، آسمان کی طرف سر اٹھایا:

"خداوند عالم! تو دانا تری کہ خلوق مرادرم قلب دادند ومن بجائے سرہ قبول کردم و بر روئے ایشاں ردنکردہ ام۔ اگر ازمن طاعت قلبی در وجود آمدہ است، بکرم خود برروئے من رومکن۔"

"خداوند عالم! تو خوب جانتا ہے کہ لوگ مجھے کھوٹے درہم دے جاتے
تھے اور میں کھرے سکوں کی جگہ انھیں قبول کر لیتا تھا اور کھوٹے سکے ان کہ
منہ پر نہیں مارتا تھا۔ پس اے مولیٰ! اگر مجھ سے بھی کھوٹی عبادت ہوئی ہے
تو تو بھی اپنے فضل وکرم سے اسے واپس نہ کر۔"

پھر شیخ علیہ الرحمہ نے شیخ عثمان حرب آبادیؒ کی ایک کرامت بیان کی۔
ایک درویش ان کی دکان پر آیا اور ان سے کھانا مانگا۔ انھوں نے دیگ میں کف
گیر ڈال کر کھانا نکالا تو کف گیر میں ہیرے موتی تھے۔ درویش نے کہا، مجھے ان کا کیا
کرنا ہے؟ کھانا لایے۔ دوبارہ کف گیر ڈالا تو اب کے اس میں سونا چاندی تھا۔
درویش نے پھر یہی کہا۔ تیسری دفعہ شیخ عثمانؒ نے کف گیر ڈالا تو اب کی دفعہ اس میں
کھانا تھا۔

درویش نے قبول کر کے کھانا کھالیا۔ اور کہا:

"آں درویش چوں ایں حال بدید، شیخ را گفت، اکنوں ترا ایں
جا بیش نباید بود۔"

"اس درویش نے شیخ عثمانؒ کے کمال مرتبے کی یہ حالت دیکھی تو ان سے
کہا، اب آپ کی یہ جگہ نہیں ہے، یہاں سے چلے جایے۔"

چند روز کے بعد شیخ عثمانؒ کا وصال ہو گیا۔

شیخ علیہ الرحمہ نے شیخ عثمانؒ کی اس ریاضت، صبر اور ایثار کا ذکر کرنے کے بعد
ان کی یہ کرامت سنائی، اور بتایا کہ شیخ عثمانؒ نے زندگی بھر جس عملی کرامت (خدمت
خلق اور نفس کشی) کا مظاہرہ کیا اس کے نتیجے میں انھیں یہ کرامت حاصل ہو گئی۔

شیخؒ نے حکیم سنائی کا یہ شعر پڑھا ؎

بیش منما جمال جہاں افروز
چوں نمودی برو سپند بسوز

مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمہ نے اپنے سحر آگیں اور عشق افروز الفاظ میں
مقام محمود کی جو تشریح کی ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے۔

آں جمال تو چیست مستی تو
واں سپند تو چیست ہستی تو

"اے محبوب! تو اپنا جمال جہاں آراء زیادہ نہ دکھا اور اگر دکھایا ہے تو
جاں ذرا اتارنے کے لیے کالا دانا جلا۔ تیرا وہ جمال کیا ہے؟ تیری وہ مستی
و بے خودی اور تیرا وہ کالا دانہ کیا ہے؟ وہ تیری ہستی اور تیرا وجود۔"

(جلد ۱، مجلس ۲۹، صفحہ ۲۹۱)

جلد اول:
تیرہویں مجلس:

عبادتِ لازمی اور عبادتِ متعدی کا فرق، خدمتِ خلق کی اخلاص کے بغیر بھی عبادت قبول کی جاتی ہے

شیخ علیہ الرحمہ کی مختلف احادیث پر محققانہ نظر:

شیخ علیہ الرحمہ نے ایک مجلس میں عبادت کی دو قسمیں کیں۔ ایک عبادت لازمی دوسری عبادت متعدی۔ اور دونوں قسم کی عبادات کے درمیان ایک نہایت حکیمانہ فرق بیان کیا۔ فرمایا:

"لازمی اطاعت وہ ہے جس کا فایدہ اطاعت گزار کی ذات کو پہنچتا ہے اور یہ نماز، روزہ، حج اور ذکر الہٰی ہے۔ اور متعدی اطاعت وہ ہے جس کا فایدہ دوسروں کو پہنچے، خدا کی راہ میں انفاق اور صدقہ کرنے سے اور جہاں تک ممکن ہو دوسروں کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے کام کرنے سے لازمی اطاعت میں اخلاص ضروری ہے اور متعدی عبادت جس طرح ادا کی جائے اس کا اجر وثواب ملتا ہے۔" (جلد ا، مجلس ۱۳، صفحہ ۲۲۷)

شیخ علیہ الرحمہ نے بخاری شریف کی جس حدیث سے اور اس کی شرح کرتے ہوئے شارح بخاری علامہ عینیؒ نے جو کلام کیا ہے اس کلام سے استنباط کرتے ہوئے جو اوپر والا فرق دونوں قسم کی عبادتوں میں کیا ہے۔ پہلے اسے دیکھیے۔

امام بخاریؒ نے کتاب الزراعت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد عالی نقل کیا ہے:

مَامِنْ مُسْلِمٍ یَغْرِسُ غَرْسًا اَوْ یَزْرَعُ زَرْعًا فَیَاْکُلُ مِنْهُ

طَيْرٌ اَوْ اِنْسَانٌ اَوْ بَهِيمَةٌ اِلَّا كَانَ لَهٗ بِهٖ صَدَقَةٌ.

(جلد۱، صفحہ۳۱۲)

"جو مسلمان کوئی پودا لگاتا ہے یا کھیتی کرتا ہے اور پرندہ یا انسان یا کوئی مویشی اسے کھاتا ہے تو وہ اس کے لیے صدقہ کرنے کے حکم میں ہے۔"

علامہ عینیؒ نے الفاظ حدیث کے عموم کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"علمائے اسلام نے کہا ہے کہ کھیتی کرنے والا اجر وثواب کی نیت کرے یا نہ کرے ہر حالت میں اسے آخرت کا اجر ملے گا۔ کیوں کہ لِوُسْعَتِهٖ عَلَى النَّاسِ فِي اَقْوَاتِهِمْ اس کے اس عمل سے مخلوق خدا کی روزی میں اضافہ ہوتا ہے۔ (عینی جلد۵، صفحہ۱۷۱)"

اس حدیث پر فقہائے اسلام نے کہا ہے کہ کھیتی ایسا عمل خیر ہے جس پر مسلمان اور غیر مسلم دونوں کو ثواب ملتا ہے۔ (مبسوط للعلامہ سرخسیؒ۔ جلد۲۳، کتاب الزراعت)

شیخ علیہ الرحمہ نے کھیتی اور باغ بانی پر قیاس کر کے ہر ایسے عمل خیر کے لیے یہ حکم لگادیا ہے جس عمل خیر سے خدا کی مخلوق کو فایدہ پہنچتا ہے۔ شیخ علیہ الرحمہ کا یہ فقہی اجتہاد الہامی حکمت اور شرعی فہم وبصیرت کا نتیجہ ہے۔ یہ حکمت کتاب الٰہی کے ساتھ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی خفی نازل ہوئی اور آپ کے نائبین (علمائے حق واہل اللہ) پر بذریعہ القا والہام نازل ہوتی ہے یہ حکمت وہ فہم وبصیرت ہے جس کے ذریعے کتاب الٰہی کے احکام کو موقعہ ومحل اور احوال وظروف کی رعایت سے پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت شیخ علیہ الرحمہ کو آپ کے مشن (محبت کی راہ سے حق کی اشاعت) کے تعلق سے یہ حکیمانہ تعبیر سکھائی گئی۔

قرآن کریم نے اعمال حسنہ کی قبولیت کے لیے اخلاص اور رضائے الٰہی کے جذبے کی شرط لگائی۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ. (البینۃ:۵)

"اور ان کو یہی حکم ہوا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، مخلص ہو کر اور یک سو ہو کر۔"

احادیث میں آتا ہے کہ جن تین شخصیتوں سے جہنم کے عذاب کی ابتدا کی جائے گی یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے تلاوت قرآن، جہاد فی سبیل اللہ اور انفاق (زکوٰۃ) ادا کرنے میں دکھاوا کیا ہوگا۔ ایک حدیث میں واضح طور پر دکھاوے کو شرک قرار دیا گیا۔ (مشکوٰۃ:۴۵۶)

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان عبادات لازمہ کا تعلق حقوق اللہ سے ہے اور اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ میرا حق صرف میری خوش نودی کے لیے ادا کیا جائے۔

اس عبادت سے میری کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی، اس کا فایدہ پلٹ کر عبادت گذار بندے ہی کو پہنچتا ہے، لیکن جب میرے بندے میری رضا کے ساتھ مخلوق کی رضا کو پیش نظر رکھتے ہیں تو یہ شرک فی الرضا ہے جو خدا تعالیٰ کو کسی حالت میں پسند نہیں۔ حافظ شیرازی نے کیا خوب کہا ہے ؎

تو بندگی وگدایاں بشرط مزد مکن
کہ دوست خو دروش بندہ پروری داند

"اس آقائے علیم وخبیر سے زیادہ اپنے بندے کی ضرورتوں کو اور ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے مناسب حال طریقوں کو دوسرا کوئی نہیں جانتا۔"

رہی بات عبادت متعدی کی! جو ضرورت مندوں کی مالی امداد سے اوروں کے ساتھ اچھے سلوک اور اچھے اخلاق کے ذریعے ادا کی جاتی ہے اور یہ حقوق العباد کہلاتے ہیں، تو ان کا مقصد مخلوق کی احتیاج پوری کرنا ہے، وہ ہر صورت میں پوری ہوتی ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ کے اس اجتہاد کی تائید رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی سے بھی ہوتی ہے جس میں آپ نے ایمان دار اور سچے تاجر کو آخرت میں حضرات انبیا وصدیقین کے ساتھ رفاقت کی خوش خبری دی ہے اور فرمایا ہے:

اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ

وَالصَّالِحِین.....الخ

مطلب یہ ہوا کہ تجارت ایک عبادت متعدی ہے جس پر ہر حال میں آخرت کا اجر مرتب ہوگا۔ نیت کچھ بھی ہو البتہ ظاہری امانت اور دیانت کے ساتھ ہو۔ ایک حدیث پاک میں حضرت سعدؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''سعد! تم نے اگر کسی وقت اپنی اہلیہ کے منہ میں محبت کے ساتھ نوالہ بھی دیا ہے تو وہ بھی تمہارے نیک اعمال میں شامل ہے پھر تم آخرت کا اتنا فکر کیوں کر رہے ہو؟ سعد بیماری کی حالت میں آخرت کی طرف سے فکر مند تھے۔''

یہ عمل بھی سعدؓ کا عبادت متعدی میں شامل تھا۔

عبادت متعدی (خدمت خلق) کی اہمیت کے بارے میں امام بخاریؒ نے دو حدیثیں نقل کی ہیں۔ ایک حدیث یہ ہے کہ پچھلی امتوں میں ایک بازاری عورت تھی جو پیاسے کتے کو پانی پلانے پر جنت کی مستحق قرار دیدی گئی اور ایک عورت کو اس عمل پر داخل جہنم کر دیا گیا کہ اس نے اپنی بلی کو تمام رات باندھے رکھا اور وہ پیاس سے ہلاک ہوگئی۔ (مشکوٰۃ:۱۶۸)

حضرت عمرؓ کو حضرت ابن عباسؓ نے خواب میں دیکھا اور پوچھا، کس عمل پر آپ کی بخشش ہوئی؟ تو انھوں نے فرمایا، اس عمل پر کہ میں نے ایک بچے کے ہاتھ سے ایک درہم دے کر چڑیا کو آزاد کرایا تھا۔

امام غزالیؒ نے خواب میں فرمایا۔ میرے قلم پر لکھنے کے وقت ایک مکھی آ بیٹھی میں نے اپنا ہاتھ روک لیا تا کہ وہ قلم کے قط پر لگی ہوئی سیاہی سے اپنی پیاس بجھالے، وہ مکھی جب اڑ گئی تب میں نے قلم کو حرکت دی، پس میرے مولا کو اس عمل پر پیار آ گیا اور مجھے بخش دیا۔

عبادات لازمہ (نماز، روزہ) میں بھی دکھاوے کا ایک پہلو دوسروں کو ترغیب دینا اور شوق دلانا ہے، اس پہلو سے دکھاوے کو ایک حدیث میں موجب اجر و ثواب قرار دیا گیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، حضور! ایک دن میں گھر میں نماز ادا کر رہا تھا کہ ایک صاحب آ گئے، ان کے آنے سے میں خوش ہو گیا کہ انھوں نے مجھے نماز کی حالت میں دیکھا، آپ نے فرمایا:

رَحِمَکَ اللّٰهُ یَا اَبَا هُرَیْرَةَ! لَکَ اَجْرَانِ، اَجْرُ السِّرِّ وَ اَجْرُ الْعَلَانِیَةِ. (مشکوٰۃ:۴۵۴)

''اے ابو ہریرہ! خدا تجھ پر رحم کرے، تیرے لیے دوہرا ثواب ہے، ایک ثواب ہے خفیہ عبادت کا اور ایک ثواب اعلانیہ عبادت کا۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ کی خوشی کو مذموم ریا کاری پر محمول نہیں کیا بلکہ اس پہلو پر محمول کیا کہ وہ آنے والا مجھے نماز کی حالت میں اور وہ بھی گھر کے اندر دیکھ کر میری پیروی کرے گا اور نماز پڑھا کرے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ اگر کوئی سطحی نظر رکھنے والا مفتی ہوتا تو وہ ابو ہریرہؓ کی خوشی کو ریا کاری اور نمائش پسندی قرار دے کر ان کو مذمت کرتا۔ یہ بھی واضح رہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ نماز فرائض کے علاوہ سنن و نوافل تھے۔ کیوں کہ فرض نمازوں کو مساجد میں باجماعت نماز ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے البتہ سنن اور نفل نمازوں کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے **هٰذِهٖ صَلٰوةُ الْبُیُوْتِ** (عن کعب ابن عجرہ مشکوٰۃ صفحہ ۱۰۵ بحوالہ ابو داؤد و ترمذی) ''یہ گھر میں پڑھنے کی نماز ہے۔

یہ آپ نے اس موقع پر فرمایا جب بنی اشہل کی مسجد میں مغرب کے وقت لوگوں کو مغرب کے بعد کی سنتوں میں مشغول دیکھا۔

اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کا مطلب واضح ہو گیا، یعنی ابو ہریرہؓ کی نماز گھر میں۔ یہ خفیہ اور سری عبادت ہوئی اور آنے والے کو اس نماز سے ترغیب ہوئی۔ اس پہلو سے یہ نماز علانیہ اور جہری عبادت بن گئی۔

حضرت شیخ علیہ الرحمہ کے ارشاد گرامی میں ایک علمی نزاکت یہ ہے کہ آپ نے لازمی عبادات میں ارکان خمسہ کے اندر زکوٰۃ کو شامل نہیں کیا۔ کیوں کہ زکوٰۃ فرائض دین میں شامل ہے اور فرائض میں رضائے حق کی طلب لازمی ہے۔ اس میں ریا کاری

شرک کے خطے سے دوچار کر دیتی ہے۔اور فرائض دین کے تقدس کا احترام یہی تقاضا کرتا ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ کی نظر سورۂ بقرہ کی آیات (۲۶۴) اور (۲۷۲) پر یقیناً ہے۔ان آیات میں انفاق فرض (زکوٰۃ) کے لیے **اِبْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ** اور **اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ** کی شرط لگی ہوئی ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ نہایت نازک مسئلے پر گفتگو فرما رہے ہیں، جس میں ذرا سی لغزش سے بھی فقہا کو اعتراض کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔

اس لیے آپ نے اطاعت متعدیہ میں نفلی انفاق وصدقے کا ذکر فرمایا، شیخ علیہ الرحمہ نے مخلوق خدا کی مالی اور اخلاقی اعانت کو اخلاص کی شرط سے مستثنیٰ کر کے اور اس میں عموم واطلاق پیدا کر کے مسلمانوں کو یہ ترغیب دی کہ وہ جس طرح ہو سکے بندگان خدا کی مدد کریں۔

اس تاویل وتعبیر میں تصوف واحسان کے بنیادی تقاضے کی جھلک ہے اور اس تالیف قلب کی اہمیت کا اظہار ہے جو دعوت حق کے لیے ضروری ہے۔

آج ایک طبقہ کتاب وسنت کی خالص پیروی کے نام پر تصوف واحسان کی مخالفت میں یہ کہتا ہے:

> ''تبلیغ اسلام تصوف کے مقاصد میں داخل نہیں ہے اس لیے اشاعت اسلام کی داستانوں کو صوفیائے کرام کی طرف منسوب کرنا غلط ہے۔''
>
> (تحقیقات اسلامی سہ ماہی ۸۵ء علی گڑھ)

لیکن کیا اس طرز فکر سے تعلق رکھنے والے حضرات یہ بتائیں گے کہ پچھلے پچاس ساٹھ سال کے اندر مسلم دنیا کے جن جن حصوں میں تحریک اسلامی برپا ہوئی اس کے نتیجے میں کس ملک کے اندر اسلامی حکومت (کتاب وسنت کی قانونی فرماں روائی) قایم ہوئی؟

ابھی حال میں پاکستان کے مشہور مفکر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ترکی کا دورہ کیا ہے (''نداء'' لاہور، ستمبر ۹۲ء) میں اس کی رپورٹ شایع ہوئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب تحریک اسلامی اور تحریک خلافت کے رہنما وامیر ہیں، موصوف نے اس روداد سفر میں تسلیم کیا ہے کہ ترکی میں اسلامی احیا کے لیے باقاعدہ کوئی منظم کام نہیں ہو رہا، البتہ یہ دیکھ کر تعجب کرنا پڑا کہ بعض صوفی حلقے اپنے صوفیانہ طور وطریق کے ساتھ نہایت خاموشی سے سرگرم ہیں اور اس سرگرمی میں نہ صرف عمر رسیدہ ترکی مسلمان شامل ہیں بلکہ نوجوان ترک بھی اسلامی ہیئت کے ساتھ ذکر وشغل کے حلقوں میں شامل ہوتے ہیں۔

ایک مرعوب اور گھٹے ہوئے ماحول میں دین حق کے احیا وقیام کی جو حکمت عملی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تیرہ سالہ مکی زندگی میں نظر آتی ہے، اصل تصوف اسی حکمت عملی کا عکس ہے۔

بعض خانقاہی رسموں میں جو افراط وتفریط پیدا ہوگئی ہے اس سے اختلاف رکھنا الگ بات ہے اور صوفیائے ربانی کی کامیاب دعوتی جدوجہد پر پانی پھیر دینا ایک الگ بات ہے جو کسی طرح درست نہیں کہا جاسکتا۔

جلد اول:
سترویں مجلس:

توبہ میں استقامت کیا ہے؟

ایک عالم کی توبہ اور غیر عالم کی توبہ میں کیا فرق ہے؟

حضرت شیخ علیہ الرحمہ توبہ میں استقامت کی تشریح فرما رہے ہیں۔ قرآن کریم نے اس توبہ کو توبتہ النصوح کہا ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَیُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ۔ (التحریم:۷)

"اے ایمان والو! خدا کے حضور میں توبہ کرو، صاف دل کی توبہ، امید ہے کہ تمہارا پروردگار تم سے تمہاری برائیاں دور کر دے گا۔"

شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"صاف دل کی توبہ یہ کہ دل میں پھر خیال نہ رہے اس گناہ کا۔"

یعنی توبہ کرتے وقت اس گناہ کا خیال دل میں نہ ہو کہ توبہ کے بعد پھر ایسا کروں گا یہ دھوکا ہے اور خدا تعالیٰ علام الغیوب ہے، انسان انسان کی ریا کاری سے دھوکہ کھا سکتا ہے، خدا تعالیٰ دھوکہ نہیں کھا سکتا۔

شیخ علیہ الرحمہ نے پختہ توبہ اور توبہ میں جماؤ کی دو شرطیں بیان فرمائی ہیں۔

"دلیل بر صدق توبہ او بر شکستن قریناں و حریفان او باشد از و۔"

ا۔ پہلا ثبوت یہ ہے کہ اس کے برے دوستوں کا ساتھ چھوٹ جاتا ہے۔ یہ میرے دوست ہی ہیں جو گھیر گھار کر برائیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔

۲۔ دوسرا ثبوت یہ ہے کہ اس تائب کا دل اس گناہ کے خیال و میلان سے بھی پاک ہوجاتا ہے اور لوگوں میں اس گناہ گار کی بری زندگی اور اس کی برائیوں کا چرچا اس وقت تک ہوتا ہے جب تک اس کے اندر گناہ کی طرف جھکاؤ اور میلان باقی رہتا ہے۔

''اندک مایہ دل آں کس براں فسق و معصیت مائل باشد۔''

اور جب اس کا دل بالکل پاک ہوجاتا ہے تو قدرت کا قانون یہ ہے کہ مخلوق کے ا[illegible] سے بھی اس کی بری یادیں مٹ جاتی ہیں۔ ویسے خدا کا قانون بھی یہ تاکید کرتا ہے۔

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الْاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (سورۂ حجرات:۱۱)

''اے لوگو! ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ اور آپس میں ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد نہ کیا کرو، بہت بری بات ہے یہ کہ ایک شخص کے ایمان لانے کے بعد اسے نافرمانی کے دور کے طعنے دینا اور اس دور کی برائیوں کا ذکر کرنا اور جو شخص ان برائیوں سے باز نہیں آئے گا تو وہ لوگ ظالم ہیں۔''

شیخ علیہ الرحمہ کی یہ ہدایات توبہ کرنے والے کی توبہ کو ایک سمجھدار اور عالم کی توبہ بنادیتی ہیں۔

مشہور نقش بندی بزرگ سید میر ہاشم علیہ الرحمہ مدینہ منورہ کے ایک استاد علامہ محمد برزنجی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ایک عالم اور شریعت کا فہم و شعور رکھنے والا جب کسی گناہ میں مبتلا ہوجاتا ہے تو اب اس کا احساس اسے توبہ و استغفار کی طرف لاتا ہے اور وہ متعدد عبادتیں اور نیکیاں کرتا ہے۔ مثال کے طور پر:

۱۔ گناہ کے بعد وہ اپنے نفس پر حقارت سے نگاہ ڈالتا ہے، یہ نیکی ہے۔
۲۔ اپنے نفس پر غصہ کرتا ہے، یہ دوسری نیکی ہے۔

۳۔ اس کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوتا ہے، یہ تیسری نیکی ہے۔
۴۔ اس کے اندر یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو اس پر پوری قدرت حاصل ہے، یہ چوتھی نیکی ہے۔
۵۔ خدا تعالیٰ سے عفو و کرم کی امید اس کے دل میں جاگ جاتی ہے، یہ پانچویں نیکی ہے۔
۶۔ وہ عفو و کرم کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے، یہ چھٹی نیکی ہے۔
۷۔ وہ یہ بھی یقین کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے، وہ بندے کے حق میں بہتر ہی ہوتا ہے، قبول کرے تو بہتر قبول نہ کرے تو بہتر، یہ ساتویں نیکی ہے۔

اب ایک جاہل اور بے شعور کی عبادت پر غور کیجیے، یہ شخص عبادت کرکے غرور نفس میں مبتلا ہوجاتا ہے، یہ گناہ ہے۔ دوسروں کو اپنے مقابلے میں حقیر سمجھتا ہے، یہ بھی گناہ ہے۔ اس لیے خدا کے نزدیک وہ عالم اور باشعور گناہ گار اس جاہل عبادت گزار سے بہتر ہے۔ (فیضان:۹۶)

شیخ علیہ الرحمہ نے توبہ کی استقامت کی جو تعریف کی ہے اس کا نمونہ شیخؒ کے محبوب مرید خواجہ حسنؒ کی توبہ ہے۔

خواجہ حسنؒ ایک ترک زادہ رئیس تھے، یہ دور ترکوں کے اقتدار کا تھا، جس میں ترکوں نے ہندوستان کے سامان عیش و عشرت کو دیکھ کر اس میں اپنے آپ کو منہمک کردیا تھا۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے ایسے نازک دور میں اس طبقے کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، خواجہ حسنؒ کو شیخؒ نے ایک مجلس عیش و طرب میں دیکھا، شیخ علیہ الرحمہ کی ان پر نظر پڑی۔ آپس میں گفتگو ہوئی، شیخ علیہ الرحمہ اپنی خانقاہ لوٹ آئے۔ محبوب الٰہیؒ کی نظر نے خواجہ حسنؒ کی دنیا بدل ڈالی وہ خانقاہ میں حاضر ہوئے۔

حضرت شیخؒ نے پھر ان سے ایسی توبہ کرائی کہ درویش بنادیا، ساری زندگی حسن نے شیخؒ کی خدمت میں گزاردی اور آپ کے ملفوظات مرتب کیے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے امیر حسن علاء سجزیؒ کو بہت بڑے پائے کا عالم لکھا

ہے۔ خواجہ حسن علاءؒ نے اپنی توبہ کے بارے میں یہ اشعار کہے ہیں۔

یک سر مو دلت سفید نہ شد ہیچ مو برتنت سیاہ نماند
اے حسن! توبہ آنگہے کردی کہ ترا طاقت گناہ نماند

"اے حسن! تیرے دل کی سیاہی دور نہ ہوئی حالاں کہ تیرے جسم کے تمام بال سفید ہو گئے، تو نے اس وقت توبہ کی جب تجھ میں گناہ کی طاقت نہ رہی۔"

دوسرے شعر میں کہتے ہیں۔

ایں گشت خطا کہ چوں حسن بوسہ زدم درِ ترا
پیشِ کمال عفو تو سہل بود خطا بے من

"اے خدا! حسن سے یہ خطا ہوئی کہ تیرے در کو بوسہ دیا، تیرے کمال عفو کرم کے سامنے میری خطا ہلکی ہے۔"

تیسرے شعر میں کہتے ہیں۔

اے حسن بوسہ بپایش زدنت بے ادبیست
پائے نازک نشود رنج نہ بوسیدنِ تو

جلد اول:
۳۳ویں مجلس:

فوائدالفواد کے مضامین میں بے ربطی کیوں؟

تلاوت قرآن کریم اور سماع شرعی کے روحانی اثرات،

قبولیت صدقہ کے شرائط

حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی علیہ الرحمہ نے اپنی مجلس مبارک (فوائد الفواد جلد اول ۳۳ ویں مجلس) میں ایک اہم اور مبسوط وعظ فرمایا جس میں تلاوت قرآن کریم اور سماع شرعی کی برکات، صدقہ وخیرات کی قبولیت کے شرائط، صدقے کی لغوی تحقیق کے حوالے سے نکاح اور ازدواجی رشتے کی اہمیت، حضرات شیخین کی فضیلت اور ہبہ (ہدیے کے طور پر دی گئی چیز) جیسے اہم مسائل پر تفسیر، فقہ اور تاریخ کی روشنی میں نہایت حکیمانہ بحث فرمائی۔ شیخ علیہ الرحمہ کے ملفوظات (مواعظ، تقاریر) جب تحریر کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں تو ہمیں ان کے اندر کتابی اور تصنیفی ربط کا فقدان محسوس ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ تقریر میں مقرر اور خطاب میں خطیب ماحول اور مخاطب اور مجمع کے حالات کو سامنے رکھتا ہے اور تحریر میں صاحب تصنیف وتحریر علمی موضوع مقرر کرتا ہے اور اسی موضوع پر اپنی تحریر کو جاری رکھتا ہے۔

قرآن کریم کی عبارت کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ قرآن کریم مختلف تقریروں اور خطبوں کی شکل میں نازل ہوا اور پھر ان تقریروں کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب کیا گیا۔ اب قرآن کریم کے مفسرین ان مختلف حصوں میں ربط ونظم قایم کرتے ہیں، شیخ

علیہ الرحمہ نے ہر مجلس میں مخاطب اہلِ مجلس کی رعایت سے مختلف مسائل پر اظہار خیال فرمایا۔ ہمارے سامنے ان مجلسوں میں شریک حضرات کے حالات نہیں ہیں اور ایک تحریر سامنے ہے۔ جس میں فطری طور پر ایک تصنیف جیسا ربط محسوس نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی میں بھی موقع محل کی رعایت کے تحت یہ صورت ملتی ہے۔ کسی حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ سب سے بڑی عبادت نماز ہے۔ کسی روایت میں یہ ہے کہ جنت کی ضمانت زبان کی صحت پر ہے۔ کسی حدیث میں صلح وصفائی کرانے کے عمل کو نماز اور روزے سے افضل قرار دیا گیا ہے۔

شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی علیہ الرحمہ نے اپنی مشہور کتاب مرج البحرین میں اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ حضرت شیخؒ نے اس کتاب میں بات میں بات پیدا کر کے مختلف مسائل پر اظہار خیال فرمایا اور جب کتاب میں بے ربطی محسوس ہوئی تو اس کی توجیہ مشیت الٰہی کے حوالے کر کے ذوق تصوف سے کام لیا۔ حالاں کہ شیخؒ ایک عظیم مصنف بھی تھے۔ فرماتے ہیں:

"اگر نظر باصطلاح اہلِ صناعت تصنیف اتساق کلام وانتظام سخن از دست رود گو کہ عنان اختیار بدست نیست، ازیں جا رفقہ بودیم کہ عقل را بمعرفت اسرار ایمان ...... بے تعلیم شرع ووحی آسمانی راہے نیست۔" (صفحہ ۳۳)

"اگر اس کتاب میں مصنفین کی اصطلاح کے مطابق کلام میں ربط ونظم ہاتھ سے نکل جائے تو یہ سمجھو اور یہ کہو کہ بندے کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہیں ہے۔

اور پھر یہیں سے ہم اس حقیقت تک پہنچتے ہیں کہ عقل انسانی کے لیے ایمان کے اسرار ورموز شریعت کا وحی الٰہی کی تعلیم کے بغیر جاننا ممکن نہیں۔"

حاصل یہ کہ خدا تعالیٰ اپنے بندے سے جو بات کہلوانا چاہتا ہے، بندے کے منہ

سے اور اس کی قلم سے وہی بات نکلتی ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے۔

وَمَا تَشَآءُ وْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ O

(سورۂ تکویر: ۲۹)

"اور اے لوگو! تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ رب العالمین نہ چاہے۔"

خدا تعالیٰ کے اس نظام میں ایک ظاہری اسباب کا سلسلہ ہے اور ایک اسباب کے پیچھے حاکم مطلق کی مشیت وارادہ ہے۔

قرآن کریم نے ظاہری اسباب کے لحاظ سے فرمایا:

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ O لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ O

"یہ قرآن کریم تمام جہاں والوں کے لیے نصیحت ہے۔ ان کے لیے جو سیدھا چلنا چاہیں۔"

پہلے فقرے میں قرآن کے مقصد نزول کا بیان ہے یعنی قرآن سب کے لیے آیا ہے۔ دوسرے فقرے میں قرآن سے فایدہ اٹھانے کی شرط بیان کی گئی ہے۔ یعنی اس ہدایت سے فایدہ وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو سیدھی راہ چلنا چاہیں۔ ابو جہل نے قرآن کریم کی اس آیت پر کہا۔

اَلْاَمْرُ اِلَيْنَا اِنْ شَأَ اسْتَقَمْنَا وَاِنْ شَأُ لَمْ نَسْتَقِمْ.

"معاملہ ہمارے اختیار میں ہے، اگر ہم چاہیں تو سیدھے چلیں اور اگر چاہیں تو نہ چلیں۔"

عالم اسباب کے محدود اختیار پر تکبر اور تعلّی کا اظہار انسان کی زبردست نادانی اور سرکشی ہے۔ قرآن کریم نے اس کی اس طرح اصلاح کی کہ حقیقی محرک اور عامل کی طرف توجہ دلائی اور یہ کہا:

"تمہارا ارادہ بھی خدا کے ارادے کے تابع ہے اور تمہاری گم راہی کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی طرف سے تم پر توفیق کا فیضان نہیں ہوا۔"

تلاوت قرآن کے روحانی انوار:

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے آج کی مجلس میں سب سے پہلے قرآن کریم کی تلاوت کے فضائل پر گفتگو فرمائی۔ کیوں کہ جملہ ہدایات کا اصل مبداء وماخذ کلام الٰہی ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ نے تلاوت قرآن کریم کی روحانی واردات وکیفیات پر پورا زور دیا۔ کیوں کہ یہ واردات واحوال شیخ علیہ الرحمہ کے ذاتی تجربات تھے۔ فرمایا:

"تلاوت اور سماع کے دوران جو سعادت حاصل ہوتی ہے اس کی تین قسمیں ہیں (۱) انوار (۲) احوال (۳) آثار۔ اور یہ تینوں تین مختلف عالموں سے نازل ہوتی ہیں اور یہ تین عالم ہیں، ملک، ملکوت، اور جبروت اوران کے نزول کا مہبط ارواح، قلوب واعضا ہیں۔"

آگے شیخؒ کے افادات کا جو حاصل ہے اسے یہ ناچیز ایک شعر میں پیش کرتا ہے۔

جمال شاہد قرآن نقاب انگاہ بکشاید
کہ دارالملک ایماں رابا ید خالی از غوغا

"یعنی قرآن کریم کا حسن وجمال اس وقت بے نقاب ہوتا ہے جب ایمان ویقین کا مسکن (قلب) ہرقسم کے خیالات سے خالی ہوجائے اور تلاوت کرنے والا قلب ودماغ کی پوری یک سوئی کے ساتھ خداتعالیٰ کے ساتھ ہم کلامی کا کیف وشرف حاصل کرے۔"

حضرت جگر مرادآبادی نے ایک الہامی شعر میں اس حقیقت کی یہ تشریح کی ہے۔

گوش مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ
سن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

قرآن کریم کا سلوک پائیدار:

شیخ علیہ الرحمہ کے ایک عالم مرید مولانا فخرالدین زرادیؒ نے سوال کیا کہ قرآن کی تلاوت بہتر ہے یا ذکرالٰہی بہتر ہے؟ فرمایا ذکرالٰہی کرنے والے کو بہت جلد مقام

قرب وصال حاصل ہوجاتا ہے، لیکن اس کے زوال کا خطرہ لگا رہتا ہے، البتہ قرآن کریم کی تلاوت سے وصول الی اللہ کا درجہ دیر میں حاصل ہوتا ہے مگر اس کے زوال کا چنداں خطرہ نہیں رہتا۔ (سیرالاولیا:۶۸۴)

سماع پر کلام:

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی علیہ الرحمہ کے سماع نہ سننے کا معمول بیان کیا اور ایک صفی ربانی کو اپنے مشائخ کے ساتھ ادب وتواضع کا جو رویہ اپنانا چاہیے وہی اپنایا اور اس بارے میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے شیخ نجم الدین کبریٰ علیہ الرحمہ کے حوالے سے فرمایا:

"ہرنعمتے کہ در بشر ممکن است شیخ شہاب الدین علیہ الرحمہ رادادند الا ذوق سماع۔"

"ہر وہ نعمت جو کسی بشر میں ممکن ہے وہ شیخ شہاب الدینؒ میں موجود تھی، سوائے ذوق سماع کے۔"

پھر شیخ علیہ الرحمہ نے اس سماع کی کیفیت وحالت بیان کرتے ہوئے جس کا انتظام شیخ سہروردیؒ نے اپنے مہمان شیخ اوحدالدین کرمانیؒ کے لیے کیا تھا، یہ فرمایا:

"ہر بار کہ سماع فرو داشتے مے کردند واہل سماع قرآن خواندند شیخ مے شنیدند۔"

"شیخ شہاب الدین علیہ الرحمہ سماع کی اس مجلس سے الگ بیٹھ کر ذکر الٰہی میں مستغرق ہوگئے اور شیخ کے استغراق کا یہ حال تھا کہ سماع کی آواز بھی شیخ کو سنائی نہیں دیتی تھی، مگر جب اہلِ سماع اپنا سماع موقوف کر کے تلاوت قرآن کرتے تھے تو شیخ تلاوت کی آواز سن لیتے تھے۔" (مجلس ۳۱)

مطلب یہ کہ شیخ سہروردیؒ سماع سے اس قدر غیر مانوس تھے کہ اس کی آواز بھی شیخ کے کانوں کو چھونے سے قاصر تھی۔ حالاں کہ اسی حالت میں جب تلاوت کی جاتی تھی تو شیخ کے کان اسے قبول کر لیتے تھے۔

حضرت شیخ علیہ الرحمہ کے سماع کی نوعیت:

اس مسئلے پر خاک سار نے ایک مستقل عنوان کے تحت شیخ علیہ الرحمہ کے اپنے مبارک الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ آپ کا سماع صرف عارفانہ شعری کلام کے سننے تک محدود تھا اور آپ کی محفل سماع چنگ ورباب جیسے آلات موسیقی سے خالی ہوتی تھی۔

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے ایک مجلس (جلد۵، مجلس۵) میں اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ اچھی آواز سے معرفت حق سے معمور موزوں کلام بڑے روحانی اثرات پیدا کرتا ہے، لیکن تلاوت قرآن کے اندر جو معجزانہ اثرات پوشیدہ ہیں اس کا مقابلہ انسانی کلام نہیں کرسکتا۔

چناں چہ ایک محفل سماع کے سلسلے میں یہ آتا ہے کہ آپ نے پہلے کلام الٰہی کی خود تلاوت فرمائی اور پھر امیر خسروؒ سے اچھا کلام سماعت فرمایا۔

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے بسم اللہ کے پڑھنے کا جو اختلافی مسئلہ آگے بیان کیا ہے اس میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کے جواب پر آپ نے علمی کمال کے ساتھ حسن ادب کی رعایت کا تذکرہ فرمایا ہے۔

قبولیت صدقات کی شرطیں:

شیخ علیہ الرحمہ نے صدقات قبول ہونے کی چار شرطیں بیان فرمائی ہیں۔ دو شرطیں صدقہ ادا کرنے سے پہلے کی ہیں اور دو شرطیں صدقہ ادا کرنے کے بعد کی ہیں۔

ادا کرنے سے پہلے کی دو شرطیں یہ ہیں۔

پہلی شرط۔ ''آنچہ خواہد داد از وجہ حلال باشد۔''

''یعنی جو مال راہ خدا میں دیا جائے وہ حلال کمائی میں سے ہو۔''

اس شرط کا ماخذ قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ.

(سورۂ بقرہ:۲۶۷)

''مسلمانو! اپنی پاک وحلال کمائی میں سے انفاق کیا کرو۔ مال حرام اور

مال مشتبہ نہ ہو۔''

دوسری شرط۔ ''دوم شرط آنکہ نیت کند کہ بمردے صالح دہد بکسے کہ در وجہ فساد خرچ نکند، یعنی باہل صلاح دہد۔''

''یعنی صدقہ ادا کرتے وقت ارادہ کرکے صالح آدمی کو صدقہ دے، اس آدمی کو جو اس رقم کو فساد اور برائی کے کاموں میں خرچ نہ کرے۔ مطلب یہ کہ اہل صلاح (بھلائی والوں) کو دے۔''

شیخؒ نے اس شرط میں اہلِ ایمان نہیں فرمایا، بلکہ اہلِ صلاح کہہ کر اس میں عموم پیدا کردیا۔ شیخ علیہ الرحمہ نے قرآن کریم کی اس اصولی ہدایت کو سامنے رکھا:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. (مائدہ:۲)

''مسلمانو! نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔''

یہ آیت کریمہ اپنے شان نزول کے لحاظ سے مسلم اور غیر مسلم دونوں طبقوں کو شامل ہے۔ صدقہ وخیرات مالی تعاون کی صورت ہے جو اس قرآنی ہدایت میں شامل ہے۔

یہ مسئلہ بھی واضح رہے کہ مال حلال کی شرط والی آیت مذکورہ میں انفاق (خرچ کرنا) کا لفظ عام ہے، بہ طور فرض خرچ کرنا جسے زکوٰۃ کہتے ہیں یا بہ طور نفل خرچ کرنا جسے صدقہ کہا جاتا ہے۔ دونوں صورتیں اس میں شامل ہیں۔

بعض مفسرین (صاحب جلالین) نے انفاق سے مراد زکوٰۃ لی ہے، لیکن حضرت ابن عباسؓ نے انفاق سے صدقہ مراد لیا ہے۔ (ابن کثیر، جلد۱، صفحہ۳۲۰)

شیخ علیہ الرحمہ نے اسی اثر (قول ابن عباس) کی روشنی میں مستحق لوگوں کے لیے اہلِ ایمان کے الفاظ نہیں فرمائے، کیوں کہ زکوٰۃ کے مستحقین کے لیے مسلمان ہونا شرط ہے۔ جیسا کہ سورہ توبہ آیت (۶۰) میں مستحقین زکوٰۃ کو آٹھ قسموں میں محدود کردیا ہے اور ان آٹھوں کے لیے اسلام کی شرط ہے۔

نفلی خیر خیرات میں مسلمان ہونا شرط نہیں ہے۔ البتہ اہلِ صلاح ہونا شرط ہے خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم ہوں۔

صدقہ ادا کرتے وقت کی شرطیں:

شیخؒ نے دو شرطیں صدقہ ادا کرتے وقت کی بیان فرمائی ہیں۔

پہلی شرط۔ ''بہ تواضع و بشاشت دہد و باشرح دل دہد۔''

''عاجزی اور خاک ساری اور خوشی اور پورے اطمینان قلب کے ساتھ دیا جائے۔''

شیخؒ نے یہ شرط قرآن کریم کی حسب ذیل آیت کی روشنی میں بیان فرمائی:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ (دہر:۸)

''اور وہ لوگ محبت سے مسکینوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔''

مفسرین نے اس آیت کے لفظ علیٰ حبہ کے دو مطلب بیان کیے ہیں۔

۱۔ مال کی محبت رکھنے کے باوجود غریبوں کی مدد کرتے ہیں۔

۲۔ خدا تعالیٰ کی محبت میں مدد کرتے ہیں۔

شیخ علیہ الرحمہ نے دوسرا مطلب اختیار کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اپنے مالک و مولیٰ کی محبت میں اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور اس کے بندوں کی مدد کرتے ہیں وہ بددلی اور تنگ دلی کے ساتھ یہ فعل نہیں کرتے۔ بلکہ اس تصور کے ساتھ کرتے ہیں:

اَلْخُلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقُ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ. (مشکوٰۃ:۴۲۵)

''تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، سو اللہ کے نزدیک پسندیدہ لوگ وہ ہیں جو اس کے کنبے کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں۔''

اور وہ خوشی انھیں اس بات سے بھی حاصل ہوتی ہے کہ انھیں اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کا موقعہ ملا۔

دوسری شرط۔ ''درخفیہ دہد۔''

''صدقہ وخیرات چھپا کر دیا جائے۔''

اس سلسلے میں قرآن کریم کی ہدایت یہ ہے۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ. (سورۂ بقرہ:۲۷۱)

''اگر تم اپنے صدقات علانیہ طور سے ادا کرو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر چھپا کر ضرورت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔''

اس سلسلے میں حضرت امام شعبیؒ کی رائے یہ ہے کہ آیت مذکورہ عام ہے صدقہ نفلی ہو یا واجب و فرض ہو۔ چھپا کر ادا کرنا افضل ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی رائے یہ ہے کہ نفلی صدقات میں اخفا افضل ہے یہاں تک کہ یہ صدقہ ستر گنا ثواب رکھتا ہے۔

اور صدقہ فرض (زکوٰۃ) علانیہ ادا کرنی افضل ہے۔ یہاں تک کہ اظہار کے عمل سے اس کا ثواب ۲۵ گنا بڑھ جاتا ہے۔ (ابن کثیر، جلد اول، صفحہ ۳۲۳)

جمہور علما نے حضرت ابن عباسؓ کی رائے اختیار کی ہے اور اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ فرض زکوٰۃ علی الاعلان ادا کرنے سے ایک تو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ زکوٰۃ مستحق کو دی گئی یا غیر مستحق کو ادا کی گئی۔

دوسرے یہ کہ دیکھنے والوں کو اس عمل کی ترغیب ہوگی۔ اس مصلحت کے تحت تمام عبادات کا یہی حکم قرار دیا گیا ہے۔

رہا نفلی صدقہ۔ تو اس میں خفا افضل ہے، کیوں کہ لینے والے غربا کی عزت رہ جاتی ہے۔ ان کا راز فاش نہیں ہوتا۔ اور خاص طور پر وہ خوددار اور شریف ضرورت مند جو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔ ان کی عزت نفس محفوظ رہتی ہے۔ قرآن نے کہا:

تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا. (سورۂ بقرہ:۲۷۳)

"اے مخاطب! تو ان خود دار انسانوں کی احتیاج کو ان کے چہروں سے
پہچانے گا وہ لوگوں سے گڑگڑا کر سوال نہیں کرتے۔"

مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے آیت مذکورہ کی تفسیر کرتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے چھپا کر صدقہ ادا کرنے کی فضیلت میں چھے حدیثیں نقل کی ہیں۔ اس کے بعد حافظ ابن کثیرؒ نے امام شعبیؒ کی روایت سے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کا واقعہ نقل کیا، جس میں چھپا کر دینے کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔

یہ واقعہ حضرت شیخ نے بھی بیان کیا جو آگے آ رہا ہے۔

اس انداز بیان سے محدث ابن کثیرؒ نے جو عظیم مفسر و مورخ بھی ہیں، ان کا رجحان ظاہر ہوتا ہے کہ وہ امام شعبیؒ کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ جہاں تک حضرت شیخ علیہ الرحمہ کی رائے کا تعلق ہے وہ آپ کے مشن کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ اس رائے میں غریبوں اور مسکینوں کی عزت نفس کا احترام ہے اور ساتھ ہی خفا کی فضیلت میں ارشادات نبوی کی کثرت کا لحاظ بھی ہے۔

صدقہ ادا کرنے کے بعد کی شرط:

یہ بیان کی کہ

"آنچہ دہد پیش کس آں را بر زبان نیارد و ذکر آں نکند۔"

"جو کچھ راہ خدا میں دیا جائے اس کا کسی کے سامنے ذکر نہ کیا جائے اور
لوگوں میں اس کا چرچا نہ کرے۔"

یہ شرط قرآن کریم کی حسب ذیل ہدایت سے ماخوذ ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تُبْطِلُوا۟ صَدَقَـٰتِكُم بِٱلْمَنِّ وَٱلْأَذَىٰ كَٱلَّذِى يُنفِقُ مَالَهُۥ رِئَآءَ ٱلنَّاسِ

(سورۂ بقرہ: ۲۶۴)

"اے ایمان والو! اپنے صدقے احسان جتا کر اور تکلیف پہنچا کر برباد نہ
کرو، اس شخص کی طرح جو لوگوں کو دکھانے کے لیے اپنا مال خرچ کرتا ہے۔"

احسان جتانے کے بعد ستانے کی ممانعت کی۔ ستانے کی مختلف صورتیں ہیں۔ لوگوں میں چرچا کر کے اس کی توہین کرے، اس سے کسی قسم کی خدمت لے، اس کی اولاد کو طعنہ دے، اس کے ساتھ برتاؤ ایسا کرے جیسے یہ اس کا ممنون احسان ہے۔

دو قوموں میں ظاہری تضاد:

شیخ علیہ الرحمہ نے تیرھویں مجلس میں متعدی اطاعت کے بارے میں فرمایا ہے:

"اما در طاعت متعدیہ ہر گونہ کہ باشد و بکند ثواب باشد۔"

"متعدی عبادت (جیسے خیر خیرات وغیرہ) جس طرح بھی ادا کی جائے
اس کا ثواب ملتا ہے۔"

اور اس مجلس میں فرمایا کہ صدقہ کے قبول ہونے کی پانچ شرطیں ہیں۔

پھر دونوں قوموں کے درمیان تطبیق کی صورت کیا ہے۔ یہ دو مختلف باتیں کس طرح اپنی اپنی جگہ صحیح ہو سکتی ہیں؟

اس ناچیز گناہ گار کے خیال ناقص میں طاعت متعدیہ جو ان شرائط سے خالی ہو وہ اس اطاعت (صدقہ وخیرات) کے ثواب سے محروم رہے گی لیکن جس محتاج وضرورت مند کی ضرورت پوری ہوگی اور اس کے دل سے فطری طور پر جو دعا نکلے گی اس دعا سے اس شخص کو فائدہ پہنچے گا اور یہی اس عبادت کے ثواب کی صورت ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے سورہ رعد: ۱۴

وَمَا دُعَآءُ ٱلْكَـٰفِرِينَ إِلَّا فِى ضَلَـٰلٍ

"اور کافروں کی دعا بے اثر ہے۔"

پر وعظ فرماتے ہوئے یہ کہا کہ اس آیت کا تعلق عالم آخرت سے ہے، رہا دنیا کا معاملہ تو دنیا میں اگر سب سے بڑے منکر ابلیس کی دعا قبول ہو سکتی ہے اور اسے قیامت تک زندہ رہنے کی مہلت خدا کی طرف سے دی جا سکتی ہے تو پھر دوسرے منکرین کی دعا کیوں قبول نہیں ہو سکتی؟

حدیثِ نبوی میں ہے:

دَعْوَةُ الْمَظْلُوْمِ وَاِنْ كَانَ كَافِرًا لَيْسَ دُوْنَهَا حِجَابٌ.

”مظلوم کی پکار اگر چہ وہ منکر ہو بے روک ٹوک خدا تک پہنچتی ہے۔“

(مجالس حکیم الامت، ص ۴۳)

مولانا تھانویؒ نے اوپر والی آیت کے لفظی عموم کے لحاظ سے یہ مطلب بیان کیا ہے ورنہ سیاق وسباق کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ منکر لوگ جو اپنے بتوں کو پکارتے ہیں وہ بے اثر ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے اخفا صدقے کی فضیلت کے عام ہونے (واجب صدقہ ہو یا نفل) میں امام شعبیؒ کی رائے کو ترجیح دی ہے۔ امام شعبیؒ جلیل القدر تابعی تھے۔ کوفہ میں قضا کے منصب پر فائز تھے۔ مشہور محققِ حدیث ابن عیینہؒ کا قول ہے کہ صحابہ کرامؓ کی جماعت کے بعد تین آدمی یکتائے روزگار تھے (۱) ابن عباسؓ (۲) امام شعبیؒ (۳) سفیان ثوریؒ، تفسیر قرآن کے شعبے میں شعبیؒ کی تحقیقی صلاحیت مسلم تھی۔ اسی لیے شیخؒ نے حضرت ابن عباسؓ صحابی کی تفسیر پر امام شعبیؒ کی تفسیر کو راجح سمجھا۔

امام شعبیؒ نے اپنی تحقیق کی تائید میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کا واقعہ نقل کیا، یہ واقعہ غزوۂ تبوک کے موقع پر پیش آیا۔

امام شعبیؒ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی کرامت (بہ قول شیخ علیہ الرحمہ) کے اس واقعے میں ان فقروں سے استدلال کیا۔ راوی بیان کرتے ہیں۔

وَاَمَّا اَبُوْبَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فَجَآءَ بِمَالِهٖ كُلِّهٖ يَكَادُ اَنْ يُّخْفِيَهٗ مِنْ نَفْسِهٖ حَتّٰى دَفَعَهٗ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

صدیق اکبرؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے غزوے کی تیاری کے لیے مالی انفاق کی اپیل سن کر اپنا تمام مال لے آئے ان کا حال یہ تھا کہ وہ اس صدقے کے مال کو اگر بس چلے تو اپنے آپ سے بھی چھپائیں۔ یہاں تک کہ نہایت خفا کے ساتھ لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد اول، صفحہ ۳۲۳)

امام شعبیؒ (سورۂ بقرہ: ۲۳۲) کا شان نزول اسی واقعے کو قرار دیتے ہیں شیخ علیہ الرحمہ نے اس واقعے کو تمام تاریخی جزئیات کے ساتھ نقل کیا۔ جسے اصل کتاب میں دیکھنا چاہیے۔

ہبہ وصدقہ کی واپسی:

شیخ علیہ الرحمہ نے صدقے کے بارے میں ایک خاص مسئلہ حضرت عمر فاروقؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ صدقہ (جو ہبہ ہوتا ہے) دینے کے بعد واپس لینا درست نہیں،

فقہائے کرام کے درمیان اس میں اختلاف رائے ہے۔ امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ ہبہ کی واپسی کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ دلیل ان حضرات کی یہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْعَائِدُ فِيْ هِبَتِهٖ كَالْكَلْبِ يَعُوْدُ فِيْ قَيْئِهٖ لَيْسَ لَنَا مَثَلُ السُّوْءِ. (مشکوٰۃ، صفحہ ۲۶۰، بہ حوالہ بخاری)

”اپنے ہبہ کو لوٹانے والا اس کتے کی مانند ہے جو قے کر کے خود چاٹ لیتا ہے، ایسی برائی ہم مسلمانوں کے شایان شان نہیں۔“

البتہ ان حضرات کے نزدیک باپ اپنی اولاد کو دیے گئے ہبہ کو واپس لے سکتا ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں یہ استثنا کیا ہے۔

(عن ابن عمر رضی اللہ عنہ، مشکوٰۃ، صفحہ ۲۶۱)

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہبہ واپس لینا ایک قول راجح کی بناء پر مکروہ تحریمی ہے۔ حرام نہیں ہے اور ایک مرجوح قول کی بناء پر مکروہ تنزیہی ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ (عدم حرمت) پر یہ روایت پیش کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

اَلْوَاهِبُ اَحَقُّ بِهِبَتِهٖ مَالَمْ يُثَبْ مِنْهَا.

(شرح مشکوٰۃ ملا علی قاری)

"ہبہ کرنے والا اپنے ہبہ کو واپس لینے کا حق دار ہے جب تک اس ہبہ کا بدلہ ادا نہیں کیا جاتا۔"

علمائے حنفیہ کے نزدیک واپسی کے ناجائز ہونے کے لیے سات شرطیں ہیں، جن میں سے ایک شرط یہ ہے کہ شئی موہوب (ہبہ والی چیز) کے اندر کوئی زیادتی ہوجائے، جیسے خالی زمین ہبہ کی گئی اور پھر لینے والے نے اس میں درخت لگادیے تو اب یہ زمین واپس نہیں لی جاسکتی، اور اگر ہبہ والی چیز میں باہر سے کوئی زیادتی ہوجائے جیسے کوئی جانور ہبہ کیا گیا اور ہبہ کے بعد اس کی قیمت بڑھ گئی تو یہ زیادتی ہبہ کی واپسی میں مانع نہیں۔

حضرت عمرؓ کے واقعہ میں ہے کہ آپ نے ایک گھوڑا کسی کو ہبہ کیا اور پھر وہ گھوڑا اس کی ہبہ والے دن کی قیمت پر خریدنے کا ارادہ کیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں منع کردیا۔

اس واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت کو صرف احتیاط کے خلاف ہونے پر محمول کیا جائے گا۔ کیوں کہ حضرت عمرؓ اپنے ہبہ کو واپس نہیں لے رہے تھے، بلکہ اس دن کی قیمت ادا کرکے واپس لے رہے تھے، جس دن آپ نے یہ گھوڑا ہبہ کیا تھا۔

علمائے احناف کے مسلک کے مطابق حضرت عمرؓ کو اپنے ہبہ کردہ گھوڑے کو بلا قیمت بھی واپس لینے کا حق تھا۔ کیوں کہ گھوڑے کی قیمت اگر ہبہ کے بعد بڑھ بھی گئی تھی تو ائمۂ احناف کے نزدیک اس زیادتی کا اعتبار نہیں، کیوں کہ وہ زیادتی شئی موہوبہ کے اندر نہیں ہوئی تھی۔ البتہ تینوں اماموں کے نزدیک ہبہ کی واپسی جائز نہیں۔ حضرت عمرؓ قیمت ادا کررہے تھے لیکن اس سے مالک ہبہ کو نقصان پہنچ رہا تھا۔

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے اس مسئلے میں بھی اپنے صوفیانہ مشن (غربا کے ساتھ ہمدردی) کو سامنے رکھا اور امام شافعیؒ کے مسلک کو ترجیح دی۔

علمائے احناف نے حضرت عمرؓ کے واقعہ کی کیا تاویل کی ہے؟ وہ اس فقیر کے علم میں نہیں۔

یہی تاویل ہوسکتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ہبہ کی واپسی کو

احتیاط کے خلاف سمجھ کر ممانعت فرمادی۔ واللہ اعلم بالصواب

شیخ علیہ الرحمہ نے شیخین کے واقعے کو اخفائے صدقہ کی فضیلت کے سلسلے میں بیان فرمایا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرات شیخینؓ اور تمام صحابہؓ کے درمیان جو باہمی الفت ومودت اور اتفاق تھا اسے شیخ علیہ الرحمہ نے فوائد الفواد جلد چہارم مجلس اول میں بیان فرمایا اور اس سے جملہ صحابۂ کرامؓ کے بارے میں مشائخ چشت کا جو عقیدہ ہے اس کا اظہار فرمایا، جو جمہور اہلِ سنت کا عقیدہ ہے۔

اصحاب صحو افضل ہیں:

تصوف میں صحو اور سکر کی دو حالتیں ہیں۔ سُکر (مستی اور بے خودی کی) وہ کیفیت جس میں صوفی اسرار کائنات اور زندگی کے مخفی بھیدوں کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ اور صحو کی حالت ہوش وحواس کی سلامتی کی حالت ہے۔

ایران کے مشہور صوفی خواجہ ابوسعید ابی الخیرؒ وحدت الوجودی صوفی تھے اور آپ تصور وحدت کے غلبے میں مخفی اسرار پر گفتگو کیا کرتے تھے۔

خواجہ حسنؒ نے پوچھا:

"چگونہ است کہ خواجہ ابوسعید ابوالخیرؒ بارہا ازغیب سخنان برسر زبان آمدہ است؟ فرمود کہ آن زباں کہ اولیا درغلبات شوق مے باشند از سر سکر چیزے مے گویند اما آنکہ کاملست ہیچ نوع از اسرار بیروں ندہند۔ بعد ازاں دوبار ایں یک مصراع بر لفظ مبارک آمد۔"

مرداں ہزار دریا خوردند و تشنہ رفتند!

"خواجہ ابوسعیدؒ مخفی راز زبان پر بارہا جاری کرتے ہیں، یہ کیا ہے؟ فرمایا کہ صوفیا پر جب شوق کے جذبات کا غلبہ ہوتا ہے تو اس وقت وہ بے خودی میں اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن جو مشائخ کامل ہوتے ہیں ان کی زبان پر اسرار ورموز کی باتیں جاری نہیں ہوتیں۔ پھر یہ مصرع دوبار پڑھا:"

"کامل لوگ ہزاروں دریا پی جاتے ہیں اور پھر بھی پیاسے رہتے ہیں۔"

اصحاب سُکر میں منصور حلاجؒ کی شخصیت مشہور ہے۔ صوفیا کی اصطلاح میں مستی کے عالم کی باتوں کو شطحیات کہا جاتا ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ نے پھر فرمایا:

"اصحاب صحو کا بڑا حوصلہ ہوتا ہے جو وہ راز ہائے زندگی کو برداشت کرتے ہیں۔"

شیخ حسنؒ نے پوچھا:

"مرتبہ اصحاب سکر بالاتر یا مرتبہ اصحاب صحو؟ فرمود کہ مرتبہ اصحاب صحو، واللہ اعلم۔"

"اصحاب سکر کا درجہ بڑا ہے یا اصحاب صحو کا؟ فرمایا، اصحاب صحو کا درجہ بڑا ہے۔ واللہ اعلم۔" (جلد اول، مجلس ۱۱، صفحہ ۲۲۳)

اقبال کہتا ہے کہ صوفی کامل جب مقام نیاز میں پہنچتا ہے تب بھی اس کے ہاتھ سے ضبط واعتدال کا دامن نہیں چھوٹتا۔ اس کی عقل جوش جنوں کی حالت میں بھی ہوش حواس کو ٹھکانے سے رکھتی ہے، اس کے نزدیک عشق ومحبت کی آبرو اور محبوب کا احترام سی میں ہے۔ محبوب کے سامنے گریبان چاک ہوکر جانا گستاخی ہے۔

بہ ضبط جوشِ جنوں کوش در مقام نیاز
بہوش باش مرو باقبائے چاک آنجا

دوسری جگہ کہتا ہے کہ کمال معرفت یہی ہے، اگرچہ ہر مقام ہر کسی کے بس کا نہیں ہے:

باچنیں زور جنوں پاس گریباں داشتم
درجنوں از خود نرفتن کار ہر دیوانہ نیست

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں، صاحب معرفت صوفی وہ ہے جو اسرار حق کا عرفان رکھتے ہوئے اپنی زبان اس طرح بند رکھتا ہے، جیسے اس کے ہونٹ سلے ہوئے ہوں:

عارفاں کو جام حق نوشیدہ اند — راز ہادانستہ و پوشیدہ اند
ہر کہ را اسرار حق آموختند — مہر کردند و دہانش دوختند

جلد اول:
۳۴ویں مجلس:

مال ودولت کی حیثیت، انتظار صدقہ کی مذمت، وصال نبوی، وصال کے وقت آخری کلمات، رفاقتِ کمالِ حقیقی

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے مال ودولت اور خوش حالی کے بارے میں اپنے اور اپنے شیخ کامل علیہ الرحمہ کے ذوق (فقروغربت) کے مطابق ایک حدیثِ نبوی پر روشنی ڈالی اور اس کی تائید میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول مبارک نقل فرمایا۔ شیخ علیہ الرحمہ نے یہ ظاہر کیا کہ مال ودولت ہر پہلو سے وبال ہے، حلال ہوتو حساب دو۔ حرام اور مشتبہ ہوتو عذاب وعتاب کے لیے تیار رہو۔ العیاذ باللہ!

فقروغربت کی فضیلت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری حیات مبارکہ فقروغربت میں گزری۔ ابتدائی زندگی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے ساتھ تجارت میں شرکت کی وجہ سے خوش حال رہی۔ جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا:

وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ. (الضحیٰ:۸)

"آپ کو اے نبی! خدا تعالیٰ نے نادار پایا، پھر غنی کردیا۔"

اس خوش حالی کے دور میں غریبوں کی مدد، یتیموں اور بیواؤں کی خبر گیری پر خرچ کرنا آپ کا محبوب مشغلہ رہا۔ پھر تبلیغ ودعوت کی زندگی میں انہماک ومشغولیت کے سبب غربت کا دور شروع ہوگیا۔ مدینہ منورہ میں سیاسی فتوحات کے بعد خوش حالی آئی

شروع ہوئی، مگر آپ نے فقر و قناعت کی راہ کو نہیں چھوڑا جو آخری وقت تک قایم رہی، یہاں تک کہ بیماری کے ایام میں درہم بھی گھر میں رکھنا اور انھیں چھوڑ کر خدا سے ملنا پسند نہ فرمایا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حکم دیا کہ ان درہموں کو خیرات کر دو۔

صحابہ کرامؓ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زندگی بھی شروع ہی سے فقر و غربت میں رہی، خلافت کے دور میں بھی آپ پیوند لگا عبا پہن کر کوفہ کی مسجد کے ممبر پر خطبہ دیتے تھے۔ بیت المال میں اس قدر احتیاط تھی کہ اپنے بھائی عقیل ابن ابی طالبؓ کو بیت المال سے قرض حسن دینا بھی پسند نہ کیا۔ یہی حال حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت کے مطابق تمام آل رسول کا تھا۔ فرماتی ہیں:

مَاشَبِعَ آلِ مُحَمَّدٍ مِنْ خُبْزِ الشَّعِيرِ يَوْمَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ حَتّٰى قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

(مشکوٰۃ:۴۴۶)

"آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی دو دن برابر گیہوں کی روٹی سے پیٹ نہیں بھرا، یہاں تک کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم وصال فرما گئے۔"

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات عالیہ بھی فقرا کی فضیلت پر شہادت دیتے ہیں۔ مشہور قول گرامی ہے:

اِنَّهُمْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ قَبْلَ اَغْنِيَآءَ هُمْ بِخُمْسِ مِائَةِ عَامٍ نِصْفَ يَوْمٍ. (مشکوٰۃ:۴۴۶، بہ حوالہ بخاری)

"میری امت کے فقرا دولت مندوں سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے اور یہ پانچ سو سال آخرت کے حساب سے آدھا دن ہوگا۔"

حضرات صوفیائے ربانی کا ایک بڑا طبقہ اسی راہ پر قایم رہا اور اسے فضیلت کی زندگی قرار دیتا رہا۔

اگرچہ زیب سرش افسر و کلا ہے نیست
گدائے کوے تو کمتر زپاد شاہی نیست

لیکن قرآن وحدیث میں مال و دولت کا دوسرا پہلو بھی ہے۔

قرآن کریم نے مال کو زندگی کے قیام کا ذریعہ قرار دیا۔

جَعَلَ اللّٰهُ لكم قِيَامًا. (نساء:۱۹۱)

"دولت کو خدا کا فضل کہا گیا۔"

وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ. (جمعہ:۱۰)

"جمعہ کی نماز سے فارغ ہو کر خدا تعالیٰ کا فضل تلاش کرو یعنی اپنے اپنے روزگار میں مشغول ہو جاؤ۔"

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا نہایت جامع ارشاد ہے:

لَابَاْسَ بِالْغِنٰى لِمَنِ اتَّقَى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ وَالصِّحَّةُ لِمَنِ اتَّقٰى اللّٰهُ خَيْرٌ مِّنَ الْغِنٰى وَطِيْبُ النَّفْسِ مِنَ النَّعِيْمِ. (مشکوٰۃ:۴۵۰، بہ حوالہ مسند احمد)

"پرہیزگار آدمی کے لیے دولت میں کوئی مضائقہ نہیں اور جسمانی صحت مندی پرہیزگار آدمی کے لیے مال داری سے بہتر ہے اور طبیعت کا ہشاش بشاش رہنا خدا تعالیٰ کی نعمت ہے۔"

حضرت سفیان ثوریؒ (ولادت ۹۹ھ) جامع کمالات تھے (**وَهُوَ اَحَدُ الْاَئِمَّةِ الْمُجْتَهِدِيْنَ وَاحِدُ اَقْطَابِ الْاِسْلَامِ وَ اَرْكَانَ الدِّيْنِ**) آپ کا ارشاد گرامی ہے:

ابتدائی زمانے میں دولت کو ناپسند کیا جاتا ہے لیکن آج کے دور میں (جو دوسری صدی ہجری کا دور ہے) دولت مؤمن کے لیے ڈھال ہے (**تُرْسُ الْمُؤْمِنِ**) اور فرمایا:

لَوْلَا هٰذِهِ الدَّنَانِيْرُ لِتَمَنْدَلُ بِنَا الْمُلُوْكُ.

(مشکوٰۃ:۴۵۱ بہ حوالہ شرح السنۃ)

"اگر درہم و دینار نہ ہوتے تو حکمراں ہمیں اپنے ہاتھ کا تولیہ (ہاتھ پونچھنے کا کپڑا) بنا لیتے یعنی جس طرح چاہتے اس طرح استعمال کرتے۔"

حاصل یہ نکلا کہ مال و دولت اچھے استعمال سے اچھی ہے اور برے استعمال سے بری ہے، فی نفسہ اپنی ذات میں نہ بری ہے نہ اچھی ہے۔

اکابر صوفیا میں بھی دونوں ذوق موجود تھے اور دونوں حالتوں کے بزرگ اپنے اپنے رنگ میں دین محمدی کی بقا و استحکام کے لیے سرگرم عمل رہے۔

ایک بزرگ المرشدی تھے جن کی ولادت (۷۷۰ھ) میں ہوئی، ان کے بارے میں حافظ ابن حجر مکیؒ نے الدرا لکاملہ میں لکھا ہے کہ شیخ علیہ الرحمہ ایک قافلے کے ساتھ حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے، تمام راستے قافلے کا خرچ شیخ کے ذمہ رہا۔

نیفق کل لیلة علیهم تارة الضاو تارة اکثر انفق فی ثلاث لیال ماقیمة الف دینار وفی خمس لیال اخریٰ ماقیمة نحو خمسة وعشرین الفا. (۴۶۳)

”شیخ ان ساتھیوں پر ہر رات کو کبھی ایک ہزار درہم اور کبھی اس سے زیادہ خرچ کرتے، یہاں تک کہ تین راتوں میں ہزار اشرفیاں خرچ ہوئیں، پھر پانچ، پھر دوسری راتوں میں پچیس ہزار اشرفیوں تک خرچ ہوئے۔“

حضرت سلطان جی رحمتہ اللہ علیہ کے جانشین حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلویؒ کا بیان ہے کہ آپ فقرا، درویشوں اور عام ضرورت مندوں پر اس طرح بخشش کرتے تھے جیسے دریا بہہ رہا ہے۔ جلال الدین خلجی کے دور کے بزرگ شیخ مولا کے لنگر کا یہ حال تھا:

ہزار من میدہ، پانچ سو من گوشت، تین من شکر، روزانہ خرچ ہوتی تھی۔“

(تعلیم و تربیت مولانا گیلانی، جلد اول، صفحہ ۲۱۷)

ہمارے مشائخ میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ کے دستر خوان کی وسعت اور مہمان داری اپنے معاصر علما و مشائخ میں مشہور رہی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ بزرگ نہ کوئی تجارت کرتے تھے اور نہ ان کے پاس شاہی جاگیریں تھیں۔ بلکہ معتقدین نذرانے کے طور پر جو کچھ پیش کرتے تھے وہ یہ حضرات خدا کی مخلوق کو کھلا دیا کرتے تھے۔ دولت سے اتنی نفرت ہوتی تو اسے کسی صورت میں

بھی ہاتھ نہ لگاتے کسی سے سوال کرنا یا دل میں طمع رکھنا ان حضرات کے ہاں گناہ تھا، لیکن جب خدا تعالیٰ اپنے مخلص بندوں کے ذریعے ان کی خدمت میں مال و دولت پہنچاتا تو یہ اسے قبول کر لیتے اور جیسا آتا ویسا ہی اسے لٹا دیتے۔

حضرات صحابہ کرامؓ میں بڑے درجے کے اصحاب نبی، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت عبدالرحمان ابن عوفؓ، بڑی بڑی تجارتیں رکھتے تھے اور دولت مند تھے — لیکن ذاتی زندگی میں انتہائی سادگی اور فقر کی حالت نظر آتی تھی اور جب دینِ حق اپنی امداد کے لیے آواز دیتا تھا تو یہ حضرات اپنی ساری دولت لے کر محبوب خدا کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تھے۔

حضرات صوفیا کے حلقے میں یہ مسئلہ بھی زیر بحث رہا ہے کہ فقیر صابر افضل ہے یا غنی شاکر؟ زہد پسند حضرات فقیر صابر کو غنی شاکر سے افضل کہتے ہیں۔ ایک طبقہ شکر گزار دولت مند کو صبر کرنے والے فقیر سے افضل قرار دیتا ہے۔ کیوں کہ وہ دولت مند جو دولت کی شکر گزاری میں زکوٰۃ ادا کرتا ہے، خیرات دیتا ہے، حج کرتا ہے، اس کی نیکیاں ظاہر ہے کہ اس غریب سے زیادہ ہوتی ہیں جو مذکورہ عبادتوں سے محروم رہتا ہے۔

انتظار صدقہ کی مذمت:

شیخ علیہ الرحمہ نے سوال کرنے کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

”اما اگر ناخواستہ و نااندیشدہ بروے چیزے برسد آں جائز باشد۔“

”یعنی سوال نہ کرنا زبان سے اور دل میں خواہش نہ کرنا کسی چیز کی تو اس طرح جائز ہوگا، کیوں کہ دل کی خواہش اور طمع یہ بھی ایک مخفی سوال ہے۔“

شیخ علیہ الرحمہ کے ارشاد گرامی کا ماخذ یہ ہے:

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی چیز عطا فرماتے تو میں عرض کرتا کہ حضور! مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، آپ فرماتے یہ مجھ سے لے لو،

اور اسے اپنی ملکیت میں داخل کر کے ضرورت مند کو دے دینا اور صدقہ کر دینا۔

فَمَا جَآءَ کَ مِنْ هَذَا الْمَالِ وَاَنْتَ غَيْرُ مُشْرِفٍ
وَلَا سَائِلٍ فَخُذْهُ وَمَالَا فَلَا تُتْبِعْهُ نَفْسَکَ.

''اے عمر! اس طرح جو مال تمہارے پاس آئے اور تم نہ تو اس مال کے سائل ہو اور نہ اس کی خواہش اور اس کے انتظار میں ہو تو اسے لے لیا کرو، اور اس کے علاوہ اپنے نفس کو کسی کے پیچھے نہ لگانا۔ (مشکوٰۃ:۱۶۲)

فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ سوال کرنے کی مذمت اس شخص کے لیے ہے جو اضطرار (مجبوری) کی حالت میں نہ ہو۔ ورنہ جان بچانے کے لیے سوال کرنا واجب ہے۔

رسول پاک علیہ التحیۃ والتسلیم نے حضرت عمرؓ کو جو مال عطا فرمایا وہ زکوٰۃ کا نہیں ہوسکتا تھا، کیوں کہ حضرت عمرؓ خود صاحب نصاب تھے۔ اسی بات کا آپ نے اظہار فرمایا، یہ مال نفلی صدقے کا تھا جو آپ حضرت عمرؓ کو ہبہ کرنا چاہتے تھے تاکہ آپ اسے اپنے مال کے طور پر خیرات کردیں اور اس کا اجر حاصل کریں اور مسلمانوں پر آپ کا اثر بھی قایم ہو۔

وصال کے وقت آخر کلمات:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر آخری کلمات کے طور پر یہ آیت پاک تھی۔ **مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصَّالِحِيْنَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ**، اس آیت کے بعد یہ فقرہ جاری ہوا۔ **فِي الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى** جن لوگوں پر اللہ کا انعام ہوا وہ آخرت کی زندگی میں نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور نیک لوگوں کے ساتھ ہوں گے، اے ارحم الراحمین قبول فرما، وہ مرا سب سے بڑا رفیق ہے۔

اس عالم ناسوتی کی حیات کے آخری لمحوں میں حضرت صدیقہؓ آپ کے بالکل قریب تھیں اور اس حالت کی روایت انھی سے مروی ہے۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حیات ناسوتی کے آخری لمحوں میں اس آیت

پاک کی تلاوت کے لیے یہ اشارہ فرمایا کہ حسن انجام اور عظمت اخروی کا تعلق اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے وابستہ ہے، اس آیت کی ابتدا یہ ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ
اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ
وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِيْقًا. (نسا:۶۹)

''جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی تابع داری کرتا ہے اسے آخرت کی زندگی میں ان ہستیوں کی رفاقت حاصل ہوگی جن پر خدا کا انعام واکرام ہوا، یعنی انبیاء وغیرہ اور ان کلمات میں یہ ہدایت پوشیدہ ہے کہ یہ دنیا سب کے لیے دار فنا ہے، بقا و دوام صرف ذات حق کے لیے ہے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ O وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّکَ ذُو الْجَلٰلِ
وَالْاِکْرَامِ O (رحمٰن:۲۷)

''روئے زمین کی ہر مخلوق فنا ہونے والی ہے اور باقی صرف آپ پروردگار رہے گا۔ جو بزرگی اور عزت والا ہے۔''

حاصل کار گہ کون و مکاں ایں ہمہ نیست — بادہ پیش آر کہ اسباب جہاں ایں ہمہ نیست
بر لب بحر فنا منتظریم اے ساقی — ہمتے داں کہ زلب تابد ہاں ایں ہمہ نیست

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے احکام کی اطاعت اور خود اپنے ارشادات واقوال کی عملی پیروی میں نہ صرف ساری امت میں بلکہ تمام انساں میں سب سے اول اور اعلا مقام رکھتے تھے۔ قرآن کریم نے آپ کو اول المسلمین کے خطاب سے یاد فرمایا اور اس خطاب خاص کے اظہار و اعلان کا حکم دیا ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُکِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ
الْمُسْلِمِيْنَ O (الانعام:۶)

''اے نبی! آپ اعلان کردیں کہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور موت سب اللہ کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی

درجے کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور میں پہلا حکم بردار ہوں۔"

شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ نے اول المسلمین کا ترجمہ "پہلے حکم بردار" کیا ہے۔

اس اسلوب ترجمہ میں اولیت رتبی، رتبہ اور درجہ کی اولیت کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرے حضرات پہلا حکم بردار ترجمہ کرتے ہیں جس میں اولیت زمانی کی طرف اشارہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہر دو لحاظ سے اولیت اور تقدم رکھتے ہیں۔

كُنتُ نَبِيًّا وَّادَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَطِيْنٍ.

"میں اس وقت مقام نبوت پر فائز تھا جب حضرت آدم علیہ السلام پانی اور مٹی کے بیچ میں تھے۔"

اور آپ نے اپنی امت میں بھی سب سے پہلے خدا کی توحید اور اپنی نبوت کو تسلیم کیا یہ تقدم زمانی ہے۔

اور آپ کے ایمان و یقین اور اعمال صالحہ کا درجہ تمام اہلِ ایمان، اولین و آخرین میں سب سے بلند تر ہے۔ یہ تقدم رتبی ہے۔

حیات النبی اور نبی الانبیاء:

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ انعام کی جس آیت پاک کی تلاوت فرمائی اس میں اطاعت گذاروں کے لیے بڑی بشارت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اطاعت گذاری کی صفت میں تمام انسانیت (بشمول انبیا علیہم السلام) میں مقدم بھی ہیں اور مکمل بھی ہیں۔

تقدم کی اس صفت کے لحاظ سے تمام انبیائے کرام کا ایمانی اور علمی و روحانی وجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمانی وجود کا عکس قرار پاتا ہے اور یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسی آفتاب اور نور اور سراج منیر سے تمام اہلِ ایمان اور اصحابِ عرفان کو فیض پہنچا ہے۔

اسی حقیقت کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نبی الانبیاء

ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ (بانی دار العلوم دیوبند) اپنی مشہور کلامی کتاب آب حیات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولیت (**اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ.** (احزاب:٦)) کی تفسیر کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حیات النبی کی صفت سے موصوف قرار دیتے ہیں۔ اور اولاد آدم کے ہر صاحب ایمان کے ایمان و یقین کو آفتاب محمدی کے نور کی کرنیں قرار دیتے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ فِي الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر وقت میں جو آیت پاک تلاوت فرمائی اس میں اطاعت گذاروں کے لیے بشارت ہے، حضرات انبیاء، صدیقین، شہداء، اور صالحین کی رفاقت کی۔

وَحَسُنَ اُولٰئِكَ رَفِيْقًا.

"اور خوب ہے ان کی رفاقت۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اطاعت گذاروں کے امام تھے اور تمام انبیاء و صالحین کے سردار بھی تھے تو آپ کو کس کی رفاقت کی بشارت دی جاتی؟

اس کا اظہار آپ نے آخری فقرہ میں فرمایا کہ میرا رفیق وہ رفیق اعلا ہے جو سارے عالم کا شہنشاہ ہے۔

تجلی نور ذات تو ہے — ظہور شان صفات تو ہے
کمال راز وجود تو ہے — جمال سر حیات تو ہے
قسم خدا کی، خدا نہیں ہے — مگر خدا سے جدا نہیں ہے
نہ عین حق ہے نہ غیر حق ہے — خلاصۂ کائنات تو ہے

وزیر لکھنوی

اسی رفاقت حسن حقیقی اور معیت کمال مطلق کا نام "مقام محمود" ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ کیا تھا اور اسے پورا کیا۔

ساتویں مجلس:

کاشت کاری سے متعلق ایک حدیث

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے حضرت بابا فرید رحمہ اللہ کے زہد کامل پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتایا کہ حضرتؒ کی خدمت میں غیاث الدین بلبن نے کچھ اراضی نذر کی، مگر آپ نے اسے واپس کر دیا۔ اس سلسلے میں زراعت کے متعلق رسول پاک علیہ السلام کی ایک حدیث بیان کی۔ یہ حدیث بخاری میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے:

عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ وَرَاٰی سِكَّةً وَشَيْئًا مِنْ اٰلَةِ الْحَرْثِ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَدْخُلُ هٰذَا بَيْتَ قَوْمٍ اِلَّا دَخَلَهُ الذُّلِّ.

(کتاب الزراعت)

”حضرت ابو امامہؓ سے منقول ہے انھوں نے کسی جگہ کاشت کاری کا ہل اور کچھ سامان دیکھا، اس وقت کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ یہ سامان جس گھر میں داخل ہوتا ہے اس میں ذلت داخل ہوتی ہے۔“

محدثین کرام نے اس حدیثِ نبوی کا یہ مطلب لکھا ہے کہ جب کسی قوم میں زراعت کے ساتھ دل چسپی اور انہماک پیدا ہو جاتا ہے اور وہ جہاد فی سبیل اللہ کا راستہ چھوڑ دیتی ہے تو وہ ذلت کا شکار ہو جاتی ہے۔

اس ارشاد گرامی میں اس خطرے سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔ زراعت اور کھیتی باڑی کی مذمت کرنا اصل مقصود نہیں ہے۔

فوائد الفواد کے مترجم صاحب نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے جو نوٹ

تحریر فرمایا ہے وہ ایک قیاسی بات ہے جو مترجم صاحب نے موجودہ زمین دارانہ نظام میں کاشت کاروں کی حالت کو سامنے رکھ کر لکھی ہے۔(۵۲۷)

عہد رسالت میں زراعت کرنے والے کسان و باغ بان معاشرے میں ذلیل نہیں سمجھے جاتے تھے اور نہ ان پر کوئی زمین دار ظلم و زیادتی کرتا تھا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں کاشت کاری کا مشغلہ انصارِ مدینہ اور اہلِ یثرب سے متعلق تھا اہلِ مکہ اور مہاجرین تجارت پیشہ تھے، کیوں کہ مکۂ معظمہ کی زمین ریگستانی تھی۔ قرآن کریم نے اسے وادی غیر ذی زرع کہا ہے۔

مہاجرین جب مدینۂ منورہ آئے تو انھوں نے اپنے آبائی پیشے (تجارت) کے ساتھ مقامی مسلمانوں کے ہم راہ کھیتی کرنے سے بھی دل چسپی لینی شروع کر دی۔ صحیح بخاری میں ہے۔

مَا بِالْمَدِیْنَةِ اَهْلِ بَیْتٍ هِجْرَةُ الْاَیَزْرَعُوْنَ عَلَی الثُّلُثِ وَالرُّبُعِ۔

"مدینہ میں مہاجرین کا کوئی گھر ایسا نہیں تھا جو تہائی یا چوتھائی پیداوار پر کھیتی نہ کرتا ہو۔"

یہ حضرت امام باقر ابن امام زین العابدینؒ کا قول ہے، اس کے بعد حضرت امام نے تفصیل کے ساتھ فرمایا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، سعد ابن مالک، عبداللہ ابن مسعود، عمر ابن عبدالعزیز، قاسم عروہ، آل ابی بکر آل عمر، آل علی اور ابن سیرین سب نے زراعت و کاشت کاری کا کام کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے بٹائی کا یہ معاملہ کر رکھا تھا کہ اگر بیج میرا ہوگا تو میں آدھی پیداوار لوں گا اور اگر کاشت کرنے والا اپنا بیج استعمال کرے گا تو اس کے لیے اتنا ہوگا۔(مشکوۃ:۲۵۶)

زراعت کی فضیلت:

مناسب ہوگا کہ اس بحث میں زراعت و کاشت کاری کی فضیلت پر قرآن کریم اور احادیث و آثار میں جو ہدایات موجود ہیں ان پر کچھ روشنی ڈال دی جائے۔

قرآن کریم نے انسانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ O لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ O (واقعہ:۶۵)

"اے لوگو! بتاؤ کہ تم جو کھیتی کرتے ہو، تو تم اس کی پیداوار تیار کرتے ہو یا ہم کرتے ہیں، اگر ہم چاہیں تو اسے برباد کر دیں اور تم اپنے گھروں میں باتیں بناتے رہ جاؤ۔"

مطلب یہ ہے کہ کھیتی باڑی کرنے والے کسان کی محنت کو بارآور کرنے، اور آسمان سے پانی برسا کر، سورج کی شعاعوں سے گرمی پہنچا کر، زمین کی صلاحیت سے بیجوں کو طاقت پہنچا کر کسانوں کی جدوجہد کو نتیجہ خیز کرنے والا کون ہے؟ وہ خدا ہی کی ذات ہے جو کسان کی محنت کو منزل مقصود پر پہنچاتی ہے۔ تو جو انسان اس مالک حقیقی کی ہدایات کو نظر انداز کر کے اپنی پیداوار سے نفع اندوزی کرتا ہے اور بندگان الٰہی کو تکلیف دیتا ہے، تو وہ اس مالک کے احسانات کو فراموش کرتا ہے۔ مالک حقیقی نے کسان کی محنت اور اس کے بیجوں کو سینکڑوں گنا اضافے کے ساتھ بڑھا کر اس کے کھلیانوں کو اسی لیے بھرا ہے کہ وہ اپنی محنت پر مناسب نفع کے ساتھ اپنے بھائیوں کی خدمت پر بھی نظر رکھے۔ عوام کے فوائد کو بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دے۔ اسی آیت میں کھیتی باڑی کرنے کی ترغیب بھی ہے اور کسانوں کو اس بات کی ہدایت بھی ہے کہ وہ ناجائز نفع اندوزی نہ کریں۔ زراعت کی ترغیب دیتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اُطْلُبُوا الرِّزْقَ فِیْ خَبَایَا الْاَرْضِ۔ (منح الفوائد، جلد ۴)

"لوگو! رزق اور روزی کو زمین کی پہنائیوں میں تلاش کرو۔"

علمائے اسلام نے لکھا ہے کہ اس سے زراعت اور کھیتی مراد ہے۔

امام بخاری نے کتاب الزراعت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے:

مَامِنْ مُّسْلِمٍ یَّغْرِسُ غَرْسًا اَوْیَزْرَعُ زَرْعًا فَیَاْکُلُ مِنْهُ طَیْرٌ اَوْ اِنْسَانٌ اَوْ بَهِیْمَةٌ اِلَّا کَانَ لَهٗ بِهٖ صَدَقَةٌ۔

(بخاری، جلد اول، صفحہ ۳۱۲، مجتبائی)

"یعنی جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے یا کھیتی کرتا ہے اور اس سے پرندے، انسان اور مویشی اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں تو یہ عمل اس کے حق میں صدقہ بن جاتا ہے۔"

علمائے اسلام لکھتے ہیں کہ کھیتی کرنے والا اجر وثواب کی نیت کرے یا نہ کرے ہر حالت میں اسے آخرت کا ثواب ملے گا۔ کیوں کہ

لِتَوْسِعَتِهٖ عَلَى النَّاسِ فِىْ اَقْوَاتِهِمْ۔

(شرح بخاری، جلد ۵، صفحہ ۱۷۱)

"اس عمل سے مخلوق خدا کی روزی میں اضافہ ہوتا ہے۔"

فقہائے اسلام نے لکھا ہے کہ کھیتی ایسا عمل خیر ہے جس پر مسلم اور غیر مسلم دونوں کو ثواب ملتا ہے، اس کی دلیل دیتے ہوئے امام سرخسیؒ اپنی مشہور کتاب (المبسوط) میں کہتے ہیں:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

عَمِّرُوْا بِلَادِىْ فَعَاشَ فِيْهَا عِبَادِىْ۔

"میری بستیوں کو آباد کرو تاکہ میرے بندے اس میں زندگی بسر کریں۔"

فَلِهٰذَا قُلْنَا هٰذَا الْفِعْلُ حَسَنٌ مِنْ كُلِّ اَحَدٍ۔

(مبسوط، جلد ۲۳، کتاب المزارعت)

"اس وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ عمل زراعت، ایک عمل خیر ہے۔ خواہ کوئی بھی کرے۔"

یہی علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام جرف میں خود بھی کھیتی فرمائی ہے۔ کھیتی، تجارت اور صنعت ان تینوں وسائل معاش میں کون سا وسیلہ زیادہ افضل ہے؟

اس کا فیصلہ علمائے اسلام نے اس طرح کیا ہے:

"عوام کی ضرورت اور احتیاج کے لحاظ سے ان تینوں وسائل کے درمیان افضلیت قایم ہوتی ہے۔ جس وقت لوگوں کو خام اجناس، غلہ اور چارے

کی ضرورت ہوگی، اس وقت کھیتی کرنا زیادہ افضل ہوگا۔ اور جس وقت صنعت اور حرفت کی ضرورت زیادہ ہوگی، اس وقت صنعت کو ترجیح حاصل ہوگی، اسی طرح تجارت کا معاملہ ہے۔ پس اصل سوال رفاہ عام اور لوگوں کی ضرورت کو پورا کرنے کا ہے، اس پر فضیلت کا دارومدار ہے۔"

(عینی، جلد ۵، صفحہ ۱۷۱)

فقہائے اسلام نے زراعت کے حکم کی نوعیت کو بیان کرتے ہوئے اسے "فرض کفایہ" قرار دیا ہے۔ یعنی قوم کے ایک طبقے کے لیے زراعت کرنا مذہبی فریضہ ہے۔ اگر ایک طبقہ اس کام میں مشغول نہ ہوگا تو پوری قوم گناہ گار ہوگی۔

کاشت کاروں پر خصوصی توجہ:

بہر حال کاشت کاروں کے حالات پر ہمدردانہ نظر رکھنے کی خاص تاکید کی ہے اور ابوامامہ باہلیؓ کی مذکورہ بالا حدیث اس کی دلیل ہے۔ مشہور محدث علامہ ابن تینؒ نے اس روایت کی جو توجیہ کی ہے وہ یہ ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی میں دراصل ایک پیشین گوئی بیان کی گئی ہے، یعنی آپ نے یہ بتایا ہے کہ کاشت کار طبقہ سماج میں بہت مظلوم بن جائے گا۔ (عینی شرح بخاری، جلد ۵، صفحہ ۱۷۲)

چھٹی صدی ہجری کے یہ محدث جلیل اپنے دور کے حالات کی روشنی میں فرماتے ہیں:

لِاَنَّ الْمُشَاهِدَةَ الْاٰنَ اَنَّ اَكْثَرَ الظُّلْمِ اِنَّمَا هُوَ عَلٰى اَهْلِ الْحَرْثِ۔

"آج ہم مشاہدہ کر رہے ہیں کہ سب سے زیادہ ظلم وزیادتی کا شکار کھیتی باڑی کرنے والا طبقہ ہے۔"

یہ وہ دور ہے جب مسلمانوں میں عجمی ملوکیت اور جاگیرداری کا نظام اپنے شباب وعروج پر پہنچ گیا تھا اور اسلام کی جمہوریت عادلہ کے آثار کسی شعبۂ زندگی میں باقی نہیں رہے تھے۔

جلد:۲
آٹھویں مجلس:

احترام شریعت و شیخ علیہ الرحمہ

بعض فروعی مسائل میں اختلاف دیکھ کر اکابر صوفیا کے بارے میں یہ رائے قایم کرنا کہ یہ حضرات کرام طریقت، سلوک، کشف و کرامت اور قدم بوسی وسماع کے مقابلے میں شریعت حقہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں، خلاف واقعہ ہے۔ جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کو سمجھنے کے لیے ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقائے کرام کی زندگیوں کو دیکھا جائے۔ آج مسلمانوں کی زندگیاں اسلام کی ترجمان نہیں ہیں۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ آج کے عام صوفیا کی زندگیاں اکابر صوفیائے ربانی کا عکس نہیں ہیں۔

شیخ علیہ الرحمہ شریعت کا کتنا احترام کرتے تھے اور اپنے مریدین سے کراتے تھے، اسے سمجھنے کے لیے ایک واقعہ شیخ علیہ الرحمہ کا بیان فرمودہ وہ ہے جو آپ نے اپنے محبوب شیخ حضرت بابا فرید علیہ الرحمتہ والغفران کے بیماری کی وجہ سے رمضان المبارک کے روزہ افطار کرنے کے سلسلے میں بیان کیا ہے۔

شیخ المشائخ بابا صاحبؒ افطار کی حالت میں خربوزہ تناول فرمارہے تھے کہ آپ نے ایک پھانک اپنے مرید مولانا نظام الدینؒ کے سامنے پیش فرمائی، مرید محبؒ نے شیخ کے اس عطیے کو اپنی خوش نصیبی سمجھا اور ارادہ کیا کہ یہ پھانک کھا کر روزہ توڑ لے، اس کے بعد اس کا کفارہ ادا کر دیا جائے گا۔

حضرت بابا صاحبؒ نے اپنے مرید کا امتحان لیا تھا۔ مرید کے ارادے کو سمجھ کر آپ نے فرمایا، نظام الدین! ایسا نہ کرو، میرے لیے شریعت کی رخصت ہے، تمہارے لیے نہیں ہے۔ (مجلس ۸، جلد ۲، صفحہ ۳۶۱)

یہ تاکید فرض روزوں کے بارے میں ہے۔ نفل روزوں کے بارے میں شریعت نے نرمی اختیار کی ہے۔ نفلی روزہ اگر توڑ دیا جائے تو اس کی صرف قضا ہے، کفارہ نہیں ہے۔

نفلی روزے کے بارے میں صوفیا کے دو ذوق:

شیخ علیہ الرحمہ نے نفلی روزوں کے بارے میں دو ذوق نقل کیے ہیں۔ ایک ذوق تھا حضرت بابا فرید علیہ الرحمہ کا۔ آپ کثرت سے روزے رکھتے تھے اور روزوں کے معاملے میں آپ کا یہ حال تھا:

"شیخ کبیر کمتر افطار کردی اگرچہ قصد کردی یا حجامت و یا تپ آمدی البتہ روزہ داشتی۔"

"آپ بہت کم روزہ چھوڑتے تھے، فصد کھلوائیں، پچھنے لگوائیں یا بخار میں مبتلا ہوں۔ ہر حال میں روزے رکھتے تھے۔"

اس کے مقابلے میں شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کا ذوق دوسرا تھا۔

"و اصوم کمتر بودی اما طاعت و عبادت بسیار کردی۔"

"آپ روزے کم رکھتے تھے یعنی نفلی روزے، لیکن دوسری عبادات و طاعات بہت کرتے تھے۔"

اور آپ اس آیت پاک کا مصداق تھے:

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا.

(مومنون:۵۱)

"پاکیزہ چیزیں کھاؤ پیو اور نیک عمل کرتے رہو۔"

(جلد۴، مجلس ۴۱، صفحہ ۸۰۲)

احترام شریعت کی ایک اہم مثال:

قرآن کریم میں صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ

الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ (الانفال:۸)

"اے ایمان والو! تم اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو جب وہ تمھیں بلائیں اس بات کی طرف جو تمھیں زندگی عطا کرتی ہے اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ انسان کے اور اس کے دل کے درمیان آڑ بن جاتا ہے اور بے شک تم اسی کی طرف جمع کیے جاؤ گے۔"

ترمذی کی ایک روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی ابن کعبؓ کو کسی کام کے لیے آواز دی، ابی نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز ادا کر کے حاضر ہوئے اور دیر میں آنے کا عذر پیش کیا کہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یہ آیت کریمہ سنائی، مطلب یہ کہ آپ نے اس آیت کے حکم کو مطلق اور عام رکھا۔ علمائے مفسرین کے ہاں یہ بحث رہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بلانے پر اگر کوئی اپنی نماز توڑ کر آجاتا تو اسے اپنی نماز دہرانے کی ضرورت تھی یا نہیں؟ بہر حال وہ بحث اب مفید نہیں، آپ وصال فرما چکے۔

اس آیت کریمہ اور اس کے شان نزول کی روایت سے یہ بحث پیدا ہوگئی کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو موجود نہیں ہیں البتہ ان کے جانشین علما اور صوفیا موجود ہیں تو ان کے حکم اور فرمان کی حیثیت ان کے مریدین کے لیے کیا ہے؟

خواجہ حسنؒ نے ایک قدم آگے بڑھ کر شیخ علیہ الرحمہ سے یہ سوال کیا کہ اگر کسی مرید کا شیخ خود تشریف لے آئے اور مرید نفل نماز ادا کر رہا ہو تو کیا وہ نفل نماز توڑ کر شیخ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہو جائے؟ شیخ علیہ الرحمہ نے ارشاد فرمایا۔ نماز خود تمام باید کرد۔ نہیں، اپنی نماز پوری کرے۔

خواجہ حسنؒ نے پھر عرض کیا۔ وہ مرید ثواب حاصل کرنے اور سعادت کی تلاش میں نفل عبادت ادا کرتا ہے اور اس کا اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہو جانا بے شمار سعادتوں کا ذریعہ ہے اور مریدوں کا اپنے پیر کے متعلق یہی اعتقاد ہوتا ہے، شیخ کامل علیہ الرحمۃ والرضوان نے جواب دیا۔ حکم شرع ہم چنان است۔ شریعت کا حکم اسی طرح ہے۔

مطلب یہ کہ کسی کا اعتقاد کسی عمل کے بارے میں کیا ہے؟ اسے وہ جانے لیکن حکم

شریعت اپنی جگہ ہے، جس کی تعمیل ہر مسلمان پر ضروری ہے۔

پھر حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے اپنے قول مبارک کی تائید میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی علیہ الرحمہ کا یہ واقعہ نقل کیا کہ شیخ علیہ الرحمہ کسی ندی کے کنارے تشریف لے گئے مرید بھی وہاں وضو کر رہے تھے۔ شیخ کو دیکھ کر سب مرید وضو کر کے کھڑے ہو گئے، حالاں کہ ان کا وضو آدھا ہوا تھا، مگر ایک مرید بیٹھا رہا اور وضو مکمل کر کے کھڑا ہوا اور شیخ کی خدمت میں آیا، شیخ ملتانی نے فرمایا، اصل درویش یہی ہے کہ اس نے حکم شرعی کی تکمیل کر کے میرے پاس حاضری دی۔

خواجہ حسنؒ نے سوال کیا تو کیا وہ شخص کافر ہے جو نماز چھوڑ کر پیر کی خدمت میں مشغول ہو جائے؟ فرمایا: کافر نہیں کہہ سکتے۔

خواجہ حسنؒ نے اس بحث کو یہیں ختم نہیں کیا۔ بلکہ پیر کے ساتھ مرید کے حسن اعتقاد کی بحث چھیڑ دی۔ اس پر شیخؒ نے حضرت ابی ابن کعبؓ کا وہ واقعہ نقل کیا جو اوپر گزرا ہے۔ اور پھر حضرت بابا صاحبؒ اور مولانا بدر الدین اسحٰقؒ (بابا صاحب کے داماد اور خادم خاص) کا واقعہ نقل کیا کہ مولانا نماز پڑھ رہے تھے کہ حضرت بابا صاحب نے انھیں آواز دی۔ مولانا نے نماز کے اندر ہی زور سے لبیک کہہ کر جواب دیا۔ مولانا بدر الدین بن اسحٰقؒ اپنے عہد کے جید علما میں سے تھے۔ منقولات و معقولات دونوں میں درجۂ فضل و کمال رکھتے تھے، پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ مولاناؒ شریعت کی خلاف ورزی کریں۔ اس لیے ظاہر ہے کہ مولانا کی نماز نفلی نماز ہوگی۔ جس کا بعد میں بغیر کسی گناہ کے اعادہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ فرض نماز کا اس طرح توڑنا موجب گناہ ہے۔ اسی صورت میں شیخؒ نے فرمایا:

"فرمان شیخ فرمان رسول است علیہ السلام۔"

"شیخ کا حکم رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا حکم ہے۔"

(مجلس ۸، جلد ۵، صفحہ ۹۶۵)

شیخ علیہ الرحمہ کے اس قول کو واقعہ مذکورہ کے سیاق و سباق میں سمجھنا چاہیے اور اس کا یہ مطلب نہ لینا چاہیے کہ شیخ و پیر کے حکم کی نوعیت کچھ بھی ہو اور موقعہ و محل کیسا ہی

ہو ہر حال میں شیخ کے حکم کی حیثیت حکم رسول کی ہے، کیوں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شیخ طریقت غلبہ حال کی کیفیت میں کوئی حکم دیتا ہے یا کوئی دعویٰ کرتا ہے۔

نفلی عبادات میں توسع:

نفلی عبادات میں شریعت نے جو توسع اختیار کیا ہے اور اس میں حقوق العباد کی جو رعایت کی ہے اس کی ایک واضح مثال احادیث میں حضرت صفوان ابن معطلؓ اور ان کی بیوی کا واقعہ ہے، اس نیک خاتون نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے شوہر کی تین شکایتیں کیں، جن میں سے ایک یہ تھی کہ **وَیُفْطِرُنِی اِذَا صُمْتُ** میں جب روزے رکھتی ہوں تو یہ مجھے روزہ افطار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ صفوانؓ نے اس کا جواب دیا۔

اَمَّا قَوْلُهَا يُفْطِرُنِي اِذَا صُمْتُ فَاِنَّهَا تَنْطَلِقُ تَصُوْمُ وَاَنَا رَجُلٌ شَابٌّ فَلَا اَصْبِرُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَصُوْمُ امْرَاَةٌ اِلَّا بِاِذْنِ زَوْجِهَا.

(مشکوٰۃ: ۲۸۲)

"حضور! اس شکایت کی حقیقت یہ ہے کہ یہ میری بیوی مسلسل (نفلی) روزے رکھتی چلی جاتی ہے اور میں جوان آدمی ہوں، مجھ سے صبر نہیں ہوتا، اس پر آپ نے ہدایت فرمائی کہ کوئی عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر نفلی روزے نہ رکھے۔"

ظاہر ہے کہ ایک بیوی پر شوہر کی تابع داری کا جو حق واجب ہے۔ ایک شیخ و استاد کا حق بھی اس سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہی ہو سکتا ہے، کیوں کہ شیخ کا مقام باپ کے مقابلے میں بھی زیادہ ہے۔ البتہ شریعت کا یہ اصول بہر حال میں مسلم و نافذ ہے۔

لَا طَاعَةَ فِيْ مَعْصِيَةٍ اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ.

(مشکوٰۃ، صفحہ ۳۱۹، عن علی کرم اللہ وجہہ، متفق علیہ)

"نافرمانی کے کام میں کسی کی اطاعت جائز نہیں، البتہ نیکی کے کام میں ضروری ہے۔"

جلد:۲
اٹھارویں مجلس:

دعا میں یقین اور اعتماد علی اللہ

حضرت شیخ علیہ الرحمہ دعا کی قبولیت کا اصلی راز بیان فرمارہے ہیں یعنی دعا اور توبہ میں مانگنے والے کی نظر رحمت الٰہی پر ہونی چاہیے۔

دعا عام ہے، ہر شے کی طلب کا نام دعا ہے، توبہ مغفرت کی طلب کا نام ہے دونوں قسم کی دعاؤں میں شیخ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ رحمت وکرم خداوند تعالیٰ پر نظر رہے، کیوں کہ توبہ کی دعا میں اگر پچھلے گناہوں پر نظر رکھے گا تو قبولیت کے یقین میں کمزوری پیدا ہوگی اور اگر اپنی نیکیوں پر نظر رکھے گا۔ (کہ ان پچھلی نیکیوں کے صدقے میں میری توبہ قبول ہوجائے) تو اس کے دل میں تکبر پیدا ہوگا۔

''پس وقت دعا نظر خاص بر رحمت حق مے باید داشت وموقن باید بود کہ البتہ ایں دعا مستجاب است ان شاء اللہ۔''

لہٰذا وقت دعا رحمت الٰہی پر نظر رہے اور دل میں اس بات کا یقین رہے کہ اس کی دعا ضرور قبول ہوگی۔ ان شاء اللہ

شیخ علیہ الرحمہ نے عجیب حکیمانہ بات ارشاد فرمائی ہے۔

قرآن وحدیث میں دعا توبہ کے لیے جس بات پر زور دیا گیا ہے وہ اعتماد ویقین کا جذبہ صادق ہے اور مانگنے والے اور توبہ کرنے والے کے اندر یقین واعتماد اسی صورت میں پیدا ہوسکتا ہے جب اس کی نظر رحمت الٰہی پر ہو۔

یقین پیدا کرنے کے دو محرک:

رحمت پر نظر رکھنے سے قبولیت کا یقین دو طرح پیدا ہوتا ہے۔ ایک اس طرح کہ

خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت اور اپنے کرم کو بندوں کے لیے عام رکھا ہے اور اپنے اوپر رحم و کرم کو بندوں کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ فرمایا:

کَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ. (انعام:۵۴)

"تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر رکھا ہے۔"

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ O (زمر:۵۳)

"اے میرے وہ بندوں جنہوں نے اپنی جانوں پر (اللہ کی نافرمانی کر کے) زیادتی کی ہے وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف کر دے گا بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

حدیث پاک میں آتا ہے، حدیث قدسی ہے، اللہ فرماتا ہے:

اِنَّ رَحْمَتِيْ سَبَقَتْ عَلٰى غَضَبِيْ.

"بے شک میری رحمت میرے غصہ و غضب پر سبقت رکھتی ہے۔"

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

سبق رحمت پر غضب ہست اے فتا　　لطف غالب بود در وصف خدا
بندگاں دار ندلا بد خوئے او　　مشکہا شان پرز آب جوے رو
سبق رحمت گشت غالب بہ صفت　　اے بدیع افعال نیکو کار رب

"خدا تعالیٰ کی وسیع رحمت کے سمندر سے اس کے نیک بندے اپنی مشکیں بھرتے ہیں اور اپنی مشکلوں اور اپنی محبت و پیار بھری عادتوں اور خدمت کے ذریعے خدا کے بندوں کو آرام و راحت پہنچاتے رہیں۔ وہی ہیں خدا کے خاص بندے جو اس کی صفت رحمت کا مظہر ہوتے ہیں۔"

دوسرے اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے گناہ گار بندوں کو توبہ و استغفار کے لیے آواز دی ہے، انھیں ترغیب دی ہے۔ دعا کو عبادت اور بندگی کا گودا اور اس کی روح

قرار دیا ہے۔

۱. وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ O (بقرہ:۱۸۶)

۲. وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ O (مومن:۶۰)

۳. يَسْئَلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ O فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ O (رحمٰن:۲۹)

۴. اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّاتَذَكَّرُوْنَ O (نمل:۶۲)

"اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! جب میرے بندے میرے متعلق سوال کریں کہ وہ خدائے واحد کہاں ہے؟ تو میں ان سے کہتا ہوں کہ میں قریب ہوں، میں پکارنے والے کی پکار کو قبول کرتا ہوں، جب وہ مجھے پکارتا ہے، تو چاہیے کہ وہ میرے بندے میرا حکم قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تا کہ وہ سیدھی راہ پا سکیں۔"

آیت نمبر:۲۔ پر شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی علیہ الرحمہ نے بڑی معنی خیز تشریح کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"بندگی کی شرط ہے، اپنے رب سے مانگنا، نہ مانگنا غرور ہے، اگر دنیا نہ مانگے مغفرت ہی مانگے، اور اس سے معلوم ہوا کہ اللہ پکار کو پہنچتا ہے، سو یہ حق بات ہے مگر یہ نہیں کہ ہر بندے کی ہر دعا قبول کرے، اس کی مرضی موافق، مالک ہے، اپنے خوشی کرتا ہے۔" (زخرف:۶۰)

۲۔ دوسری آیت کا مطلب خیز ترجمہ یہ ہے۔

"اے لوگو! تمہارا پروردگار کہتا ہے کہ مجھے پکارو میں تمہاری پکار کو قبول کروں گا، بے شک جو لوگ میری عبادت (دعا) سے تکبر کرتے ہیں، میں ان غرور پسندوں کو جہنم میں ڈالوں گا۔"

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے عبادت سے استکبار کا پیرایہ اختیار کیا، جس میں یہ اشارہ مخفی ہے کہ دعا، عبادت بلکہ عبادت کی روح ہے۔

۳۔ تیسری آیت میں قرآن کریم نے بتایا کہ آسمان و زمین کی ہر چیز خدا تعالیٰ سے سوال کرتی ہے اور اس پروردگار کی ہر آن نئی شان ہے۔ پھر اے جن وانس! تم خدا کی کس کس نعمت کی ناشکری کرو گے۔

یہ سوال زبان قال اور زبان حال دونوں سے برابر جاری ہے۔ انسان کو خدا نے زبان قال عطا کی ہے، اور ساتھ ہی اختیار کی قوت بھی دی ہے، اس لیے انسان کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے مالک کے سامنے طلب و دعا کے ہاتھ پھیلائے اور اگر انسان اپنے مالک و محسن سے اعراض و تکبر کی راہ اختیار کرے گا بھی تو اس کا فطری وجود تو ہر حال میں اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ وہ کسی قادر مطلق کے سامنے محتاج و ذلیل ہے۔

اتنے وسائل قوت کے باوجود آج کا سائنسی انسان ہر ہر قدم پر کسی طاقت کا محتاج ثابت ہو رہا ہے وہ اس طاقت کو تسلیم کرتا ہے۔ فطرت اور طبیعت کے نام سے اہل مذہب اسے اللہ اور خدا کہتے ہیں۔

دوسری مخلوق زبان قال (گویائی بامعنی قول) سے محروم ہے، اس لیے اس کی دعا زبان حال سے ہے، یعنی ہر ذرہ اپنے وجود اور مقصد وجود کے لیے موجود حقیقی کے فیضان توجہ کا محتاج ہے، اگر اس وجود حقیقی کی طرف سے توفیق و نصرت نہ ہو تو کائنات کی کوئی شے زندہ نہیں رہ سکتی۔

یقین و اعتماد کی اہمیت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثیں منقول ہیں:

۱۔ اُدْعُوا اللّٰهَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَةِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی لَا يَسْتَجِيْبُ دُعَآءً مِّنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاهٍ۔

(ترمذی کتاب الدعاء)

"اللہ کو پکارو! اس حال میں کہ تم قبولیت دعا کا دل میں یقین رکھتے ہو اور یہ بھی جان لو کہ اللہ تعالیٰ غفلت رکھنے والے اور اپنی مراد اور مطلوب سے بے خبر رہنے والے کی دعا قبول نہیں کرتا۔"

غفلت اور لہو دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے، لیکن محدثین نے دونوں کا مصداق الگ الگ بیان کیا ہے۔ غفلت خدا کی رحمت اور اس کی شان کرم سے۔ لہو، غفلت اپنے مطلوب سے، مثلاً عربی نہ جاننے والا عربی میں دعا کرے ظاہر ہے کہ وہ دعا کے الفاظ دہرائے گا اس کا مطلب کیا ہے؟ اس سے وہ بے خبر رہے گا۔ مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن میں اس قسم کی دعاؤں کو دعا کا پڑھنا کہا ہے۔ دعا کرنا نہیں کہا۔ ثواب بہر حال پڑھنے کا بھی مل جاتا ہے۔

دوسری حدیث یہ ہے۔

جب کوئی تم میں سے دعا کرے تو یہ نہ کہے کہ اے اللہ! اگر تو چاہے تو بخش دے اور اگر نہ چاہے تو نہ بخش! بلکہ:

وَلْيَعْزِمْ مَسْئَلَةً اَنَّهٗ يَفْعَلُ مَايَشَآءُ وَلَا مُكْرِهَ لَهٗ۔

(بخاری شریف کتاب الدعا)

اسے چاہیے کہ اپنی دعا اور اپنے سوال میں اس بات کا پختہ یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے، اسے کوئی مجبور کرنے والا نہیں۔

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے دعا میں دو خطروں سے بچنے کی ہدایت کی، ایک مایوسی اور دوسرے تکبر — اور رحمت پر اعتماد کے جذبے کی طرف دعوت دی۔ لیکن اس تیسرے جذبے میں بھی ایک خطرہ پوشیدہ ہے اور وہ ہے خدا کی رحمت کے بارے میں خوش فہمی۔

شیخ علیہ الرحمہ نے اس خطرے کو زیادہ نقصان دہ نہیں سمجھا اور دو خطروں کے مقابلے میں اور قرآن کریم نے قیامت کے دن ایک سوال کا تذکرہ کیا ہے اور اس سوال کے اسلوب میں جو رعایت کی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تیسرا جذبہ کسی نہ کسی درجے میں خدا تعالیٰ کو پسند ہے۔ سوال کیا جائے گا:

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَاغَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِيْمِ O

(انفطار:۶)

"اے انسانو! تجھ کو اپنے پروردگار کے بارے میں جو کریم ہے کس چیز نے بھول میں ڈال رکھا تھا؟"

امام فخر الدین رازیؒ نے اپنی تفسیر میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ خداوند عالم نے اس سوال کے اسلوب میں جواب پوشیدہ رکھا ہے یعنی رب کریم کہا، رب جلیل اور رب عظیم جیسی صفتوں سے اپنی ذات کو موصوف نہیں کیا۔ کریم کی صفت سے موصوف کیا اور بندوں کو یہ جواب سکھایا کہ وہ جواب میں کہیں: "اے رب تیرے رحم و کرم کی فراوانی نے ہمیں بھلاوے میں ڈال رکھا تھا۔" سبحان اللہ العظیم

عام طور پر فارسی اور اردو ترجمہ نگاروں نے غر (غرور) کا ترجمہ فریب، دھوکہ اور بہکاوے کے الفاظ سے کیا ہے۔ لیکن مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے بیان القرآن میں "بھول میں ڈالا" ترجمہ کر کے مراد خداوندی کو واضح کیا ہے۔ مشرکین صحابہ کرام کے مجاہدانہ جوش وخروش کو دیکھ کر کہتے تھے:

غَرَّ هٰۤؤُلَاۤءِ دِيْنُهُمْ.

"ان مسلمانوں کو تو ان کے دین نے مغرور کر دیا ہے۔"

یعنی یہ محض دین کا نشہ ہے جو انھیں مقابلے پر لے جا رہا ہے ورنہ ان کے پلے ہے کیا؟ (ترجمان القرآن۔ جلد۲، صفحہ۶۵)

مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے لفظ مغرور اور دین کا نشہ لکھ کر دونوں آیتوں کی حقیقی روح کو واشگاف کر دیا۔ واللہ اعلم وعلمہٗ اتم

اہل محبت کی ایک جماعت نے ان تینوں خطروں سے بچ کر چوتھا راستہ رضا بالقضا کا تجویز کیا ہے، جس کی وضاحت تعلیمات شیخ میں دیکھی جائے۔

شیخ علیہ الرحمہ کا رجحان:

اوپر کی بحث سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ علیہ الرحمہ کا رجحان رجائے رحمت کی

طرف ہے اور شیخ نے اس نازک مسئلے میں بڑی احتیاط کی ہے۔

قرآن کریم کے اسلوب سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ خوف و رجا کی دونوں کیفیتوں کو جمع کرنے کی کوشش کے باوجود دل کا میلان رجائے کرم اور امید رحمت کی طرف ہونا چاہیے۔ سورۂ بنی اسرائیل آیت ۵۷ میں عظمت رکھنے والی ہستیوں کے بارے میں فرمایا:

يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ

"وہ رحمت الٰہی کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔"

اس میں امید و رجا کی کیفیت کو مقدم رکھا گیا ہے۔

خوف و رجا:

حدیث پاک میں آتا ہے کہ:

اَلْاِيْمَانُ بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاۤءِ.

"ایمان خوف و رجا کے درمیان ہے۔"

یعنی خدا تعالیٰ کے غضب سے ڈرنا اور اس کی رحمت کا امیدوار رہنا۔ ان دونوں جذبوں کے درمیان ایمان کی حقیقت قائم ہے۔

حالاں کہ یہ ان دونوں انتہاؤں سے بچ کر بیچ کی حالت (اعتدال) پر قائم رہنا آسان بات نہیں ہے، لیکن صاحب ایمان لوگوں کو اسی کی تاکید کی گئی ہے، اور اگر کسی ایک طرف میلان اور جھکاؤ کو پسند کیا گیا ہے تو وہ رحمت الٰہی کی طرف جھکاؤ ہے، جس کا اشارہ اوپر کی آیت میں موجود ہے۔

جلد:۲
۲۳ویں مجلس:

نظر بد اور جادو کی تاثیر کے حقیقت ہونے کا بیان

شیخ علیہ الرحمہ نے اس مجلس میں نظر بد اور جادو کے مسائل پر روشنی ڈالی اور اس کا پس منظر خواجہ حسن علاءؒ نے یہ بیان کیا کہ اس مجلس میں شیخؒ کے کئی مریدوں نے شرکت کی۔ شیخؒ نے ان آنے والوں سے پوچھا کیا تم سب ایک ساتھ آئے ہو؟ انھوں نے عرض کیا، نہیں! ہم سب اپنے اپنے گھروں سے الگ الگ چلے تھے، یہاں آکر ایک جگہ جمع ہو گئے۔ فرمایا، ٹھیک ہے، الگ الگ آنا ہی بہتر ہے کیوں کہ شیخ فریدالدین قدس سرہٗ العزیز نے یہی فرمایا تھا کہ لوگوں کا الگ الگ آنا ہی بہتر ہے کیوں کہ، **اَلْعَیْنُ حَقٌّ۔** نظر بد کا لگ جانا صحیح بات ہے۔ پھر فرمایا:

اَلْعَیْنُ حَقٌّ وَالسِّحْرُ حَقٌّ۔

''فرمود کہ ایں نہ آں حق است کہ غیر باطل است یعنی اثرہ کائن معتزلہ، ایں معنی منکرند، مے گویند کہ اثر سحر و اثر عین چوں فی الحال پیدا نمے شود پس آں خیال باشد، آں چناں نیست کہ ایشاں گویند۔'' (صفحہ ۴۱۶)

پھر فرمایا: نظر بد کا لگنا اور جادو کا اثر انگیز ہونا صحیح بات ہے۔ اس حدیث میں حق کا لفظ غیر باطل (مقابل باطل) کے مفہوم میں نہیں ہے، بلکہ اس کا مفہوم ہے امر واقعی یعنی اساس کا اثر واقع ہوتا ہے۔ معتزلہ اس کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نظر اور جادو کا اثر فوری طور پر ظاہر نہیں ہوتا، یہ صرف خیال (وہم) ہے، لیکن ایسا نہیں ہیں جیسا یہ لوگ کہتے ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی پیروی:

حضرت بابا صاحب علیہ الرحمہ کے حوالے سے شیخ نے جو نصیحت نقل کی وہ دراصل حضرت یعقوب علیہ السلام کے طرز عمل کی پیروی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے گیارہ بیٹوں کو نصیحت فرمائی تھی:

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۭ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ. (یوسف:۱۲)

"اے میرے بیٹو! تم مصر میں ایک دروازے سے اکٹھے داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا اور میں تمھیں حکم الٰہی سے نہیں بچا سکتا، کیوں کہ حکم تو اسی کا چلتا ہے۔"

حضرت ابن عباسؓ اور دوسرے علمائے تابعین نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی نصیحت کا سبب بیان کرتے ہوئے فرمایا:

انہ خشی علیھم العین وذالک انھم کانوا ذو جمال وھیئة حسنہ فان العین حق حتی تستزل الفارس عن فرسہ. (ابن کثیر۔جلد۲، صفحہ۴۸۴)

حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے لڑکوں پر لوگوں کی نظر لگ جانے کا اندیشہ تھا کیوں کہ وہ سب خوب صورت اور حسین تھے۔ اور نظر واقعی لگ جاتی ہے یہاں تک کہ گھوڑے سوار کو اس کے گھوڑے سے گرا دیتی ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب علیہ الرحمہ نے اس آیت پر جو تفسیری نوٹ لکھا ہے وہ بہت جامع اور حقیقت افروز ہے۔ فرماتے ہیں حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ ٹوک کا بچاؤ بتایا، بھروسہ اللہ پر کیا، ٹوک لگنی غلط نہیں اور اس کا بچاؤ کرنا بھی درست ہے۔

بیٹوں نے باپ کی نصیحت کے مطابق عمل کیا، ٹوک سے بچ گئے، لیکن تقدیر الٰہی

دوسرے راستے سے نافذ ہوئی۔ (یعنی بن یامین کے ساتھ چوری کا واقعہ پیش آ گیا) تقدیر دفع نہیں ہوتی۔ اہلِ علم تقدیر پر یقین رکھتے ہوئے بچاؤ کے اسباب اختیار کرتے ہیں اور اگر علم نہ ہو تو پھر بڑی مشکل پیش آتی ہے اگر یہ لوگ ان دونوں میں ایک کو پکڑتے ہیں تو دوسری ان کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ (حمائل:۴۰۰)

شیخ رحمہ اللہ نے جو مقولہ نقل فرمایا ہے وہ عقاید کی کتابوں میں مذکور ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں پہلا فقرہ اس طرح منقول ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْعَيْنُ حَقٌّ فَلَوْ كَانَ شَيْءٌ سَابِقَ الْقَدَرِ سَبَقَتْهُ الْعَيْنُ.

(مشکوٰۃ:۳۸۸، بہ حوالہ مسلم)

نظر کا لگنا واقعی بات ہے، اگر کوئی چیز تقدیر الٰہی پر سبقت لے جا سکتی تھی تو وہ نظر کا لگ جانا تھا۔ یعنی نظر ایسی زود اثر چیز ہے۔ لیکن تقدیر پر کوئی چیز سبقت نہیں حاصل کر سکتی۔

نظر بد اور جادو کے مسئلے میں شیخ علیہ الرحمہ کا وہی مسلک ہے جو اہلِ سنت کا ہے۔ معتزلہ کی رائے الگ ہے۔ البتہ نظر بد اور سحر کے بارے میں غلو اور افراط پیدا ہو گئی ہے۔ جہاں تک اکابر صوفیا کا تعلق ہے ان کا طرز عمل افراط و تفریط سے پاک نظر آتا ہے اور آج ان حضرات کے نام سے عملیات کا جو دھندا چل رہا ہے وہ بالکل ایک دھندا ہی ہے، اور شرعی جواز کی حد سے متجاوز۔

بدفالی اور نیک فالی کی بحث:

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے اس مجلس مبارک میں ایک اہم بات یہ فرمائی کہ فال دیکھنے کے بارے میں ایک حدیث آئی ہے۔ وہ حدیث یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا طِيَرَةَ وَخَيْرُهَا الْفَالُ قَالُوْا وَمَا الْفَالُ قَالَ الْكَلِمَةُ الصَّالِحَةُ يَسْمَعُهَا اَحَدٌ. (مشکوٰۃ:۳۹۱ بہ حوالہ متفق علیہ)

"بدفالی کی کوئی حقیقت نہیں ہے، ہاں، نیک فال بہتر ہے۔ صحابہ نے پوچھا، فال کیا ہے؟ فرمایا، کوئی اچھا کلمہ، اچھی بات جو کوئی سنے۔"

ایک روایت میں۔

لَا عَدْوٰی وَلَا هَیْرَةَ وَلَا هَامَةَ وَلَا صَفَرَ
فِرَّ مِنَ الْمَجْذُوْمِ كَمَا تَفِرُّ مِنَ الْاَسَدِ۔ (بہ حوالہ بخاری)

"بیماری کے متعدی ہونے کی کوئی حقیقت نہیں اور نہ بدفالی کی اور نہ کسی جانور سے بدشگونی لینے کی اور نہ صفر کے مہینے کو منحوس خیال کرنے کی اور اے مخاطب! جذام کی بیماری سے دور رہا کر جس طرح شیر سے دور رہتا ہے۔"

بدفالی:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدشگونی، نحوست اور بدفالی لینے کی ممانعت فرمائی۔ ایک حدیث میں اس کی وجہ یہ بیان فرمائی، يَذْهَبُهٗ بِالتَّوَكُّلِ، اس وہم سے توکل اور خداتعالیٰ پر بھروسہ کرنے کا جذبہ ختم ہوجاتا ہے۔ البتہ آپ نے نیک فال اور نیک شگون لینے کی اجازت دی جو کسی اچھی بات کے کان میں پڑنے سے لیا جائے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی ضرورت سے نکلتے اور آپ کے کان میں کوئی اچھا لفظ (یا راشد یا نجیح) پڑتا تو آپ کو خوشی ہوتی۔ (ترمذی)

اسی طرح آپ جب کسی صحابی کو کسی جگہ کا افسر بنا کر روانہ کرتے تو اس کا نام پوچھتے اگر اچھا نام ہوتا تو اسے پسند کرتے، برا نام ہوتا تو آپ اسے ناپسند فرماتے۔

اسی طرح کسی بستی میں تشریف لے جاتے تو اس کا نام پوچھتے، اگر اچھا نام ہوتا تو آپ خوش ہوتے اور برا نام ہوتا تو ناخوش ہوتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دراصل مسلمانوں میں رجائیت پسندی (پر امید رہنے) کی ذہنیت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور مایوس رہنے کی ذہنیت سے بچانا چاہتے ہیں اور قرآن کریم میں خداوند عالم کا انداز کلام بھی اسی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ فرمایا:

نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ ۝ (الحجر:۱۵)

"میرے بندوں کو خبردار کر دو کہ اصل میں ہی ہوں بخشش کرنے والا مہربان اور بے شک میرا عذاب دردناک ہے۔"

اس اہم آیت کا اسلوب یہ بتا رہا ہے کہ بخشش اور رحم خداتعالیٰ کی صفت خاص ہے جسے اس نے مقدم رکھا اور قہر و عذاب اس کی ملکیت میں ہیں، وہ اس کا مالک ہے۔

صفت کے صیغوں اور اضافت کی ترکیب اسی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

بعض لوگ مشرکانہ تصورات میں مبتلا ہونے کی وجہ سے بعض دنوں کے منحوس ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں اور قرآن کریم کی اس آیت کو دلیل بناتے ہیں۔ قوم عاد کے عذاب کے بارے میں فرمایا گیا:

فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْٓ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ ۝
(حم السجدۃ:۴۱)

"ہم نے ان لوگوں پر طوفانی آندھی بھیجی جو منحوس دنوں میں ان پر چلتی رہی۔"

قوم عاد کے برے دنوں کو منحوس دن کہا گیا ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلویؒ نے نحسات کا ترجمہ "مصیبت کے دن" کیا ہے۔ جو قوم عاد کے حق میں واقعی مصیبت کے تھے، لیکن اس سے منحوس ہونے کے مروجہ تصور کا کوئی تعلق نہیں، کیوں کہ مصیبت کے وہ دن، سات راتیں اور آٹھ دن تھے، یعنی پورا ہفتہ تھا۔ تو کیا پورے ہفتے کو منحوس اور نامبارک سمجھا جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر قوم فرعون کی طرف سے الزام لگانے پر قرآن کریم نے کہا:

"جب اہل مصر پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ موسیٰ اور اس کے رفقا کی نحوست بدقدمی اور شومیٔ تقدیر ہے اور جب اچھی حالت آتی

ہے تو کہتے کہ یہ ہماری اقبال مندی اور خوش قسمتی ہے۔"

اس کا جواب دیا گیا:

اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ O (اعراف:۱۳۱)

"خبردار! ان کا خیال غلط ہے، ان لوگوں کی بدقسمتی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ اس کا ظہور مصائب کی صورت میں خدا کی تقدیر اور مصلحت کے مطابق ہوتا ہے۔"

شاہ صاحب تفسیر کرتے ہیں:

"یہ نہیں فرمایا کہ یہ نحوست و شومی تمہارے کفر و سرکشی کے سبب ہے، کیوں کہ بہت سے منکر دنیا میں آرام و راحت کی زندگی گذارتے ہیں، اس لیے یہ فرمایا کہ دنیا کے اچھے اور برے حالات تقدیر الٰہی سے تعلق رکھتے ہیں۔" (خلاصہ)

شیخ علیہ الرحمہ نے کسی "اچھی بات کے سننے" پر اچھی بات کے پڑھنے کو قیاس کر کے قرآن کریم کی تلاوت سے نیک فال لینے کی اجازت دی۔

البتہ حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے جو حکایت بیان فرمائی اس میں عذاب الٰہی کی آیات سے بدفالی لینے کی بات بھی مذکور ہے، جس کی حدیث میں اجازت نہیں دی گئی۔ احادیث میں صرف اتنا آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم برے الفاظ سن کر ناخوش ہوتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب

امراض کا متعدی ہونا:

بیماریوں کے متعدی ہونے یعنی چھوت لگنے کے بارے میں دو مختلف باتیں اوپر والی حدیث میں بیان کی گئی ہیں۔ علما نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ کسی بیماری کو بالذات موثر یعنی کسی بیماری کے اندر تاثیر کی بااختیار قوت (جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سوا کسی دوسری شے میں ممکن نہیں) تسلیم کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ سبب کے درجے میں

تاثیر کا ماننا خلاف شریعت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے کو صاف کرنے کے لیے ایک نہایت جامع اصول ارشاد فرمایا یمن کی ایک بستی (ابین) کے بارے میں وہاں کے باشندوں نے عرض کیا کہ ہماری جگہ کی آب و ہوا خراب ہے ہم کیا کریں؟ آپ نے فرمایا اسے چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جاؤ، پھر کہا:

فَاِنَّ مِنَ الْقَرَفِ التَّلَفِ. (مشکوٰۃ:۳۹۲ بہ حوالہ ابوداود)

"بیماری کے قریب جانا ہلاکت ہے۔"

محدثین لکھتے ہیں اس اصول کا تعلق طب و معالجے سے ہے۔ بیماری کو چھوت لگنے کے عام غلط تصور سے نہیں ہے۔ یہ احتیاط و پرہیز کا اصول ہے، طبی نقطۂ نظر سے وباؤں اور بیماریوں کے قریب جانا احتیاط کے خلاف ہے۔

جلد: ۲
۲۷ویں مجلس:

شیخ حاضر باشید کا مطلب

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے شیخ محمد نیشاپوریؒ کے حوالے سے ایک واقعہ نقل کیا کہ وہ گجرات ہندوستان کا سفر کررہے تھے کہ ایک ہندو تلوار لے کران کے سامنے آ گیا۔ انھوں نے اسے ہتھیار بند دیکھ کر اپنے شیخ کو مخاطب کیا اور کہا شیخ حاضر باش! اس ہندو نے تلوار ہاتھ سے پھینک دی اور ہم سے امان طلب کی، ہم نے اسے امان دے دی، وہ چلا گیا، شیخ علیہ الرحمہ نے واقعہ سنا کر فرمایا:

''بنگر تا آن ہندو چہ دید و اورا چہ نمودند۔''

''غور کرو! اس ہندو نے کیا دیکھا اور اسے کیا دکھایا گیا۔''

ملفوظات کے مترجم (خواجہ حسن ثانی صاحبؒ) نے اس فقرے کا مطلب قوسین کے اندر یہ لکھا ہے۔ (یا پیر مدد! اور اصل ترجمہ یہ لکھا ہے اے پیر آیئے!)

جہاں تک غیر خدا سے مدد مانگنے کے مسئلے کا تعلق ہے، اس کی وضاحت جماعت دیوبند کے سربراہ مولانا شیخ الہند محمود حسن صاحبؒ نے اپنے ترجمۂ قرآن موضح الفرقان میں سورۂ فاتحہ آیت (۴) اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کی تشریح، حاشیہ میں اس طرح کی ہے:

اس آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ اس کی ذات پاک کے سوا کسی سے حقیقت میں مدد مانگنا بالکل ناجائز ہے۔ ہاں! کسی مقبول بندے کو محض واسطہ رحمت الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری اس سے کرے تو یہ جائز ہے کہ یہ استعانت درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔

امت کے دو بڑے فرقوں کے درمیان استعانت بالغیر کے مسئلے میں افراط و تفریط پیدا ہوگئی ہے، شیخ الہندؒ نے استعانت حقیقی اور استعانت مجازی کی الگ الگ تعریف کرکے اسے

دور کر دیا ہے۔البتہ جماعت اہلِ حدیث اور سلفی حضرات کا مسلک اس سے الگ ہے۔

رہا مسئلہ یا شیخ حاضر باش! کا تو دراصل یہ استعانت سے متعلق نہیں ہے، بلکہ روحانی کشف سے متعلق ہے۔صاحب کلام نے اپنے شیخ کی روحانیت کو متوجہ کیا ہے، شیخ کی قوی روحانیت کی توجہ نے اس ہندو کے قلب اور باطن پر اثر ڈالا اور وہ خوف زدہ ہو گیا۔

شیخ علیہ الرحمہ کا ''چہ دید و چہ نمودند'' کا اشارتی فقرہ یہ بتا رہا ہے کہ یہ روحانی واردات کا معاملہ ہے، بظاہر کسی کو کچھ نظر نہیں آیا۔لیکن شیخ کی روحانیت نے مرید کو دشمن کے حملے سے بچالیا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فرزندوں میں شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلویؒ کو حضرت شاہ فضل الرحمان صاحب گنج مراد آبادیؒ (شاگرد رشید شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ) صاحب نسبت بزرگ کہا کرتے تھے:

شاہ صاحبؒ نے موضح قرآن کے فوائد میں روحانی ملاقاتوں کے اثبات پر سورۂ زخرف (۴۵) وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ ''اور پوچھ دیکھ جو رسول بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے بھی'' کے فائدہ میں روشنی ڈالی ہے۔لکھتے ہیں۔

''اور پوچھ دیکھ یعنی جس وقت ان کی ارواح سے ملاقات ہو یا ان کے احوال کتابوں سے تحقیق کر۔''

شیخ علیہ الرحمہ نے ایک مجلس میں خود اپنے متعلق بیان فرمایا کہ میں اپنے شیخ حضرت بابا صاحبؒ کی زیارت کے لیے جا رہا تھا کہ راستے میں مجھے پیاس لگی اور میں ایک تالاب پر پہنچا، اپنے گھوڑے سے اتر کر میں نے تالاب کا پانی پینا چاہا کہ مجھے متلی شروع ہو گئی اور صفرہ کے غلبے کے سبب مجھ پر بے ہوشی طاری ہو گئی اس وقت میری زبان سے نکلا، شیخ شیخ پھر تھوڑی دیر کے بعد مجھے ہوش آ گیا۔(جلد۲،مجلس۱۶،صفحہ۳۸۲)

یہ کیفیت بھی شیخؒ کے ساتھ محبت اور شیخؒ کے خیال میں مستغرق ہونے کی ہے۔شیخ علیہ الرحمہ کی زبان مبارک پر، یا شیخ المدد کے مشتبہ الفاظ جاری نہیں ہوئے۔

ہم نے اسمائے حسنیٰ کی بحث میں حضرت شیخؒ کی احتیاط پسندی پر روشنی ڈالی ہے وہاں دیکھا جائے۔

جلد:۲

مجلس چہارم:

ایمان باس، ایمان بالغیب،

مومن اور کافر کے درمیان فرق

شیخ علیہ الرحمہ نے ایمان باس کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ کافر لوگ موت کے وقت عذاب الٰہی کا مشاہدہ کر لیتے ہیں، پھر ایمان لاتے ہیں۔اس ایمان کا کوئی اعتبار نہیں کیوں کہ یہ ایمان بالغیب نہیں، البتہ اگر مومن موت کے وقت توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہو جاتی ہے۔

ایمان باس۔باس کے معنی عذاب، یعنی عذاب کے مشاہدے کے بعد ایمان لانا بے نتیجہ ہے، کیوں کہ عذاب کے آثار عالم آخرت سے تعلق رکھتے ہیں، جب آخرت سامنے آ گئی تو اس پر ایمان لانا بے سود ہے۔نبی علیہ السلام کی تبلیغ سے آخرت کی مخفی حقیقت پر یقین کرنا اور ایمان لانا ضرور ہے۔

قرآن کریم نے فرعون کے متعلق کہا:

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ○ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ○ (یونس:۱۰)

''یہاں تک کہ جب فرعون غرقابی میں گرفتار ہوا تو بولا، میں اس خدائے وحدہٗ لاشریک پر ایمان لایا جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں، اس سے کہا گیا، اب ایمان لایا ہے؟ اور اب

تک نافرمان رہا اور تو فساد برپا کرنے والوں میں سے ہے۔"

فرعون کا دریائے نیل میں ڈوبنا ایک عام ہلاکت تھی، جو دوسرے بے قصور لوگوں کو بھی پیش آتی رہتی ہے۔ لیکن اس غرقابی میں فرعون کو خدا کے عذاب کی جھلک اور قہر آخرت کے آثار نظر آ گئے اس لیے اس کا ایمان رد کر دیا گیا۔

شیخ رحمہ اللہ نے مومن کے بارے میں جو بشارت دی ہے۔ اس میں علما کا اختلاف ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ نے امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا کہ کافر دوزخ میں جاتے ہوئے ایمان کی حالت میں ہوں گے لیکن ان کا ایمان مشاہدے والا ہوگا۔ غیب والا ایمان نہ ہوگا اس لیے آخرت کا ایمان ان کے حق میں مفید نہ ہوگا۔

اس کی دلیل کے طور پر شیخؒ نے فرمایا:

قرآن کریم کی آیت:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ○

(ذاریات:۵۶)

"اور اس نے جن اور انسان کو عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔"

اس آیت میں حضرت ابن عباسؓ کی قرأت لِيَعْبُدُوْنَ کی جگہ لِيُوَحِّدُوْنَ ہے یعنی تاکہ وہ میری وحدانیت کا اقرار کریں۔ یہ اقرار دنیا کی زندگی میں معتبر ہوگا۔ کیوں کہ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں ہوگا اور آخرت میں خدا اپنی تمام صفات رحم و کرم، جلالت و کبریائی اور عدالت و انصاف میں واحد واحد نظر آئے گا۔ اور ہر بڑی سے بڑی ہستی عبدیت و نیاز مندی کے ساتھ اس کے حضور میں کھڑی ہوگی۔

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ○ (مریم:۱۹)

"آسمان و زمین کی کل کائنات رحمٰن کے سامنے بندہ بن کر حاضر ہوگی۔"

اس طرح خدا کی وحدانیت ہر شخص کے مشاہدے میں آئے گی۔ تفسیر کی کتابوں

میں حضرت ابن عباسؓ کے الفاظ یہ ملتے ہیں:

اِلَّا لِيَقَرُّوْ الْعَبَادَتِيْ طَوْعًا وَّكَرْهًا.

(ابن کثیر، جلد ۴، صفحہ ۲۳۸)

"تاکہ وہ میری بندگی کا اقرار کریں، خوشی سے یا مجبوری سے۔"

بندگی کا اقرار خدا کی توحید ہی کے اقرار کے ہم معنی ہے۔ حضرت شیخؒ نے حضرت ابن عباسؓ کے تفسیری قول کا حاصل بیان کیا ہے۔

ابن جریجؒ تابعی کے الفاظ یہ ہیں۔ **اِلَّا لِيَعْرِفُوْنَ** تاکہ وہ مجھے پہچانیں۔ یہ معرفت ایمان ہے، اقرار بندگی ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ منکرین مشاہدۂ توحید کا زبانی اقرار کریں گے، لیکن ان کے اقرار و اعتراف کا انداز بھی کافرانہ ہوگا، مخلصانہ نہیں ہوگا، وہ کہیں گے۔

قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ. (انعام:۲۳)

"اے ہمارے آقا! آپ کی قسم ہے کہ ہم ہرگز مشرک نہیں تھے۔"

قرآن کہتا ہے:

اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ.

"اے مخاطب! دیکھ، یہ کس طرح اپنے بارے میں خود غلط بیانی کریں گے۔"

توبہ قریب کا مطلب کیا ہے؟

یہ بحث اصل میں قرآن کریم کی اس آیت سے شروع ہوتی ہے کہ قرآن نے کہا:

ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ. (نساء:۱۸)

"پھر وہ گناہ گار قریب ہی میں توبہ کر لیتے ہیں۔"

قریب کی تشریح اسی آیت کے اگلے فقرے میں یہ کی گئی:

حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ.

"یہاں تک کہ موت ان کے پاس آ گئی اور پھر انھوں نے توبہ کی تو وہ توبہ

ناقابل قبول ہے۔"

اب قریب اور شتاب کی تشریح میں مختلف احادیث ملتی ہیں۔

امام احمدؒ نے اپنی مسند میں عبدالرحمٰن ابن سلمانیؒ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک روز چار صحابی جمع ہوئے، ایک صحابی نے کہا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ قَبْلَ اَنْ يَّمُوْتَ بِيَوْمٍ.

"اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ مرنے سے ایک دن پہلے تک قبول کر لیتا ہے۔"

دوسرے صحابی بولے، میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ اَنْ يَّمُوْتَ بِنِصْفِ يَوْمٍ.

"اللہ تعالیٰ نصف یوم سے پہلے قبول کرتا ہے۔"

تیسرے صحابی بولے، میں نے یہ سنا ہے:

قَبْلَ اَنْ يَّمُوْتَ بِضَحْوَةٍ.

"مرنے سے ایک پہر (چوتھائی دن) پہلے۔"

چوتھے صحابی بولے، میں نے آپ سے یہ سنا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَالَمْ يُغَرْغِرْ بِنَفْسِهٖ.

"جب تک سانس رکنا شروع نہ ہو، سینے میں دم نہ گھٹنے لگے اور موت کے آثار، فرشتے اور برزخ کے احوال نظر نہ آنے لگیں اس وقت تک بندے کی توبہ قبول کی جاتی ہے۔"

ابوسعید خدریؓ کی روایت بہ حوالہ ابوداؤد شریف ابن جریرؒ نے یہ نقل کی ہے۔
آپ نے فرمایا ابلیس لعین قیامت تک زندہ رہنے کی مہلت مانگ کر خدا تعالیٰ کو یہ چیلنج کر کے چلا۔

يَارَبِّ وَعِزَّتِكَ لَا اَزَالُ اُغْوِيْهِمْ مَادَامَتْ اَرْوَاحُهُمْ فِيْ اَجْسَادِهِمْ فَقَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ، وَعِزَّتِيْ وَجَلَالِيْ، لَا اَمْنَعُهُ التَّوْبَةَ مَادَامَ فِيْهِ الرُّوْحُ.

"تیرے جلال کی قسم! جب تک تیرے بندوں کے جسم میں روح رہے گی میں انہیں بہکاتا رہوں گا۔ فرمایا، مجھے بھی اپنے جلال کی قسم! جب تک بندے میں روح رہے گی میں اس کی توبہ کو قبول کروں گا۔"

اس موت کی تعیین میں بھی حضرات صحابہ کرامؓ نے وسیع رحمت اور اس کے بے پایاں فضل و کرم کو سامنے رکھا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

مَابَيْنَهٗ وَبَيْنَ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰى مَلَكِ الْمَوْتِ.

"ملک الموت کے آنے تک قریب ہی کا اطلاق ہوگا۔"

امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں:

ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ مَالَمْ يُغَرْغِرْ.

"جب تک غرغرہ کی حالت پیدا نہ ہو اس وقت تک توبہ کرے، یہ قریب ہی کہلائی گئی۔"

حدیث میں جس حالت کو غرغرہ سے تعبیر کیا گیا ہے قرآن کریم میں اس کی دو تعبیریں اور بھی مذکور ہیں۔

سورۂ قیامہ میں اس حالت کو اس پیرائے میں بیان کیا گیا۔

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ○ وَقِيْلَ مَنْ رَاقٍ ○ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ○

"ہرگز نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب جان ہنسلی تک پہنچ جائے اور تیماردار مایوس ہو کر پکارنے لگیں کہ کون ہے جھاڑ پھونک کرنے والا؟ اور وہ بیمار یہ سمجھ رہا ہے کہ جدائی کا وقت آ پہنچا۔"

سورۂ واقعہ کا پیرایہ بیان یہ ہے:

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ○ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ○

"پھر کیوں نہیں جب جان حلق تک پہنچے اور تم تیماردار دیکھ رہے ہو اس بے بسی کی حالت کو اور ہم اور ہمارے فرشتے اس مرنے والے سے تم سے

زیادہ قریب ہوں اور تم ہمیں دیکھ نہ سکو، خدا تعالیٰ کا اور اس کے فرشتوں کا
قریب ہونا عالم آخرت کے مشاہدے کی صورت ہے۔"

اس حدیث میں عبد، بندہ سے مراد اکثر علما کے نزدیک مومن اور کافر دونوں
ہیں، اور اس تاویل کے مطابق روح انسانی کے گلے میں اٹکنے اور سانس اکھڑنے کے
وقت نہ مومن کی توبہ گناہوں سے قبول ہوتی ہے اور نہ کافر کی توبہ کفر سے قبول کی جاتی
ہے۔

ان حضرات کے نزدیک جب ایمان بالغیب ہی دراصل ایمان ہے تو اس میں
مومن اور کافر کے درمیان فرق کیسے ہوسکتا ہے؟

بعض علما عبد سے کافر بندہ مراد لیتے ہیں۔ ان حضرات کی دلیل حضرت ابوسعید
خدریؓ کی مذکورہ حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

لَا اَزَالُ اغْفِرُلَهُمْ مَاسْتَغْفَرُوْنِیْ (مشکوٰۃ:۲۰۴) میں

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے محدثین کی اسی جماعت کا مسلک پسند کیا ہے اور یہ
مسلک ایمان وصادق کے بارے میں جو وعدے اور بشارتیں اللہ تعالیٰ اور اس کے
رسول علیہ السلام سے منقول ہیں، اس سے مطابقت رکھتا ہے، ایک حدیث ہے۔

**اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا سَبَقَتْ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ مَنْزِلَةٌ لَمْ يَبْلُغْهَا
بِعَمَلِهٖ ابْتَلَاهُ اللّٰهُ فِيْ جَسَدِهٖ اَوْ فِيْ مَالِهٖ اَوْ فِيْ وَلَدِهٖ
ثُمَّ صَبَّرَهٗ عَلٰی ذَالِکَ حَتّٰی يَبْلُغَهُ الْمَنْزِلَةَ الَّتِیْ
سَبَقَتْ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ۔** (مشکوٰۃ:۱۳۷، بہ حوالہ ابوداؤد)

"بے شک اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کے لیے ایک مقام سعادت طے
کر دیتا ہے، یعنی تقدیر الٰہی میں اور وہ بندہ اپنے عمل سے اس مقام کے
قابل نہیں ہوتا اور اس درجے تک نہیں پہنچتا تو اللہ تعالیٰ اسے جسم یا مال یا
اولاد کے امتحان میں مبتلا کر دیتا ہے اور پھر اپنی طرف سے اسے صبر کرنے
کی توفیق دیتا ہے تو وہ اس طرح اپنے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے، جو اللہ
تعالیٰ کے ہاں اس کے لیے مقرر ہو چکا ہے۔"

یہ بشارت شیخ علیہ الرحمہ کی تائید کر رہی ہے۔

بندہ ناچیز نے ایمان صادق اور ایمان کامل کی برکتوں اور بشارتوں پر تفصیل سے
ایک مقالہ تحریر کیا ہے، اسے دیکھا جائے۔

شیخ علیہ الرحمہ نے ایمان بالغیب اور ایمان بالمشاہدہ کے درمیان فرق واضح
کرتے ہوئے مجلس ۲۳ جلد دوم میں بڑی تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے۔

جلد: ۲
۳۰ ویں مجلس:

سجدۂ ادب کے جواز کی بحث

مسئلے کی اہمیت کے سبب شیخ علیہ الرحمہ کی مبارک گفتگو ملفوظات کی اصل عبارت مع ترجمہ پیش کی جا رہی ہے:

''بعد ازاں خواجہ ذکر اللہ بالخیر دریں باب حکایت فرمود کہ دریں روز ھائ گذشتہ یکی آمدہ بود، مردی بزرگ زادہ بود سیاحت کردہ وشام وروم دیدہ، چوں بیامد و بنشست درین میان وحید الدین قریشی درآمد و چناں چہ رسم خدمت گار انست خدمتی کرد و سر بر زمین نہاد، آں مرد کہ نشستہ بود بانگ برزد۔ وبگفت کہ مکن سجدہ جائ نیامدہ است! ازیں بابت عربدہ کردن گرفت من نخواستم کہ با او مجیب شوم۔ چوں سخن بسیار شد و دریں باب غلو کرد ایں قدر با او گفتم کہ بشنو غلبہ مکن کہ ہر امری کہ فرض بودہ باشد چوں فرضیت برخیز د استحباب باقی می ماند چناں چہ روزہ ھائ ایام بیض وایام عاشورا بر امم ماضیہ فرض بود، در عہد رسول علیہ السلام چوں روزہ ماہ رمضان فرض شد آں فرضیت ایام بیض وایام عاشورا برخاست اما استحباب باقی ماند، آمدیم در سجدہ درمیان امم ماضیہ مستحب بود۔ چناں چہ رعیت مر بادشاہ را و شاگرد مر استاد را وامت مر پیغمبر را سجدہ می کردند، چوں عہد رسول علیہ السلام شد آں سجد برخاست اکنوں اگر استحباب رفت اباحت ماند اگر مستحب نہ باشد مباح باشد، بر مباح نفی ومنع کجا آمدہ است یکی

با من بگو ہمیں انکار صرف چہ کار راست؟ چوں ایں قدر گفتم او ساکت بماند، ہیچ جواب نتوانست گفت۔ خواجہ ذکر اللہ بالخیر چوں ایں حکایت تمام کرد فرمود کہ من پشیمان شدم کہ چرا ایں قدر سخن گفتم شاید بود کہ او خستہ دل شدہ باشد مرا نبایستی کہ بگفتمی، از دو چیز پشیمان شدم یکی آنکہ چرا ایں سخن با او گفتم کہ او ملزم شد دوم چوں او مسافر بود مرا می بایست کہ چیزی پیش اومی آوردم اگر از جامہ وسیم چیزی باومی دادم نیکو بودی، ازیں دو چیز مرا پشیمانی آمد۔ بعد ازاں در باب چیزی پیش آوردن فرمود کہ شیخ الاسلام فرید الدین قدس سرہٗ العزیز فرمودی کہ ہر کہ بریں کس آید باید کہ ایں کس بچیزی پیش آید۔"

"از نسبت ایں مباحثہ حکایت فرمود کہ وقتی پیری بخدمت شیخ الاسلام فرید الدین قدس اللہ سرہٗ العزیز آمد و گفت کہ من بخدمت شیخ قطب الدین بختیار طیب اللہ ثراہ بودہ ام شمار آں جا دیدہ ام۔ شیخ او را نمی شناخت، چوں او تعریف کرد آنگاہ شناخت، الغرض آں پیر یک جوانکی را برابر خود آوردہ بود و آں پسر او بود۔ دریں میاں سخن در سخن افتاد آں پسرک بی ادب وار در بحث در آمد و گستاخ وار با شیخ بحث کردن گرفت چناں کہ سخن بلند شد۔ شیخ ہم سخن بلند کرد۔ خواجہ ذکر اللہ بالخیر فرمود کہ من و مولانا شہاب الدین کہ پسر شیخ بود ہر دو بیرون درنشستہ بودیم، چوں غلبہ گونہ شد درون آمدیم، آں پسرک ہمچناں بی ادب وار سخن می گفت، مولانا شہاب الدین در آمد و آں پسرک را سیلی زد۔ پسرک طیرہ شد خواست کہ با مولانا۔ الیٰ آخرہ۔"

"اس کے بعد خواجہ ذکر اللہ بالخیرؒ نے اس بارے میں حکایت بیان فرمائی کہ انھی گزشتہ دنوں میں ایک شخص آئے بزرگ زادے تھے سیاحت کیے

ہوئے اور شام و روم دیکھے ہوئے، جب وہ آ کر بیٹھے تو اسی دوران وحید الدین قریشی آئے اور جیسا کہ خدمت گاروں کی رسم ہے، آداب بجالائے اور سر زمین پر رکھا۔ یہ صاحب جو بیٹھے تھے پکار کر بولے کہ ایسا نہ کرو۔ سجدے کی اجازت کہیں نہیں آئی ہے۔ اس بارے میں جھگڑا کرنے لگے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ انھیں جواب دوں۔ (لیکن) جب بات بہت بڑھ گئی اور وہ اس بارے میں بہت غلو کرنے لگے تو میں نے ان سے بس اتنا کہا کہ سنو اودھم مت مچاؤ، جو بات بھی کبھی فرض رہی ہو جب اس کی فرضیت چلی جاتی ہے تو استحباب باقی رہتا ہے، جیسا کہ ایام بیض اور ایام عاشورہ کے روزے ماضی کی امتوں پر فرض تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چوں کہ ماہ رمضان کا روزہ فرض ہوا تو وہ ایام بیض اور ایام عاشورہ کے روزے کی فرضیت اٹھ گئی، لیکن استحباب باقی رہا۔ اب سجدے پر آتا ہوں، ماضی کی امتوں میں یہ مستحب تھا۔ چناں چہ رعیت بادشاہ کو اور شاگرد استاد کو اور امت پیغمبر کو سجدہ کیا کرتی تھی، جب عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آیا تو یہ سجدہ نہ رہا۔ البتہ اگر استحباب چلا گیا تو اباحت تو رہی۔ اگر مستحب نہیں تو مباح ہوگا۔ مباح سے انکار اور ممانعت کہاں سے آئی ہے؟ کوئی ایک ہی مجھے بتادو خالی انکار سے کیا ہوتا ہے؟ جب میں نے یہ کہا تو وہ چپکے ہوئے اور کوئی جواب نہ دے سکے۔ خواجہ ذکر اللہ بالخیرؒ یہ حکایت پوری فرما چکے تو ارشاد کیا کہ میں پشیمان ہوا کہ میں نے اتنی بات بھی ان سے کیوں کہی جس سے وہ دل شکستہ ہو گئے ہوں مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ دو چیزوں سے میں پشیمان ہوا ایک تو اس چیز سے کہ ان سے ایسی بات کیوں کہی جس سے ان کی گرفت ہوئی دوسرے یہ کہ وہ مسافر تھے اس لیے مجھے انھیں کچھ دینا چاہیے تھا۔ اگر کپڑا یا نقدی یا اور کوئی چیز ان کو دیتا تو اچھا ہوتا۔ انھی دو چیزوں سے مجھے پشیمانی ہوئی۔ اس کے بعد کسی کو کچھ پیش کرنے کے بارے میں فرمایا کہ شیخ الاسلام فرید الدین قدس سرہٗ العزیز نے فرمایا تھا جو

بھی تمہارے پاس آئے تمھیں چاہیے کہ اس کو کچھ دو۔"

"اس مباحثے کی مناسبت سے حکایت بیان فرمائی کہ ایک دفعہ کوئی بوڑھا شیخ الاسلام فرید الدین قدس اللہ سرہٗ العزیز کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میں شیخ قطب الدین بختیار طیب اللہ ثراہ کی خدمت میں رہا ہوں اور آپ کو وہاں دیکھا ہے، شیخ نے اسے نہیں پہچانا جب اس نے مزید تعارف کرایا تو پہچانا۔ الغرض یہ بوڑھا ایک جوان کو بھی ساتھ لایا تھا اور وہ اس کا لڑکا تھا۔ اس درمیان بات میں سے بات نکلی تو اس لڑکے نے بے ادبی سے حجت کی اور گستاخی کے انداز میں شیخ سے بحث کرنی شروع کی اس طرح کہ اونچا بولا۔ شیخ نے بھی آواز بلند فرمائی۔ خواجہ ذکر اللہ بالخیرؒ فرماتے ہیں کہ میں اور مولانا شہاب الدینؒ جو شیخ کے صاحب زادے تھے، ہم دونوں دروازے کے باہر بیٹھے تھے۔ جب زیادہ شور ہوا تو اندر آئے وہ لڑکا بے ادبی سے گفتگو کر رہا تھا۔ مولانا شہاب الدینؒ نے اندر آکر اس لڑکے کے طماں چہ مارا۔ لڑکے نے غصے ہو کر چاہا کہ مولانا سے بے ادبی کرے، میں نے اس لڑکے کے ہاتھ پکڑ لیے۔ اس درمیان شیخ کبیر قدس سرہ نے فرمایا۔ صلح صفائی کرو۔ مولانا ایک عمدہ کپڑا اور کچھ نقدی لائے اور ان دونوں کو وہ سامان دے کر انھیں رخصت کر دیا۔

اب یہ مسئلہ باقی رہا کہ سجدہ تحیتہ باوجود شرک جلی نہ ہونے کے شریعت اسلامیہ میں کیا حیثیت رکھتا ہے؟

شیخ علیہ الرحمہ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ تعظیمی رسم فعل مباح کی حیثیت رکھتی ہے۔ تصوف میں اس فعل کے مباح قرار دینے کی مصلحت پر ملفوظات کے مرتب خواجہ حسن سجزی علیہ الرحمہ نے شیخ علیہ الرحمہ کے سامنے ان الفاظ میں روشنی ڈالی، شیخ علیہ الرحمہ نے فرمایا:

"بر من خلق مے آید و روے بر زمین مے آرد۔"

"میرے پاس لوگ آتے ہیں اور زمین پر سر رکھتے ہیں تو میں انھیں منع

نہیں کرتا کیوں کہ حضرت قطب صاحبؒ اور بابا صاحب علیہ الرحمہ منع نہیں کیا کرتے تھے۔" (فوائد:۷۴۰)

شیخ حسنؒ نے عرض کیا:

"ایں کس کہ پیش مخدوم مے آید و روے بر زمین مے آرد، اور امزیدی حاصل مے شود و نفس اور مے شکند اما مخدوم بزرگ کردہ خدا ایست عزوجل، بزرگی اور بخدمت کردن مرید متعلق نیست۔" (۷۳۲)

"اگر کوئی شخص مخدوم کے سامنے آتا ہے اور زمین پر سر رکھتا ہے تو اس فعل سے اسے کچھ حاصل ہوتا ہے اور اس کی نفسانیت ٹوٹتی ہے اور مخدوم (شیخ علیہ الرحمہ) تو خدا تعالیٰ کی طرف سے محترم بنائے گئے ہیں، آپ کی بزرگی کسی مرید کے احترام کرنے پر موقوف نہیں ہے۔"

خواجہ حسنؒ نے کس خوب صورتی کے ساتھ اس رسمی فعل تعظیم کی مصلحت پر روشنی ڈالی ہے اور اس رسمی تعظیم کو عبادت الٰہی (حقیقی تعظیم) سے الگ کیا ہے، علما اور صوفیا دونوں طبقوں میں حضرت امام حسن بصری علیہ الرحمہ کی علمی اور روحانی جلالت وعظمت مسلم ومشہور ہے، حضرت امام باقر ابن امام زین العابدینؒ فرماتے تھے:

"حسن کا کلام حضرات انبیا کرام کے کلام سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔"

حضرت امام حسن بصریؒ قرآن کریم کی صفت **شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ** (یونس:۵۷) کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ قرآن کریم کی یہ صفت بتا رہی ہے کہ قرآن مجید کے نزول کا اصلی مقصد روحانی بیماریوں کا علاج ہے، جسمانی بیماریوں کا علاج نہیں۔ (معارف القرآن، جلد۴، صفحہ۵۴۲، بہ حوالہ روح المعانی)

حضرت امامؒ قرآن کریم سے شفائے جسمانی کے حصول کی نفی نہیں فرما رہے، بلکہ اسے مقصد نزول سمجھنے کی تردید فرما رہے ہیں اور مسلمانوں کو اصلی مقصد کی طرف توجہ قایم رکھنے کی ہدایت فرما رہے ہیں اور یہ ہدایت سد باب کے اصول پر ہے۔ یعنی برائی کا دروازہ بند کرنا اور حضرت کے امام کے سامنے وہ دور فتن ہے جس میں

مسلمانوں نے قرآن کریم کے اصلی مقصد کو پس پشت ڈال کر اسے صرف عملیات کی ایک کتاب بنا کر رکھ دیا ہے۔

محدثین اور فقہائے اسلام کا طبقہ منکرات شرعی کی روک تھام کے لیے ''سدباب'' کے فقہی اصول کے مطابق حزم واحتیاط کی جس مصلحت پر نظر رکھتا ہے۔ وہ اصول صوفیائے ربانی کے پیش نظر بھی رہا ہے۔

امام العارفین شیخ ابن عربی علیہ الرحمہ نے اپنی مشہور کتاب فتوحات مکیہ میں اسی اصول پر یہ تحریر فرمایا ہے:

''مومن کے حق میں سب سے بڑی دینی آزمائش یہ ہے کہ قرآن کریم نے کہا ہے **وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ** (یوسف:۱۰۶) اکثر لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے مگر اسی کے ساتھ وہ شرک بھی کرتے ہیں۔ میں اشارے کے طور پر کہتا ہوں کہ اس آیت میں شرک سے شرک خفی مراد ہے جو ایمان کے ساتھ جمع ہو جاتا ہے۔''

(فتوحات، جلد۴، صفحہ۵۹۳)

مطلب یہ کہ جو امور شرک خفی کی حیثیت رکھتے ہیں، یعنی شرک جلی کے ساتھ شکل ظاہری اور صورت ظاہری میں مشابہت رکھتے ہیں اور جن کے ارتکاب سے شرک جلی کے پھیلنے کا اندیشہ اور خطرہ ہوتا ہے، وہ مسلمانوں کے حق میں بڑی آزمائش ہیں۔

شیخ علیہ الرحمہ کا انقباض:

جلد۴، مجلس ۶۶، صفحہ۹۱۲، میں خواجہ حسن سجزی علیہ الرحمہ نے اپنے شیخ کے سامنے اس رسم ادب کا ذکر چھیڑا اور ان الفاظ میں چھیڑا:

''مریداں بخدمت مخدوم مے آیند و سر بر زمین مے نہند خواجہ ذکرہ اللہ الخیر فرمود کہ من مے خواستم کہ خلق را منع کنم اما چوں پیش شیخ من ہم چنیں کردہ اند، منع نہ کردم۔''

''مخدوم محترم کی خدمت میں مرید حاضر ہوتے ہیں اور زمین پر سر رکھتے

ہیں، خواجہ علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ منع کروں مگر چوں کہ میرے شیخ کے سامنے ایسا ہوتا تھا اور وہ منع نہیں فرماتے تھے اس لیے میں بھی منع نہیں کرتا۔''

پہلی بات تو یہ کہ مرتب علیہ الرحمہ نے بھی اپنے شیخ کی پیروی میں سجدۂ تعظیمی کی تعبیر سے احتراز فرمایا اور ''سر بر زمین مے نہند'' کہہ کر یہ مسئلہ چھیڑا۔

دوسری بات یہ کہ شیخ علیہ الرحمہ نے اس موقع پر جو الفاظ فرمائے ان سے شیخ علیہ الرحمہ کے اس مسئلے کے بارے میں انقباض پیدا ہونے کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ منع کروں مگر اپنے شیخ کی پیروی مجھے روک دیتی ہے۔

یہ فقرے شیخ علیہ الرحمہ کی علمی بصیرت کی دلیل ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایک فعل مباح سے اگر کسی فعل منکر کا شبہ پیدا ہوتا ہے تو سدباب کے اصول پر اس سے احتراز کی ضرورت پیدا ہو جاتی ہے، اس گفتگو کے دوران شیخ علیہ الرحمہ کے قلب مبارک میں اس مصلحت دینی کا القا ہوا۔ جس کا اظہار شیخ علیہ الرحمہ نے صاف صاف فرما دیا۔

اسی مجلس میں شیخ علیہ الرحمہ نے حضرت بابا صاحب علیہ الرحمہ کے حوالے سے شیخ ابوسعید ابوالخیر علیہ الرحمہ کا یہ واقعہ نقل فرمایا کہ شیخ اپنے گھوڑے پر تشریف لے جا رہے تھے کہ ایک مرید آیا اور اس نے شیخ کے گھٹنوں کو بوسہ دیا، شیخ نے فرمایا، فروتر، اور نیچے، اس نے شیخ کے قدم چوم لیے، شیخ نے پھر فرمایا، فروتر، اور نیچے اس نے گھوڑے کے زانو کو بوسہ دیا۔ شیخ نے پھر فرمایا، فروتر، اب اس نے زمین کو بوسہ دیا، اب شیخ نے فرمایا:

''دریں چہ ترا فرمودم کہ فروتر فروتر مقصود من نہ بوسیدن زمین بودہ است، تو ہر چہ فروتر مے شدی درجہ تو بالاتر مے شدی۔''

''میں نے اور نیچے اور نیچے کا حکم اس لیے نہیں دیا کہ میرا مقصود زمین کو بوسہ دینا تھا بلکہ بات یہ تھی کہ تو جتنا نیچے جھکتا تھا۔ اتنا ہی تیرا درجہ بلند ہوتا تھا۔''

یہ وہی مصلحت ہے جس کو شیخ حسن سجزیؒ نے نفس شکنی اور نفسانیت کا ٹوٹنا قرار دیا ہے۔

زمین بوسی کی درباری رسم:

ان حضرات مشائخ کے دور میں دربار شاہی میں تعظیم بجالانے کے طور پر زمین پر سر رکھنے کی رسم عام تھی، اور اس رسم سے گریز کرنے کو شاہی آداب کی خلاف ورزی قرار دیا جاتا تھا۔ وہی رسم تعظیم بزرگوں کے سامنے بھی ادا کی جاتی تھی اور ظاہر ہے کہ جو شخص اس رسم سے گریز کرتا ہوگا، اس کے اس رویے کو بے ادبی شمار کیا جاتا ہوگا۔

ان بزرگوں کی طرف سے اس تعظیمی رسم کی ممانعت پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا تھا اس کی وجہ کیا تھی؟

یہ بات ہمیں حضرت سید حسن رسول نما علیہ الرحمہ کی ایک مجلس کی روداد سے معلوم ہوئی۔ حضرت سید صاحبؒ عہد عالم گیری کے مشہور صاحب علم و روحانیت ولی تھے۔ آپ کی سوانح عمری آپ کے شاگرد و مرید سید میر ہاشمؒ نے دو جلدوں میں مرتب کی جو اردو ترجمے کی صورت میں (فوائح العرفان، فیضان حسن رسول نما) پاکستان سے شایع ہوئی ہیں۔

سید صاحبؒ کی خاص دوستی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب محدث دہلویؒ کے ساتھ تھی اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ یہ دونوں بزرگ ایک چارپائی پر بیٹھ کر دیر تک گفتگو کیا کرتے تھے، عقاید میں سید صاحب محدثانہ تصورات کے حامل تھے۔

چناں چہ علم غیب محیط اور کلی کو ذات حق تعالیٰ کے ساتھ خاص قرار دیتے تھے۔ آپ کی ایک مجلس میں شاہ دولہ گجراتی (پنجاب) کا تذکرہ چھڑا، مجلس میں ایک سپاہی موجود تھا۔ اس نے شاہ دولہ کے بارے میں بتایا کہ ایک روز میرے سامنے شیخ دولہ کی مجلس میں ایک نقشبندی بزرگ تشریف لائے، شیخ کی مجلس میں زمین بوسی کی تعظیمی رسم کو دیکھ کر نقشبندی بزرگ نے فرمایا، یہ کیسی درویشی ہے کہ لوگ آپ کو سجدہ کریں اور آپ انھیں منع نہ کریں؟ شیخ دولہ نے پنجابی زبان میں فرمایا: میرے بھائی، میں تو

بہت منع کرتا ہوں، مگر یہ لوگ باز نہیں آتے، میں تو ایک غلام ہوں مجھے ڈر ہے کہ اگر میں زیادہ زور دوں گا تو یہ لوگ مجھ پر زیادتی کریں گے آپ انھیں ضرور منع کریں، آپ تشریف فرماہیں۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک راجپوت فوجی سردار اپنے چند ساتھی سپاہیوں کے ساتھ مجلس میں آیا اور اس نے دستور کے مطابق زمین پر سر رکھ دیا، یہ فوجی بادشاہ دہلی کی طرف سے کابل میں مقرر کیا گیا تھا۔ کابل جاتے ہوئے شیخ دولہ کی زیارت کرنے گجرات حاضر ہوا۔ شیخ نقشبندی نے اس فوجی کو زمین بوسی سے منع کیا۔ اس کے ساتھیوں نے شیخ پر تلواریں سوت لیں اور شیخ کے ساتھ بدتمیزی کی، شیخ اس وقت اگر سانس بھی لیتے تو وہ ان کو قتل کر دیتے۔ شیخ گھبرا گئے۔ اتنے میں اس فوجی سردار نے سر اٹھالیا اور بات دب گئی اور وہ نذر پیش کر کے چلا گیا۔ یہ راجپوت سپاہی راجہ مان سنگھ تھا جو اکبر کی فوج کا سپہ سالار تھا۔

شیخ نے کہا، میرے بھائی! تم نے دیکھا، یہ راجپوت سپاہی ہم دونوں کو قتل کر دیتے، وہ سپاہی جب یہ واقعہ نقل کر چکا تو مرتب فیضان حسن رسول نما (سید نجیب الدین) نے کہا، حضرت! شاہ دولہ نے بہت جلدی اپنی کرامت دکھادی، سید صاحب نے فرمایا: ہاں، اس میں کیا شک ہے۔ (فیضان حسن رسول نما: ۳۰)

مطلب یہ کہ شاہ دولہ نے اس واقعہ کی صورت میں نقشبندی بزرگ کے سامنے اپنے جواب کی عملی تصدیق پیش کر دی۔ حاصل یہ نکلا کہ زمین بوسی یا قدم بوسی کا رواج اس دور میں ایک تعظیمی رواج کے طور پر اتنا عام تھا کہ اس کی مخالفت کو شاہی آداب کی خلاف ورزی اور شاہی احترام سے سرکشی سمجھا جاتا تھا۔ بزرگوں کے ہاں بھی یہ رسم جاری ہوگئی۔ اور ان بزرگوں نے اس رسم کو کوئی پسندیدہ فعل نہیں سمجھا بلکہ ایک عام رواج کے طور پر اسے برداشت کیا۔

قدم بوسی کے مسئلے میں کمال احتیاط:

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے زمین بوسی یا زمین پر سر رکھنے کے مسئلے میں جو احتیاط

اختیار کی ہے وہ بھی سماع کے مسئلے میں کمال احتیاط کی طرح ہے۔

(۱۸۸) مجلسوں میں شیخ علیہ الرحمہ اور شیخ کے فاضل مرید خواجہ حسن علیہ الرحمہ نے کسی گفتگو میں سجدے کا لفظ زبان مبارک پر نہیں آنے دیا۔ کیوں کہ صحیح احادیث میں مطلق سجدے کی ممانعت مذکور ہے۔

بزرگ زادہ کے ساتھ مباحثہ کے دوران سجدے کا لفظ استعمال فرمایا، کیوں کہ سجدۂ تحیۃ کی اباحت اور جواز بتانا مقصود تھا۔ اگر آنے والے بزرگ زادے سے یہ بحث نہ چھیڑتے تو شیخ علیہ الرحمہ اس فعل کو ''رسم ادب'' کے نام سے متعارف کراتے پھر قدم بوسی (جو زمین پر سر رکھنے کی صورت ہے) کے ثبوت میں احادیث کے اندر وفد عبدالقیس کے ممبران کا یہ بیان موجود ہے۔

لَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِيْنَةَ فَجَعَلْنَا نَتَبَادَرُ مِنْ رَوَاحِلْنَا فَنَتَقَبَّلُ يَدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَجْلِهٖ. (مشکوۃ:۴۰۲، بہ حوالہ ابوداؤد)

''ہم جب مدینہ آئے تو ہم اپنی سواریوں سے اتر کر جلدی کے ساتھ آگے بڑھے اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک اور آپ کے قدم مبارک کو بوسہ دیا۔''

کس قدر احتیاط کی بات ہے کہ شیخ علیہ الرحمہ زمین بوسی اور قدم بوسی کے جواز میں اس روایت کا چرچا نہیں کرتے صرف یہ فرماتے ہیں کہ میرے مشائخ کے ہاں ایسا ہوتا تھا اور وہ اسے منع نہیں کرتے تھے۔

''بعد ازاں فرمود کہ بر من خلق مے آید و روے بر زمین مے آرد چون پیش شیخ الاسلام فرید الدین و شیخ قطب الدین قدس اللہ روحہما العزیز منع نہ بود من ہم منع نمے کنم۔'' (مجلس ۳۰، جلد ۴، صفحہ ۲۰ ۷)

میں بھی منع نہیں کرتا۔

گفتگو کا انداز یہ بتا رہا ہے کہ متکلم کو ذاتی طور پر اس فعل سے شرح صدر نہیں ہے، ورنہ وہ متکلم رحمہ اللہ اپنی ذاتی رائے کے طور پر مدلل انداز میں زمین پر سر رکھنے کی بات

فرماتے۔

تفصیلی بحث:

۱۔ پہلی بات تو یہ واضح رہے کہ حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے اس تعظیمی فعل کو سجدہ تعظیمی کے الفاظ سے تعبیر نہیں فرمایا بلکہ فرمایا: ''رسم خدمت گار و سر بر زمین نہاد۔'' یعنی آنے والے نے خدمت گاروں کی رسم ادا کی اور زمین پر سر رکھ دیا۔ اعتراض کرنے والے بزرگ زادے نے اس رسمی آداب بجالانے پر سجدے کے ناجائز ہونے کی بحث چھیڑ دی۔

شیخ علیہ الرحمہ نے زمین پر سر رکھنے کے فعل پر شرعی لفظ سجدے کے اطلاق سے پرہیز فرمایا۔ کیوں کہ سجدہ ایک شرعی اصطلاح ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہے:

قَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُمِرْتُ اَنْ اَسْجُدَ عَلٰى سَبْعَةِ اَعْظَمٍ، عَلَى الْجُبْهَةِ وَاَشَارَ بِيَدِهٖ اِلَى الْاَنْفِ وَالْيَدَيْنِ وَالرُّكْبَتَيْنِ وَاَطْرَافِ الْقَدَمَيْنِ.

(ابن کثیر، جلد ۴، صفحہ ۴۳۲)

''مجھے خدا کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کہ میں سات ہڈیوں پر سجدہ کروں، پیشانی یعنی ناک پر دونوں ہاتھوں پر دونوں گھٹنوں پر اور دونوں قدموں کی انگلیوں پر۔''

یہ سجدے کی ظاہری شکل ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ سجدۂ عبادت کی طرف ہے جس میں بندہ اپنی انتہائی عاجزی کے اظہار کے ساتھ اپنے مسجود (حق تعالیٰ) کی انتہائی عظمت کا اظہار کرتا ہے۔ یہ سجدہ بلا اختلاف خدا تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کے سامنے جائز نہیں ہے۔ اب رہی تعظیمی طور پر سر جھکانے کی صورت، جسے عرف عام میں تعظیمی سجدہ، سجدۂ تحیۃ یا سجدۂ ادب کہا جاتا ہے، تو حقیقی سجدہ اور مشابہ سجدۂ فعل کے بارے میں نیت اور قصد کے ذریعے فیصلہ کیا جائے گا۔ محقق اسلام امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنے اہم کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں اس پر بحث کرتے ہوئے

لکھتے ہیں:

''عبادت انتہائی طور پر عاجزی کے اظہار کا نام ہے، یہ تذلل اور اظہار ذلت دو صورتوں میں ہوتا ہے، ایک ظاہری عمل کے ذریعے یعنی قیام اور سجدہ کھڑے ہونے اور سر جھکانے کے ذریعے، دوسرے نیت و ارادے کے ذریعے۔''

وَلَمَّا ثَبَتَ سُجُوْدَ التَّحِيَّةِ مِنَ الْمَلٰئِكَةِ لِاٰدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَمِنْ اِخْوَةِ يُوْسُفَ لِيُوْسُفَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَاَنَّ السُّجُوْدَ اَعْلٰى صُوْرَةِ التَّعْظِيْمِ وَجَبَ اَنْ لَّا يَكُوْنَ التَّمِيْزُ اِلَّا بِالنِّيَّةِ. (حقیقت الشرک:۶۰)

''اور جب یہ بات ثابت ہے کہ ملائکہ نے حضرت آدم کو سجدۂ تحیۃ (ادب) کیا اور برادران یوسف نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کیا اور سر جھکانا اور سجدہ کرنا تعظیم کی انتہائی اعلیٰ شکل ہے۔ تو ضروری ہوا کہ نیت و ارادے کے ذریعے امتیاز کیا جائے۔''

یعنی قیام اور سجود کے ظاہری افعال تعظیم میں اگر فاعل کی نیت یہ ہے کہ وہ اس ہستی کے سامنے جھک رہا ہے جو کائنات ہستی میں سب سے زیادہ عزت و عظمت کی مستحق ہے یعنی خداوند عالم، تو یہ فعل عبادت ہوگا۔

بت پرست اپنے بتوں کو اسی عقیدے کے ساتھ سجدہ کرتے ہیں کہ وہ خدا کی عظمت اور اس کی صفت کارسازی و کارفرمائی میں شریک ہیں اور ہماری بندگی کے مستحق ہیں، اس لیے ان کا سجدہ شرک و کفر ہے۔

اور اگر رعایا اپنے بادشاہ کے سامنے اور شاگرد اپنے استاد کے سامنے سر جھکاتا ہے یا قیام کرتا ہے اور اس کی نیت ایک بادشاہ اور استاد کی خدمت میں ادب واحترام کی ہوتی ہے اور وہ اپنے مولیٰ و مالک حقیقی کی عظمت کا تصور بھی بادشاہ واستاد کے اندر نہیں کرتا تو یہ فعل سجدہ حقیقی نہیں ہے صرف اظہار ادب ہے۔ جس پر شرک کا حکم نہیں لگایا جاتا۔ (ملخص از حجۃ اللہ)

جلد:۳

۲۸ویں مجلس:

شیخ علیہ الرحمہ اور حج بیت اللہ

شیخ المشائخ علیہ الرحمہ نے حج بیت اللہ شریف ادا نہیں کیا اور حج بیت اللہ کا جو مقصود ہوتا ہے اس کا بدل یہ بیان فرمایا:

''چوں بزیارت شیخ الاسلام رسیدم آں مقصود مرا حاصل شد مع زائد۔''

''میں جب شیخ الاسلام حضرت بابا صاحبؒ کی زیارت سے مشرف ہوا تو وہ مقصود مجھے کچھ زیادتی کے ساتھ ہی حاصل ہوگیا۔''

شیخ علیہ الرحمہ نے حج بیت اللہ ادا نہ کرنے کی شرعی وجہ اور فقہی سبب بیان کرنے کے بجائے یہ بتایا کہ حج بیت اللہ کا جو مقصود ہے یعنی مرکز انوار وحدت و نبوت کی زیارت کا شرف وہ مجھے مظہر انوار کی زیارت سے حاصل ہوجاتا ہے۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی ''مع زائد'' کے لفظ سے مظہر حقیقت کو اصل حقیقت پر فضیلت دینا نہیں ہے بلکہ اس میں ایک لطیف حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ ہے کہ بے استطاعت مسلمان دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک بے استطاعت ہونے کے ساتھ بے طلب و لاپرواہ ہیں۔ دوسرے بے استطاعت ہیں لیکن ان کے اندر طلب واشتیاق کا جذبہ بھی ہے۔

فضائل کی ایک روایت میں آتا ہے کہ جو مسلمان حج کی استطاعت سے محروم ہو مگر زیارت حرم کا شوق وجذبہ اس میں موجود ہو اور اسی جذبے کے ساتھ وہ خدا کو پیارا ہوجائے تو اللہ تعالیٰ اس کی روح کو قیامت تک حج کی عبادت سے سرفراز کرتا رہے گا۔

دلم بکوے تو باصد ہزار نو میری
بایں خوشست کہ امید وار مے گذرد

شیخ علیہ الرحمہ اشارہ کر رہے ہیں کہ اگر کوئی عزیمت کا اہل نہیں ہے تو اسے شوق و جذبے کے ساتھ رخصت پر عمل کرنا چاہیے۔ بے نیاز و لا پرواہ ہو کر نہ بیٹھنا چاہیے۔ اس کا جذبہ شوق جتنا بڑھے گا۔ اس کا پیاس کے لیے سیرابی کا سامان اتنا ہی زیادہ مہیا کیا جائے گا۔

شیخ علیہ الرحمہ کا مطلب (مع زیادہ سے) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حج کی اصل عبادت میں شرعی قیود اور شرائط کی پابندیاں ہیں۔ ان میں اگر کوتاہی ہوتی ہے تو حصول مقصود پر اس کا اثر پڑتا ہے اور شیخ کامل و صادق کی زیارت قیود و شرائط کی پابندیوں سے آزاد ہے۔ صرف جذبہ شوق کی ضرورت ہے۔ جتنا زیادہ ہو، اتنا ہی حصول مقصود ہوگا۔

خواجہ حسنؒ جو اس جواب کے مخاطب ہیں وہ اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ رہے تھے کہ شیخ علیہ الرحمہ استطاعت حج کے بڑے رکن (مال و دولت) کے حامل نہیں ہیں۔ اس لیے شیخ علیہ الرحمہ نے حج نہ کرنے کی سیدھی سادھی شرعی وجہ بیان کرنے کے بجائے ایک ذوقی وجہ بیان کردی۔ مخاطب عقیدت مند ہے۔ وہ اس عقیدت مندانہ روحانی توجیہ سے لطف اندوز ہوگا۔

شیخ علیہ الرحمہ کی خانقاہ میں دولت و ثروت کے دریا بہتے تھے۔ لیکن ادھر سے آتے تھے اور ادھر نکل جاتے تھے۔ دولت کو شیخ علیہ الرحمہ کے پاس ٹکنے کی اور ٹھہرنے کی جرأت نہیں تھی۔ شیخ علیہ الرحمہ نے مال و دولت کے بارے میں اپنے اور اپنے شیخ بابا صاحبؒ کے ذوق کی وضاحت کرتے ہوئے ایک حدیثِ نبوی اور اس کی تائید میں ایک قول حضرت علی کرم اللہ وجہہ بیان کر کے فرمایا:

"مال و دولت ہر پہلو سے وبال ہے، حلال ہو تو حساب دو، حرام اور مشتبہ ہو تو عذاب جہنم کے لیے تیار رہو۔" (جلد اول، مجلس ۳۴)

شیخ علیہ الرحمہ صوفیائے ربانی کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جس پر فقر و غربت کا غلبہ تھا اور اسی پر انھیں فخر تھا۔

اگرچہ زیب سرش افسر و کلاہے نیست
گدائے کوئے تو کمتر ز پادشاہی نیست

رہی یہ صورت کہ اصحاب ثروت کی امداد و اعانت سے حج کا فریضہ ادا کیا جائے تو جہاں یہ تصور استغنا ہو:

"اما اگر نا خواستہ و نا اندیشیدہ بروے چیزے برسد، آں جائز باشد۔"

بہر حال اگر بغیر چاہے اور بغیر سوچے اور بغیر انتظار کیے کوئی نعمت آجائے تو وہ جائز ہے۔ اسے اصطلاح میں اشراف نفس کہا جاتا ہے۔ اس استغناء کے ساتھ کسی دوسرے کے مال سے حج کرنا اور دوسروں کا احسان لے کر عبادت کے لیے جانا یہ اہلِ حقیقت پر گراں نہیں ہوگا؟ قرآن کریم نے ان لوگوں سے کہا جو بغیر شرط استطاعت کے حج کے لیے گھروں سے نکل جاتے تھے اور پھر لوگوں سے بھیک مانگ کر فرض ادا کرتے تھے؟

وَتَزَوَّدُوا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ○ (البقرۃ:۱۹۷)

"زاد راہ تیار کرو اور بہترین زاد راہ پرہیزگاری اختیار کرنا ہے۔ جس کا تقاضا استغنا ہے۔"

رہی بات یہ کہ شیخ علیہ الرحمہ کے نزدیک شریعت کے احکام کا کس درجہ احترام تھا تو ہم نے اسے علاحدہ باب میں تحریر کیا ہے۔

اصحاب فقر و استغنا میں مشہور نقشبندی بزرگ حضرت خواجہ باقی اللہؒ کا واقعہ ہے کہ آپ نے اکبر کے امیر خان خاناں کی مالی امداد یہ کہہ کر واپس کردی تھی کہ میں اس مال سے حج نہیں کروں گا جس سے مخلوق خدا کے حقوق متعلق ہیں۔

خان خاناں کو یہ پتہ چلا تھا کہ حضرت خواجہ صاحبؒ نے حج کرنے کی آرزو کا اظہار کیا ہے۔ یہ سن کر اس نے ایک بڑی رقم آپ کے اور آپ کے رفقا کے حج کے لیے بھیج دی تھی۔ (حضرات القدس: ۲۷۵)

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ نے بھی حج ادا نہیں کیا، اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ آپ امرائے حکومت کی مالی امداد سے عبادت ادا کرنا اچھا نہیں سمجھتے تھے جب کہ

شریعت نے فرض قرار نہ دیا ہو۔

مشہور جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے:

لَاَنْ اَعُوْلَ اَهْلَ بَيْتٍ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ شَهْرًا اَوْ جُمُعَةً اَوْ مَاشَآءَ اللّٰهُ اَحَبُّ اِلَىَّ مِنْ حَجَّةٍ بَعْدَ حَجَّةٍ۔

(کنز کتاب الحج)

”میں ایک مسلمان خاندان کی کفالت کروں، ایک مہینہ، ایک ہفتہ یا جب تک اللہ چاہیے یہ عمل میرے لیے حج کے بعد حج کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔“

آپ کا اشارہ فرض حج کے بعد نفلی حج ادا کرنے کی طرف ہے۔

پھر وہ اہلِ اللہ جن کا خاندان خدا کی تمام مخلوق ہوتا ہے اور **اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ** (مخلوق خدا کا کنبہ ہے) جن کا جذبہ ہوتا ہے وہ اپنے اس وسیع کنبے کی کفالت سے بچا کر۔ حج بیت اللہ کے لیے مال کس طرح جمع کر سکتے ہیں؟

شیخ ابن عربی کا واقعہ ہے کہ شیخ بغداد کی ایک دکان سے حج کے لیے سامان خرید رہے تھے کہ ایک برقعہ پوش بڑھیا سامنے کوڑی کے اوپر سے ایک مردہ مرغی اٹھا کر لے جاتی ہوئی نظر آئی۔

شیخ اس سے بڑے متاثر ہوئے اور سامان کی خریداری چھوڑ کر اس بڑھیا کے پیچھے پیچھے گئے، وہ بڑھیا ایک بوسیدہ مکان میں داخل ہوگئی، شیخ نے دستک دے کر اسے بلایا، اس کی وجہ پوچھی، وہ بولی، میرے بچے کئی دن سے بھوکے ہیں۔ اب میں اس مردہ مرغی سے ان کی جان بچاؤں گی۔

شیخ پر رقت طاری ہوگئے، صاحب دل تھے، حج کا تمام زادراہ اسے دے کر گھر واپس چلے گئے۔ حج سے واپس آنے والے کچھ لوگ شیخ کو مبارکباد پیش کرنے حاضر ہوئے، شیخ نے انکار کیا اور کہا کہ میں تو واپس آگیا تھا۔

انھوں نے کہا، ہم نے آپ کو ارکان حج کی ادائیگی کرتے ہوئے فلاں فلاں مقام پر دیکھا۔ ابن عربیؒ کو تعجب ہوا، ان کو غیبی آواز آئی، ابن عربی! ہم نے تمہاری وہ

خیرات قبول کر لی تھی اور تمہاری شکل وصورت کے سینکڑوں فرشتوں نے تمہاری طرف سے حج کیا تھا۔

مشہور چشتی بزرگ مولانا فخر الدین چشتیؒ نے اپنے نفلی حج کا سارا زادراہ اپنے پڑوس کی بڑھیا کو دیدیا۔ جب اس نے آکر کہا، شیخ! آپ تو حج کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں اور میری تین لڑکیاں کنواری بیٹھی ہیں۔ جن کے ہاتھ پیلے کرنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔

مولانا سے مریدین نے ارادۂ حج ترک کرنے کی وجہ پوچھی، مولانا نے فرمایا میں نے سوچا کہ اگر میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام و درود پیش کرتے وقت یہ فرمایا:

”اے فخر الدین! تو میری تین بیٹیوں کو بن بیاہی چھوڑ کر یہاں آگیا، تیرا سلام تو فرشتے بھی میرے پاس پہنچا دیا کرتے تھے، تو میرے پاس اس کا کیا جواب ہوگا؟“

یہ احساس اصحاب دل کی خصوصیت ہے، جگر صاحب نے کیا خوب کہا ہے:

گوش مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ
سن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

موجودہ عہد کے ایک مشہور بزرگ مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب نفلی حج کے لیے جاتے ہوئے مولانا سے ملنے آئے، مولانا نے ان سے فرمایا:

”میاں! تمھیں حج کرنے کے علاوہ بھی کوئی دوسرا کام ہے۔“

شیخ علیہ الرحمہ نے ایک بزرگ کا واقعہ بیان فرمایا، یہ بزرگ جنت البقیع میں دفن ہونے کی آرزو کیا کرتے تھے۔ انھوں نے ایک روز یہ خواب دیکھا کہ جنت البقیع کے اندر سے کچھ لوگوں کو باہر لایا جا رہا ہے اور کچھ لوگوں کو باہر سے اندر لے جایا جا رہا ہے۔ انھوں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ یہ کیا کر رہے ہو۔ وہ بولے، ہمیں خدا کا حکم ہوا ہے کہ جو لوگ بقیع میں دفن ہونے کے قابل نہیں ہیں لیکن انھیں دفن کر دیا گیا ہے۔ انھیں بقیع سے باہر کر دو اور جو لوگ اس قابل ہیں مگر یہاں دفن نہ ہو سکے، انھیں یہاں

لا کر دفن کر دیا جائے، ان بزرگ نے اس خواب کے بعد پھر بقیع کی آرزو نہیں کی۔

اے کاش! خواجہ حسنؒ شیخ علیہ الرحمہ سے ایک سوال یہ بھی کرتے کہ حضرت! آپ جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ کیوں نہیں لیتے۔ جو ملک میں چاروں طرف برپا ہے۔

اس سوال کے جواب میں شیخ علیہ الرحمہ سائل کو ایسا جواب دیتے کہ اس دور کی لڑائیوں کی حقیقت واضح ہو جاتی لیکن اس پر سلاطین کی خفگی نازل ہوتی اور شیخ علیہ الرحمہ کے لیے اپنا کام جاری رکھنا مشکل ہو جاتا۔

مشہور کمیونسٹ لیڈر ڈاکٹر اشرف مرحوم نے اپنے ایک تاریخی مضمون میں حضرات صوفیا کو مسلم سلاطین کا لشکرِ دعا قرار دیا ہے اور شیخ علیہ الرحمہ کا وہ واقعہ نقل کیا ہے جس میں شیخ کی طرف علاء الدین خلجی کے لشکر کے حق میں دعا کرنے کی بات منسوب کی گئی ہے، لیکن شیخ نے اس واقعہ میں جو محتاط انداز اختیار کیا اس نزاکت کو ڈاکٹر صاحب محسوس نہ کر سکے۔

صوفیا کے لیے لشکر دعا کا خطاب جہانگیر نے مقرر کیا تھا اور اس کا مقصد عوام میں یہ تاثر عام کرنا تھا کہ صوفیا ملکی لڑائیوں میں ہمارے ساتھ ہیں۔ حالاں کہ صوفیا کی خانقاہیں ہندو اور مسلمان سب کے حق میں خیر و بھلائی کی دعاؤں کے لیے ہر وقت کھلی رہتی تھیں، مسئلہ صرف لڑائیوں کا نہیں تھا، زندگی کے ہر شعبے کا تھا۔ جس میں مسلمان ہندو اور مسلم و غیر مسلم اور امیر و غریب سب یک ساں فایدہ اٹھاتے تھے۔

آخر وہ بھی تو ایک بڑے درجے کے سہروردی بزرگ (شیخ یعقوب کوکنیؒ) تھے جنہوں نے عالم گیرؒ کے مقابلے میں شیواجی کے لشکر کے حق میں دعا کی تھی اور اسے اس دعا سے کامیابی حاصل ہوئی تھی۔

—

جلد: ۴

تیسری مجلس:

کرامت کا اظہار گناہ ہے

درویشوں کی ایک جماعت کا ذکر آیا جو کرامات کا دعویٰ کرتی ہے اور کرامات کے ذریعے اپنے آپ کو مشہور کرتی ہے۔ اس سلسلے میں فرمایا:

فَرَضَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی اَوْلِیَآءِ هٖ كِتْمَانُ الْكَرَامَةِ كَمَا فَرَضَ عَلٰی اَنْبِیَآءِ اِظْهَارِ الْمُعْجِزَةِ.

"پس اگر کے کرامت خود را پیدا کند ترک فرضی کردہ باشد۔"

"اللہ تعالیٰ نے اولیاء اللہ پر کرامت کا چھپانا فرض قرار دیا ہے جس طرح حضرات انبیا علیہم السلام پر معجزہ کا اظہار کیا ہے۔"

(مجلس ۱۱، جلد ۴، صفحہ ۵۸۸)

اظہار کرامت کی مثال:

کشف و کرامت کا ذکر آیا تو شیخ علیہ الرحمہ نے شیخ نجم الدین کبریٰؒ کے خلیفہ شیخ سعد الدین حمویہؒ کا واقعہ بیان کیا کہ حاکم شہر آپ کی آزمایش کے لیے آیا۔ شیخ نے سیبوں سے اس کی تواضع کی، تھالی میں ایک بڑا سیب تھا، حاکم نے دل میں یہ خیال کیا کہ اگر یہ شخص واقعی درویش ہے، تو یہ سیب اٹھا کر مجھے دیدے گا۔ شیخ نے کشف کے ذریعے اس کا خیال معلوم کر لیا اور وہ سیب اٹھا لیا اور حاکم سے کہا:

ایک مداری اپنے گدھے کا تماشا دکھا رہا تھا، گدھے کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی، مداری نے ایک تماشائی کو ایک انگوٹھی دیدی اور کہا یہ گدھا اس انگوٹھی کا پتہ بتائے گا، وہ گدھا لوگوں کو سونگتے سونگتے اس شخص کے پاس کھڑا ہو گیا جس کے پاس

وہ انگوٹھی تھی۔ یہ واقعہ سنا کر حاکم سے کہا:
اگر آدمی کشف و کرامت دکھاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس گدھے کے برابر ٹھہراتا ہے۔ یہ کہہ کر شیخ نے وہ سیب اس حاکم کے آگے پھینک دیا۔ (مجلس ۲۹، جلد ۱، صفحہ ۶۲۹)

اظہار کرامت کے بعد درویش چلا جائے:

فرمایا جب درویش سے کوئی کرامت ظاہر ہو جائے تو اس مقام سے چلا جانا چاہیے۔
پھر حکیم سنائی کے یہ دو شعر پڑھے ۔

بیش منما جمال جاں افروز — چوں نمودی برو سپند بسوز
آن جمال تو چیست؟ مستیٔ تو — واں سپند تو چیست ہستیٔ تو

"اپنا جاں افروز جمال زیادہ نہ دکھا اور اگر دکھایا ہے تو جا کالا دانا (نذر اتارنے کے لیے) جلدی لا! تیرا وہ جمال کیا ہے؟ تیری مستی ہے اور تیرا وہ کالا دانا کیا ہے تیری ہستی ہے۔"

کرامت کا درجہ اور شیخ اکبرؒ:

کرامات کے معاملے میں صوفیا کو بہت بدنام کیا جاتا ہے۔ لیکن شیخ اکبرؒ نے اکابر صوفیا کے مسلک کی ترجمانی کرتے ہوئے اس باب میں بھی ان تمام فہمیوں اور گم راہیوں کا پردہ چاک کر دیا ہے جو تصوف کے دوستوں اور دشمنوں دونوں نے پھیلائی ہیں۔ اگر ابن تیمیہؒ جیسے اصحاب نقل و روایت نے بھی اس مسئلہ پر کچھ لکھا ہوگا تو بس اتنا ہی لکھا ہوگا۔

"اولیا اللہ پر کرامت کا چھپانا واجب ہے، رسول پر واجب نہیں ہے، کیوں کہ ولی تبع رسول ہے وہ دعوتِ رسول کی روشنی میں خلق کو خدا کی طرف بلاتا ہے، رسول اپنی رسالت کو خود اپنی زبان مبارک سے ثابت کر چکا ہوتا ہے، وہ اپنی رسالت کے ثبوت میں کرامت ولی یعنی کرامت مبلغ و داعی کا محتاج

نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے علمائے اہلِ تقویٰ کے ہاتھوں میں شریعت کی میزان دی ہے۔ یہ لوگ اصحاب تعدیل و جرح ہیں، پس جس شخص کی زندگی میں اتباع شرع کے آثار نمایاں ہوں اور اس کے ہاتھ پر کوئی خرق عادت جاری ہو جائے تو اسے کرامت کہا جائے گا۔ ورنہ وہ شعبدہ اور سحر ہوگا۔ اکابر صوفیا کے نزدیک کرامت رعونات نفس میں شمار ہوتی ہے۔ البتہ اگر کرامت نصرت دین یا کسی مصلحت کی وجہ سے ہو تو اور بات ہے۔"

کرامات کو معنویہ اور محسوسہ میں تقسیم کرتے ہوئے شیخ اکبرؒ لکھتے ہیں:

"خواص اہلِ اللہ کے نزدیک "معنوی کرامتوں" میں سب سے اعلا اور اشرف کرامت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے بندے سے آدابِ شریعت کی حفاظت کرائے اور حسنِ اخلاق اختیار کرنے اور برے اخلاق سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے اور پابندیٔ اوقات کے ساتھ واجب اور سنتوں کی ادائیگی کی حفاظت کرائے۔ ہر نیک کام کی طرف دوڑنے کی، خیانت، حسد، اور کینہ اور ہر بری صفت سے دل کو پاک کرنے اور ذکر و فکر سے اسے آراستہ کرنے کی توفیق دے۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں:

فَهٰذِهٖ عِنْدَ الْمُحَقِّقِيْنَ هِيَ الْكَرَامَاتُ الَّتِيْ لَا يَدْخُلُهَا مَكْرٌ وَلَا اِسْتِدْرَاجٌ بِخِلَافِ الْكَرَامَاتِ الَّتِيْ يَعْرِفُهَا الْعَامَّةُ فَاِنَّهٗ يُمْكِنُ اَنْ يَدْخُلَهَا الْمَكْرُ.

"محققین صوفیا کے نزدیک یہی کرامات وہ کرامات ہیں جن میں مکر اور استدراج کا دخل ممکن نہیں ہوتا بہ خلاف ان کرامتوں کے جنھیں عام لوگ جانتے ہیں، ان میں مکر داخل ہو سکتا ہے۔"

شیخ اکبرؒ آگے اس کی وجہ بیان کرتے ہیں۔

"ہم جو کہتے ہیں کہ کرامات معنویہ میں مکر و استدراج کا دخل نہیں ہوتا تو

اس کی وجہ یہ ہے کہ "علم" اس کرامت کے ساتھ رہتا ہے۔ اور حدود شرعی "مکر الٰہی" کے جال کو بچھنے نہیں دیتیں بلکہ عین یہی طریقہ ہے سعادت کے حصول کا۔"

اگر کرامت ظاہر ہو جائے تو ولی کو کیا کرنا چاہیے۔ دیکھیے کتنی اچھی بات کہی ہے:

"ولی کامل وہی ہے جو اظہار کرامت کے ساتھ اس کے چھپانے پر بھی قادر ہو، پھر اگر کرامت کا اظہار ہو جائے تو ضروری ہے کہ بندگی وطاعت میں فرق نہ آئے، کیوں کہ اس کا اندیشہ لگا ہوا ہے کہ وہ کرامات کہیں اس ولی کے اعمال خیر کا صلہ نہ قرار دی جائیں اور وہ خدا کے پاس بالکل خالی ہاتھ جائے۔"

سید علی الخواصؒ سے جب کسی کرامت کا اظہار ہو جاتا تھا تو وہ ڈرتے تھے اور خدا کے سامنے روتے تھے اور سوال کرتے تھے کہ مجھے ہلاکتوں سے بچایو۔ مجھے عام لوگوں سے نمایاں نہ کیجیو کسی بات میں بھی سوائے علم کے۔ کیوں کہ علم تو عین مطلوب ہے۔ اسی سے فایدہ حاصل ہوتا ہے۔ نیز فرماتے تھے:

"سب سے بڑی کرامت جس سے حق تعالیٰ نے علما کو نوازا ہے وہ علم کی کرامت ہے، اس کرامت کا کوئی دوسری کرامت مقابلہ نہیں کر سکتی جب کہ اس پر عمل بھی ہو، دنیا علم اور عمل کی جگہ ہے اور نتایج یعنی کرامات اور بزرگیوں کی آخرت ہے۔"

شیخ اسی باب میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

اِنَّ اَعْظَمَ الْکَرَامَاتِ اَنْ یَّصِلُ الْعَبْدَ اِلٰی حَدٍّ لَوْ غُفِلَ الْعَالَمِ کُلُّهٗ عَنْ لَقَامَ ذِکْرُ ذَالِکَ الْوَلِیُّ مَقَامَ ذِکْرُ الْجَمِیْعِ. (صفحہ۲۵۲)

"سب سے بڑی اور عظیم الشان کرامت یہ ہے کہ بندہ ذکر الٰہی کے اس مقام پر پہنچ جائے کہ اگر سارا عالم خدا سے غافل ہو جائے تو تنہا اس بندے کا ذکر اس سارے عالم کے ذکر کے قایم مقام ہو جائے۔"

ان تمام اقوال، تشریحات، توضیحات اور تعبیرات کو سامنے رکھیے اور فیصلہ کیجیے کہ کیا اکابر صوفیا جن کے مسلک کو سند اعتماد حاصل ہے، اتباع سنت، علم شریعت، علم وعمل وحی اور الہام کے بارے میں وہی رائے رکھتے ہیں جو ان کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔

کشف اور وحی کا فرق۔ شیخ اکبرؒ کے نزدیک:

کشف اور وحی میں صوفیا کے نزدیک کیا فرق ہے؟ دونوں کا درجہ بیان کرتے ہوئے شیخ اکبرؒ نے لکھا ہے:

"ہمارے نزدیک کشف کو وحی پر مقدم کرنا بے حقیقت بات ہے، کیوں کہ اہلِ کشف پر اکثر اشتباہ واقع ہوتا ہے اگرچہ کشفِ صحیح ہمیشہ ظاہر شریعت کے موافق ہوتا ہے۔ پس جو شخص کشف کو وحی پر مقدم کرے گا وہ اہلِ اللہ کے زمرے سے نکل جائے گا اور عملی خسران والوں کے ساتھ شامل ہو جائے گا۔" (یواقیت:۳۴)

اگر کسی صوفی کے فعل پر اعتراض کیا جائے اور وہ اس کے جواب میں یوں کہے کہ میں یہ فعل "امر الٰہی" سے کر رہا ہوں تو اس کا یہ جواب درست ہوگا؟ فرماتے ہیں:

"کسی ولی کے لیے یہ مناسب نہیں کہ مجھ پر امر الٰہی نازل ہوا، یا مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ امر کیا اور اگر کوئی ایسا کہے تو وہ تلبیس ابلیس شیطان کی گم راہی میں مبتلا ہے۔"

"حقیقت یہ ہے کہ "امر" کلام الٰہی کی قسم ہے اور کلام کا دروازہ مسدود ہو چکا ہے اور تشریع جدید کا سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کام اذن الٰہی سے کر رہا ہوں کیوں کہ اذن کا اطلاق مباح شرعی پر ہوتا ہے۔"

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا.

(الحشر:۹۵)

"یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو چیز تمھیں دیں وہ لے لو اور جس چیز سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔"

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"پیغمبر کی باتوں (وحی) کو قبول کرنا علی الاطلاق واجب ہے اور الہام جو بغیر واسطہ نبی کے براہ راست خدا سے حاصل ہو اس کے قبول کرنے کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ دلیل شرعی کے مطابق ہو۔ وجہ یہ ہے کہ نبی معصوم ہے اور اس کا منصب ہی کلام الٰہی کا پہنچانا ہے، لوگوں کو گم راہی اور شبہ میں ڈالنا اس کا کام نہیں ہے بخلاف ولی کے۔ ولی الہام کے نام پر تلبیس میں مبتلا ہو سکتا ہے، ہم پیغمبر کی طرف سے کسی مکر میں نہیں پڑ سکتے ہاں خدا کی طرف سے ہمارا امتحان ہو سکتا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَمَكَرُوا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ.

(النمل:۲۷)

لیکن یہ صفت پیغمبر کے لیے جائز نہیں ہے۔ پس جو شخص سلامت رہنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ میزانِ شریعت کو ہاتھ سے نہ چھوڑے اور جو کچھ (الہام) اسے براہ راست خدا کی طرف سے ملے اسے شریعت کی میزان میں رکھ کر تولے اگر پورا اترے قبول کر لے ورنہ رد کر دے۔ کتنی عجیب بات ہے یہ کہ جو کچھ تو رسول سے لیتا ہے وہ مطلق ہوتا ہے۔ حالاں کہ رسول خود مقید ہے اور جو کچھ تو اللہ تعالیٰ سے لیتا ہے وہ مقید ہوتا ہے حالاں کہ اللہ تعالیٰ خود مطلق ہے۔ (صفحہ ۱۹۵)

نادان لوگ کہتے ہیں کہ جب ناصح اور مبلغ اپنی بات پر خود عمل نہ کرے تو پھر اسے نصیحت کرنے کا کیا حق ہے اور اس کی نصیحت پر عمل کرنا ہمارے لیے کیوں ضروری ہے، یہ بات گدی نشین صوفیوں سے عام طور پر سنی جاتی ہے۔"

شیخ اس کا جواب دیتے ہیں:

"بندے پر واجب ہے کہ جب کوئی اسے نیکی کی طرف بلائے تو اسے قبول کرے، داعی یعنی بلانے والا اس پر خود عمل کرتا ہو یا نہ کرتا ہو کیوں کہ دعوت کے لیے عمل شرط نہیں ہے اور دعوت الی الخیر بہر حال ترک دعوت سے بہتر ہے۔" (صفحہ ۱۹۶)

علم حجاب ہے۔ شیخ اکبرؒ کی تشریح:

کچھ صوفی کہتے ہیں کہ علم خدا اور بندے کے درمیان حجاب ہے حالاں کہ علم حقایق کا انکشاف کرتا ہے۔ شیخ سے اس کا مطلب سنیے:

"صوفیہ کا مقصد اس سے علم کی مذمت کرنا نہیں ہے۔ صوفیا علم کو حجاب کہہ کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ طالب علم کے واسطے سے حق تک پہنچتا ہے۔ بلا واسطہ نہیں پہنچتا۔ پس علم ذات حق کی معرفت اور طالب کے درمیان دائمی حجاب بن جاتا ہے۔" (صفحہ ۴۴، جلد ۱)

جلد: ۴
چوتھی مجلس:

قُلُوبُ الْمُلُوکِ بِیَدِیْ

''حکم رانوں کے دل میرے ہاتھ میں ہیں۔'' (حدیث قدسی)

شیخ علیہ الرحمہ نے آج کی گفتگو میں صوفیائے حق کے اس مشہور تصور کا ذکر چھیڑ دیا جس پر تصوف کے مخالفین کی طرف سے بڑی لے دے کی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:

''لختی سخن در تغیر مزاج ملوک افتاد، فرمود کہ یکی از کلمات قدسیہ اینست کہ قلوب الملوک بیدی، رسول علیہ السلام روایت می کند کہ حق تعالیٰ می فرماید کہ دلہای بادشاہاں بدست منست یعنی ہر گاہ کہ خلق با خدای راست باشد من دلہای ایشاں بر خلق مہرباں گردانم و ہر گاہ کہ خلق با حق راست نباشد من دلہا می ایشاں بر خلق بی مہر گردانم! بعد ازاں بر لفظ مبارک راند کہ نظر آنجا باید داشت و ہمہ چیز از انجا تصور باید کرد!''

''پھر بادشاہوں کے مزاج کے تغیر کا ذکر نکلا۔ فرمایا کہ احادیث قدسی میں سے ایک یہ (حدیث) ہے کہ قلوب الملوک بیدی (بادشاہوں کے دل میری مٹھی میں ہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بادشاہوں کے دل میرے ہاتھ میں ہیں۔ یعنی جب تک خلق خدا تعالیٰ کے ساتھ ٹھیک رہتی ہے میں ان (بادشاہوں کے دل خلق پر مہربان رکھتا ہوں اور جب خلق اللہ کے ساتھ ٹھیک نہیں رہتی ہے تو میں ان کے دلوں کو خلق پر نامہربان کر دیتا ہوں اس کے بعد زبان مبارک سے ارشاد ہوا کہ اس حقیقت پر نظر رکھنی چاہیے اور تمام حالات کو اسی کے

مطابق سمجھنا چاہیے۔" (جلد۴، مجلس۴، صفحہ۵۹۶)

یوں تو ہر انسان کا دل خدا کے ہاتھ میں ہے اور اسلام کا مشہور بنیادی عقیدہ ہے کہ خیر وشر دونوں خدا کی طرف سے ہیں، لیکن اس عقیدے کا مطلب تقدیر الٰہی پر اعتماد رکھنا ہے۔ تدبیر واسباب سے کنارہ کرنا نہیں ہے۔

یہ حدیث قدسی امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں نقل کی ہے اور اس کے ذریعے امامؒ نے مسلمانوں کو برے حالات کے لیے اپنے اعمال کی اصلاح پر توجہ دلائی ہے اور ظالم حکم رانوں کی ایذا رسانی اور راحت رسانی دونوں کو ان کی رعایا کے برے اور اچھے اعمال کا نتیجہ قرار دیا ہے اور اس ذہنیت کی تردید کی ہے کہ ہر مصیبت اور پریشانی پر حکم رانوں کو برا کہتے رہو اور ان کے خلاف تحریکیں چلاتے رہو اور یہ نہ دیکھو کہ خود تمہارا حال کیا ہے؟

امام غزالیؒ کا دور پانچویں صدی ہجری کا وسط (ولادت ۴۵۰، وفات ۵۰۵ھ) ہے جو عباسی دور خلافت ہے، امام کے سامنے عہد بنی امیہ کی تمام خانہ جنگیاں ہیں، انھی خانہ جنگیوں سے بچ کر علمائے اخلاق نے مسلمانوں کی عملی تربیت کے لیے تربیتی ادارے قایم کیے جو خانقاہوں کے نام سے موسوم ہیں۔

ان خانقاہوں نے مسلمانوں کو غلط حکم رانوں کے خلاف ناکام فوجی اقدامات کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی اور اپنے ذاتی اعمال واخلاق کی اصلاح کے راستے پر لگایا۔

امام حسن بصریؒ کی رائے:

بنی ہاشم اور بنی امیہ کی سیاسی کش مکش کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر جو تلوار چل رہی تھی۔ اسی میں سے ایک نہایت خون خوار تلوار کا نام حجاج ابن یوسف تھا۔ اس اموی گورنر نے سیاسی خلفشار کو دبانے کے لیے نہایت سفاکانہ اقدامات کیے۔ معمولی معمولی مخالفتوں بلکہ مخالفت کی افواہوں پر علما اور صلحا کو تختۂ دار پر چڑھا دیا۔ اس حجاج ابن یوسف کے بارے میں زبیر ابن عدیؒ تابعی کا بیان ہے کہ میں نے حضرت انس

ابن مالکؓ سے پوچھا کہ ہم اس کے مظالم پر کیا کریں؟ تو حضرت انسؓ نے فرمایا:

اِصْبِرُوْا فَاِنَّهٗ لَا يَاْتِيْ عَلَيْكُمْ زَمَانٌ اِلَّا الَّذِيْ بَعْدَهٗ اَشَرُّ مِنْهُ حَتّٰى تَلْقَوْا رَبَّكُمْ سَمِعْتُهٗ مِنْ نَبِيِّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (مشکوۃ:۴۶۳ بہ حوالہ بخاری)

"تم لوگ صبر کرو، کیوں کہ تم پر اس سے زیادہ سخت دور آنے والا ہے، میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سنا ہے۔"

امام حسن بصریؒ بھی حجاج کے نشانے پر تھے مگر حسن تدبیر سے محفوظ رہے۔ ابو مالک کا بیان ہے کہ جب حسنؒ سے کہا جاتا ہے کہ آپ میدان میں نکل کر حالات کو بدلتے کیوں نہیں؟ تو وہ فرماتے

خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ نے حجاج کو تم پر یوں ہی مسلط نہیں کر دیا ہے بلکہ یہ تمہارے لیے ایک سزا ہے، لہٰذا اس سزا کا مقابلہ تلوار سے نہ کرو بلکہ صبر وسکون کے ساتھ اسے برداشت کرو اور عاجزی کے ساتھ خدا کے سامنے توبہ کرو۔

امام حسن بصریؒ کے بعد امام ابوحنیفہؒ کی بھی یہی رائے رہی (البدایہ، جلد۹، صفحہ۱۳۵) اور اس کی وجہ مولانا مودودی صاحبؒ (جو تحریک اسلامی کے مشہور رہنما تھے) کے الفاظ میں یہ تھی۔

"تلوار کے ذریعے سے تبدیلی کی جو کوششیں ہوئی تھیں ان کے نتائج پے در پے ظاہر ہوتے چلے گئے۔ جن کو دیکھ کر اس راستے سے بھی خیر کی توقع باقی نہیں رہی۔" (خلافت وملوکیت:۲۷۵)

میں نے مودودی صاحبؒ کے تجزیے کے الفاظ اس لیے نقل کیے کہ انھی کے فکر سے وابستہ لوگ تصوف کی سخت مخالفت کرتے ہیں اور تصوف پر بے عملی اور بزدل بنانے کا الزام عائد کرتے ہیں۔

حدیث قدسی کا ماخذ، قرآن کریم میں:

قرآن کریم میں کہا گیا ہے:

وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ O (انعام:۱۲۹)

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اس آیت کا فارسی میں یہ ترجمہ کیا ہے۔

''وہم چنیں مسلط مے کنیم بعض ستم گاراں را بر بعض بشامت آں چہ مے کردند۔''

''یعنی ہم اس طرح بعض ظالموں کو بعض پر مسلط کر دیتے ہیں (حاکم بنا دیتے ہیں) ان کے اعمال کی سزا کے طور پر۔''

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ مبارکہ میں اس آیت کی اس طرح تشریح فرمائی۔

كَمَا تَكُوْنُوْنَ كَذَالِكَ يُؤَمَّرُ عَلَيْكُمْ. (مشکوۃ:۳۲۳)

''تم لوگ جیسے ہوتے ہو ایسے ہی تم پر امیر وحاکم مقرر کیے جاتے ہیں۔''

جامع صغیر میں یہ الفاظ ہیں **يُوَلِّيْ عَلَيْكُمْ.**

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

اَعْمَالُكُمْ عُمَّالُكُمْ.

''تمہارے اعمال ہی تمہارے حکمرانوں کی صورت ہیں۔''

عربی شاعر کہتا ہے۔

وما من ید الا ید اللہ فوقھا
ولا ظالم الا سیبلی بظالم

''ہر ہاتھ (طاقت) کے اوپر اللہ کا ہاتھ (طاقت) ہے اور ہر ظالم کو دوسرے ظالم کے ذریعے آزمائش میں ڈالا جاتا ہے۔''

اس تصور سے تاتاری فتنے کا احساس کم ہو گیا۔

ساتویں صدی ہجری کے قیامت خیز تاتاری انقلاب کی زد سے عام مسلمانوں کو بچانے کے لیے اس دور کے اکابر صوفیا نے اس تصور سے کام لیا، مسلمانوں کی فوجی اور سیاسی قوت بری طرح شکست کھا چکی تھی، علما اور صوفیا کو ان کے مدرسوں اور خانقاہوں

میں گھس کر تاتاری سپاہی قتل کر رہے تھے۔ اس وقت عوام کو جوش واشتعال سے محفوظ رکھنے کا اس کے علاوہ اور راستہ ہی کیا تھا۔ اسی دور کے عظیم صوفی مولانا جلال الدین رومیؒ ہیں۔ مولانا نے ایک واعظ کے حوالے سے مصائب ومشکلات کے اخلاقی سبب اور اخلاقی محرک کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا:

آں یکے واعظ چو بر تخت آمدہ — قاطعان راہ را داعی شدہ
دست برے داشت یارب رحم راں — بربداں و مفسداں وطاغیاں
مرمر راگفتند کایں معہود نیست — دعوت اہلِ ضلالت جو دنیست
گفت نیکوئی ازینہا دیدہ ام — من دعاء شاں زیں سبب بگویدہ ام
خبث وظلم و جور چنداں ساختند — کہ مرا از شر بخیر اندا ختند
درحقیقت ہر عدو داروئے تُست — کیمیائے نافع دل جوئی تست
کہ ازو اندر گریزی در خلاء — استعانت جوئی از لطف خدا
ہر نبی ازوے بر آور دہ برات — استعینو منہ صبراً والصلات
ہیں ازو خواہید نے از غیراو — آب دریم جو، مجو درخشک جو
در بخواہی از دگر ہم او دہد — بر کفش میلش سخاہم او نہد

''ایک واعظ نے ممبر پر بیٹھ کر چوروں اور ڈاکوؤں کے حق میں رحم کی دعا کی، لوگوں نے اس سے کہا یہ طریقہ نہیں ہے کہ گم راہوں کے حق میں دعا کی جائے۔ وہ بولا، میں نے اسی میں خیر دیکھی ہے، اس سبب سے ان کے لیے خیر کی دعا کرتا ہوں۔ ان کے ظلم وستم کے اندر سے میرے لیے یہ خیر نکلی ہے کہ میں خدا کی طرف رجوع ہو گیا ہوں اور اسباب دنیا سے نظر ہٹالی ہیں۔

مولانا کہتے ہیں! حقیقت میں تیرا ہر دشمن تیرے مرض کی دوا ہے اور تجھے خدا کے لطف وکرم کا طلب گار بناتا ہے۔

ہر نبی کو یہ حکم ملا ہے کہ اس سے مدد طلب کرو اور نماز سے مدد چاہو۔ دریا سے پانی مانگو، خشک نہر سے نہ مانگو۔ اور اگر تم دوسروں سے بھی مانگو گے تو

اس کے دل میں سخاوت کا خیال وہی پیدا کرے گا۔"

حسن عمل کی فضیلت میں مرد اور عورت برابر:

تفسیر قرآن کریم کا یہ مسئلہ بڑا اہم ہے کہ حسن اعمال کی فضیلت میں مردوں اور عورتوں کا درجہ برابر ہے یا دونوں جنسوں کے درمیان فرق ہے؟

بہ ظاہر دونوں کے درجاتِ فضیلت میں فرق معلوم ہوتا ہے کیوں کہ بعض امورِ عبادت سے عورتیں مستثنیٰ اور الگ ہیں، جیسے نماز باجماعت اور جہاد فی سبیل اللہ۔ عورتوں کے ذمے فرض نہیں ہیں۔

مردوں کو ان عبادات کے ذریعے عورتوں پر برتری حاصل ہونی چاہیے۔ چناں چہ بعض صحابیاتؓ کے سوال پر حضرت ام سلمہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا کہ قرآنی احکام میں مرد مخاطب ہیں، عورتوں کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا، کیا اس کی وجہ عورتوں پر مردوں کی برتری ہے؟

اس سوال کے جواب میں سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۳۵ نازل ہوئی اور اس میں دس بنیادی اعمال حسنہ کا ذکر کرکے یہ بتایا گیا کہ ان اعمال میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔ احکام کے خطاب میں قرآن کا اسلوب مردوں کو مخاطب کرنے کا ہے۔ عورتیں خطاب میں مردوں کے تابع ہیں۔ لیکن اجر وثواب میں تابع نہیں۔ بلکہ برابر ہیں۔ یہی بات اصولی طور پر سورۂ مومن کی آیت نمبر ۴۰ میں بیان کی گئی۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کا اجتہاد:

اس مسئلے کو شیخ علیہ الرحمہ نے جس انداز سے واضح کیا ہے اس سے آپ کی علم عقاید میں بصیرت کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔

حضرت شیخؒ نے اہل اللہ کے توسل کے سلسلے میں فرمایا کہ وہ حضرات اپنے توسل میں نیک عورتوں کو نیک مردوں پر مقدم رکھتے ہیں۔ کیوں کہ نیک زناں غیریب باشند (فوائد اول: ۲۸۵) یعنی نیک عورتیں گم نام ہوتی ہیں۔ اور اس اجتہاد کا حاصل یہ ہے کہ شیخ

علیہ الرحمہ نے نیک مردوں کے اعمال حسنہ کی کمیت (تعداد) کے مقابلے میں عورتوں کے اعمال حسنہ کی کیفیت کو سامنے رکھا اور تعداد کی کمی سے عورتوں کے مرتبے میں نقصان کا جو تصور پیدا ہوتا تھا اس نقصان کی تلافی کیفیت کے ذریعے فرمائی۔

یہ تمام بحث ان فضائل میں ہے جو انسان کے اپنے عمل وکسب سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے نبوت ورسالت کی فضیلت اس سے مستثنیٰ ہے، یعنی کسی عورت کو نبوت عطا نہیں کی گئی، اور اس کی وجہ عورت کی بعض فطری کمزوریاں ہیں۔

صدیقیت اور ولایت:

نبوت کے بعد جس مرتبۂ تقرب کا درجہ ہے اس درجے کو اس کی معنوی حقیقت کے لحاظ سے صدیقیت اور اس کے نتیجے کے لحاظ سے ولایت کہا جاتا ہے۔ اس مرتبے پر عورتوں کو بھی فائز کیا گیا ہے اور کیا جاتا رہے گا۔

قرآن کریم نے فضیلت کے مراتب بیان کرتے ہوئے صدیقیت کی تعبیر اختیار کی اور اس درجے کے ثمرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ولی اور اولیا کے الفاظ اختیار کیے۔

مِنَ النَّبِيّنَ وَالصِّدِّقِيْنَ. (نساء:۷۱)

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ. (یونس:۶۲)

عربی لغت میں صدیق کے معنی راست باز اور ولی کے معنی مقرب اور دوست کے ہیں۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ اور مقام صدیقیت:

اس امت میں صدیقیت کا مقام قرآن کریم نے سب سے پہلے جس ہستی کو دیا وہ خوش نصیب خاتون ہیں جنھیں خداوند عالم نے کائناتِ ہستی کی سب سے افضل اور برتر مخلوق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کے لیے منتخب فرمایا۔ یہ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ہیں۔

قرآن کریم نے سورۂ والضحیٰ میں اپنے غم زدہ رسول محترم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے اپنے دو احسانات میں سے ایک یہ احسان یاد دلایا:

وَوَجَدَکَ عَائِلًا فَاَغْنٰی. (سورۃ الضحیٰ:۸)

''اے نبی! تمہارے رب نے تمھیں نادار پایا، پھر اس نے غنی کر دیا۔''

یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نادار تھے، یتیم تھے، جس محترم چچا کی پرورش میں تھے وہ بھی خاندان بنی ہاشم کے ایک غریب تاجر تھے، اللہ تعالیٰ نے حضرت خدیجہؓ جیسی خوش حال تاجر کے دل میں آپ کی محبت ڈالی، زوجیت میں آنے کے بعد آپ نے اپنی تمام دولت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈال دی، یہ خدائی منصوبہ تھا، قدرت نے اپنے نبی کی ناداری کو دور کرنے کے لیے منتخب کر رکھا تھا۔ چناں چہ غار حرا سے واپسی کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اضطراب کو دیکھ کر تسلی کے یہ جملے آپ نے فرمائے:

اِنَّکَ لَاتَخْذِیْکَ اللّٰہُ اَبَدًا. (بخاری شریف)

''یقیناً اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ کو خدا تعالیٰ کبھی بھی بے عزت نہیں کرے گا۔''

اور پھر آپ کو اپنے چچا ورقہ ابن نوفل کے پاس لے گئیں اور ورقہ نے آپ کو نبوت ملنے کی بشارت دی۔ تسلی کے ان محبت بھرے فقروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا یقین جلوہ گر تھا۔ اور آپ کو اولیت بالایمان کا مطلق درجہ حاصل ہے۔

حضرت سیدۃ الکبریٰ فاطمۃ الزہراءؓ اور مقام صدیقیت:

شبیہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضور علیہ السلام کی اہل بیت کرام میں حضرت سیدۃ الکبریٰؓ کا خاص مقام ہے، جسے ہم صدیقیت کا اعلا مرتبہ قرار دے سکتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے:

مَارَاَیْتُ اَحَدًا کَانَ اَشْبَہَ سَمْتًا وَهَدْیًا وَدَلًّا وَکَلَامًا

بِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ فَاطِمَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهَا. (مشکوٰۃ:۴۰)

''میں نے کسی فرد کو نہیں دیکھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت رکھتا ہو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے مقابلے میں۔''

آپ عادت شریفہ میں، خصلت مبارکہ میں اور نشست و برخاست میں اور گفتگو میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ مشابہت رکھتی تھیں۔

آل محمد میں شباہت رسول صلی اللہ علیہ وسلم:

حضرت سیدۃ الکبریٰؓ کی شباہتِ رسول آپ کے دونوں صاحب زادوں (حسن اور حسین رضی اللہ عنہما) کے اندر بھی موجود تھی۔

حضرت انس ابن مالکؓ فرماتے ہیں:

لَمْ یَکُنْ اَحَدٌ اَشْبَهَ بِالنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنَ الْحَسَنِ ابْنِ عَلِیٍّ وَقَالَ فِی الْحُسَیْنِ اَشْبَهُهُمْ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ. (مشکوٰۃ ۵۶۱ بہ حوالہ بخاری)

''حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت حسنؓ حضرت حسینؓ دونوں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔''

حضرت علیؓ اور مقام صدیقیت:

حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ مسجد میں لوگ نماز پڑھ رہے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسجد میں تشریف لائے۔ اس موقع پر ایک سائل سوال کرتا ہوا ادھر آیا، آپ نے اس سائل سے پوچھا کیا کسی نے تجھے کچھ دیا؟ اس نے کہا ہاں دیا۔ آپ نے پوچھا کس حالت میں دیا؟ اس نے کہا وہ رکوع کی حالت میں تھے کہ انھوں نے اپنی انگوٹھی مجھے عطا کی۔ وہ حضرت علیؓ تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے اس جذبے کو دیکھ کر **فَکَبَّرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ** تکبیر بلند فرمائی اور پھر یہ آیت تلاوت کی:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ O وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ O (مائدہ:۵۶)

"اے مسلمانو! تمہارا حقیقی دوست اللہ ہے اور اس کا رسول ہے اور وہ ایمان والے ہیں جو نماز قایم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ رکوع کرنے والے ہیں اور جو شخص اللہ سے، اس کے رسول سے اور ایمان والوں سے محبت کرتا ہے تو بے شک اللہ کی جماعت غالب رہنے والی ہے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ خود بھی یہ فرماتے تھے کہ یہ آیات میرے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ (الذین اٰمنو) سے حضرت علیؓ مراد ہیں اور قرآن کریم نے جمع کا پیرایہ اختیار کر کے یہ بتایا کہ حضرت علیؓ کا ایمان پوری جماعت اہلِ ایمان کے برابر ہے۔

اس تفسیر کو حافظ ابن کثیرؒ نے متعدد صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ سے نقل کر کے اس کو قوی ترین تاویل قرار دیا ہے۔ (ابن کثیر جلد ثانی:۷۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے مؤثر پیرائے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مقام صدیقیت وولایت کا اظہار فرمایا۔ ارشاد گرامی ہے:

اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی اِلَّا اَنَّهٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ۔ (مشکوٰۃ:۵۶۲ بحوالہ متفق علیہ)

"اے علی (رضی اللہ عنہ)! تم میرے لیے ایسے ہی ہو جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام تھے۔ فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔"

حضرت ہارون علیہ السلام چوں کہ نبی تھے۔ اس لیے آپ نے یہ بات صاف کردی کہ تم نبی نہیں ہو سکتے۔ البتہ یہ بات مسلم ہے کہ حضرت علیؓ کو مقام صدیق حاصل تھا جو نبوت کے بعد کا درجہ تقرب ہے۔

جلد:۴
بیسویں مجلس:

نمازِ غائبانہ کے بارے میں جواز کی رائے

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے کسی کے سوال کرنے پر فرمایا:

"نماز غائبانہ روا باشد، مصطفیٰ علیہ السلام بر نجاشیؓ نماز می گزاردہ است۔ امام شافعیؒ ایں معنی را جائز مے دارد۔"

"نماز غائبانہ جائز ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشیؓ پر غائبانہ نماز ادا کی ہے امام شافعیؒ، اسے جائز قرار دیتے ہیں۔"

شیخ علیہ الرحمہ نے احناف کے مسلک پر امام شافعیؒ کے مسلک کو ترجیح دے کر جواز کی رائے دی، احناف کہتے ہیں کہ نماز جنازہ کے جواز کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ میت امام کے سامنے موجود ہو۔ حبشہ کے مسیحی نو مسلم حکم راں اصحمہؓ (نجاشی) کے انتقال کی خبر حضور علیہ السلام کو پہنچی تو آپ نے صحابہ کو جمع کر کے نماز جنازہ چار تکبیروں کے ساتھ ادا فرمائی۔ (مشکوٰۃ ۱۴۴ بحوالہ متفق علیہ)

احناف اس واقعے کو خصوصی واقعہ قرار دیتے ہیں اور یہ تاویل بھی کی جاتی ہے کہ نجاشی کی مسہری بلند کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھائی گئی۔ صحابہ کرامؓ جو مقتدی تھے انہوں نے نہیں دیکھی اور یہ بات ضروری نہیں کہ مقتدی بھی دیکھیں۔ (کنز الدقائق:۵۱)

نجاشی کی خصوصیت کا یہ مطلب ہے کہ جبش کے اس مسیحی حکم راں نے صحابہ کرامؓ کے پہلے مہاجر قافلے کا بڑا اعزاز و اکرام کیا تھا اور اپنی عیسائی مملکت کے عیسائی پیشواؤں کی مخالفت سے بے نیاز ہو کر اس نے حضرت جعفر طیارؓ کی تقریر سے اتفاق کر کے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اسی حکم راں نے حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیانؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عقد کرایا تھا اور اپنی طرف سے ایک معقول رقم بہ طور مہر ادا کی

تھی۔ اصحمہ رضی اللہ عنہ، کا یہ بڑا کارنامہ تھا، اس کی عظمت کا اظہار آپ نے اس صورت میں کیا کہ اس کے انتقال پر اس کی نماز غائبانہ ادا فرمائی۔

صاحب شرح وقایہ (حنفی فقہ کی مشہور کتاب) نے نماز غائبانہ کی دو مثالیں اور نقل کی ہیں اور انھیں مغازی کی کم زور روایات کہہ کر انھیں شرعی مسئلے کی دلیل کے قابل قرار نہیں دیا ہے۔

ایک واقعہ حضرت معاویہ ابن معاویہ مزنیؓ کی وفات کا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت غزوۂ تبوک کے سلسلے میں مدینہ منورہ سے باہر تھے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حاضر ہو کر آپ کو اطلاع دی اور عرض کیا کہ اگر آپ چاہیں تو میں زمین کو لپیٹ دوں اور معاویہؓ کی میت کو آپ کے سامنے ظاہر کر دوں تا کہ آپ ان پر نماز پڑھ سکیں۔ آپ نے منظور فرمایا۔

جبرئیل امین نے اپنی قوت سے زمین کو لپیٹ دیا اور معاویہؓ کی چارپائی بلند ہوئی پھر آپ نے اور صحابہ کرامؓ نے نماز ادا کی، صحابہ کے علاوہ آپ کے پیچھے دو صفیں ملائکۃ اللہ کی تھیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل امین سے کہا کہ معاویہؓ نے یہ بلند مرتبہ کیسے پایا؟ جبرئیل امین نے جواب دیا کہ معاویہؓ کو سورہ اخلاص سے بڑی محبت تھی، یہ اسے چلتے پھرتے پڑھتے تھے۔ یہ روایت طبرانی میں حضرت ابو امامہؓ سے اور ابن سعد کی طبقات میں حضرت انسؓ سے مروی ہے۔ ایک روایت واقدی نے اپنی تاریخ میں حضرت زید ابن حارثہؓ اور جعفر طیارؓ کی نقل کی ہے۔ اس کے راوی عبداللہ ابن بکرؓ ہیں۔

فقیر اور مسکین بن کر رہے:

کشف و کرامت کا بیان تھا۔ فرمایا:

''کرامت پیدا کردن کارے نیست، مسلمانی روی راستی گدائے بے چارہ ے باید بود۔''

''کرامت دکھانا کوئی کام نہیں ہے۔ سیدھا سچا مسکین فقیر ہونا چاہیے۔''

پھر یہ واقعہ سنایا کہ خواجہ ابوالحسن نوریؒ نے دریا کے کنارے ایک مچھیرے کو یہ کرامت دکھائی کہ اس کے جال میں ڈھائی من کی مچھلی پھنس گئی۔ یہ خبر جب حضرت جنید بغدادیؒ کو پہنچی تو آپ نے فرمایا:

''اے کاش! اس جال میں ایک کالا سانپ پھنس جاتا اور وہ ابوالحسنؒ کو ڈس لیتا، اس سے وہ شہید تو ہو جاتا۔''

''چوں آں نشد چہ دانم کہ ختم کار او چگونہ باشد؟

''چوں کہ ایسا نہیں ہوا اس لیے نہ جانے ان کا انجام کیا ہو؟''

معجزہ اور کرامت کا اظہار اور اخفا:

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے کرامت کے اخفا (چھپانے) کو فرض کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی اس مجلس میں کہی گئی ہے کہ:

''سخن در طائفہ افتاد کہ دعوی کرامت کنندہ خود را بکشف معروف گردانند۔''

''یعنی یہ بات اس جماعت صوفیا کے تذکرے کے سلسلے میں فرمائی جو کرامت کا دعویٰ کرتی تھی اور اپنے آپ کو کشف کے واقعات کے ذریعے مشہور کرتی تھی۔''

مطلب یہ کہ اس نیت و ارادے (ریا کاری اور نمائش پسندی) سے اگر کوئی صوفی کرامت کا اظہار کرتا ہے تو وہ تارک فرض ہے اور قصور وار ہے۔

ممکن ہے کہ کچھ لوگ صوفیت کے لباس میں صوفیاے ربانی کو بدنام کرنے کے لیے ایسا کرتے ہوں اور شیخ نے ان کی مذمت میں یہ الفاظ فرمائے ہوں۔

ورنہ جہاں تک دین کی صداقت و حقانیت کے اظہار کی خاطر حضرات صوفیا کی طرف سے کرامات، خرق عادات اور حیرت انگیز واقعات کے ظاہر کرنے کا تعلق ہے تو وہ ایک امر مستحسن ہے اور دین حق کی ایک ضرورت ہے۔

لیکن ایک ولی کے اندر ریا پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے، کیوں کہ ولی وحی الٰہی کی

نگرانی میں نہیں ہوتا اس لیے ولی کے بارے میں صوفیاے ربانی کو یہ ہدایت کرنی پڑی کہ وہ کرامت کے اظہار سے پرہیز کرے۔

حضرات انبیا کرام علیہم السلام کا معاملہ اولیاء اللہ سے مختلف ہے، وہاں ریا و نمائش پسندی کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا اور حضرات انبیا کی پوری زندگی دین حق کی شہادت اور ترجمان ہوتی ہے۔ اس لیے وہاں معجزات وخرق عادات کے اخفا کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

حالاں کہ انبیا کے معاملے میں بھی خدا تعالیٰ نے مخالفین کی فرمائش کو رد کرتے ہوئے یہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی اختیار میں معجزات دکھانا نہیں ہے۔ معجزہ خدائی طاقت وقدرت کا ظہور ہے جو نبی ورسول کے ہاتھ پر جب خدا چاہتا ہے ظاہر کرتا ہے۔

فَلَعَلَّکَ تَارِکٌۢ بَعْضَ مَا یُوْحٰٓی اِلَیْکَ وَضَآئِقٌۢ بِہٖ صَدْرُکَ اَنْ یَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْہِ کَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَہٗ مَلَکٌ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِیْرٌ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ ۝ (ھود:۱۱)

"اے نبی! کہیں ایسا نہ ہو کہ جو پیغام حق تم پر نازل کیا جا رہا ہے اس کا کوئی حصہ بیان کرنے سے چھوڑ دو، اس بات سے خفا ہو کر کہ وہ لوگ (تمہاری صداقت کے ثبوت کے لیے) یہ مطالبہ کریں گے کہ اس پر دولت کا کوئی خزانہ کیوں نازل نہ کیا گیا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ (اس کی کھلی مدد کرنے کے لیے) کیوں نہ آیا؟"

تم تو اے رسول محض ہوشیار وخبردار کرنے والے ہو اور ہر چیز کا نگراں تو اللہ ہے، یقیناً بشری تقاضے سے آپ کے اندر یہ خواہش پیدا ہوتی ہوگی کہ مخالفین مجھ سے جس معجزے کا مطالبہ کریں وہ میرے ہاتھ پر ظاہر ہو جائے اور اس خواہش کو ایک نبی کے تعلق سے ریاکاری اور شہرت پسندی کے جذبے سے تعبیر کرنا گناہ ہے، نبی کا جذبہ اپنی ذاتی شہرت نہیں ہوتی بلکہ اپنے پیغام ومنصب کی سچائی کا ظہور اس کا مقصد اور اس کی

خواہش ہوتی ہے، لیکن یہاں سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ نبی ورسول کو دنیا والے خدا کا بھیجا ہوا نمایندہ سمجھیں، اسے خدا اور خدائی کے اختیار واقتدار کا مالک نہ سمجھنے لگیں۔ اس لیے نبی پاک کو تسلی دی گئی اور آپ کا حوصلہ بلند کیا گیا اور خدا تعالیٰ نے اپنی مصلحت کا اظہار فرماتے ہوئے کہا:

"اے نبی! آپ تو صرف نبی ہیں۔ اسی حیثیت سے ہم آپ کو دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں، اس سے زیادہ آپ بھی اپنے بارے میں کچھ نہ سوچیں۔"

یقیناً ہر نبی ورسول کو اپنی اصلی حیثیت وحقیقی منصب کا مکمل احساس ہوتا ہے، لیکن کبھی کبھی بشری تقاضا اور فطری احساس نمایاں ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ اس موقع سے فایدہ اٹھا کر حقیقی صورت حال کی وضاحت فرما دیتا ہے۔

اظہار کرامت سے کیوں روکا گیا؟:

صوفیاے ربانی نے کرامت کے اظہار سے کیوں روکا؟ اس کی وجہ بھی دین کی حفاظت رکھنا ہے، کیوں کہ حیرت انگیز واقعات وحالات ایک غیر مسلم بھی اپنی باطنی قوت سے (جو وہ نفس کشی کے ذریعے حاصل کرتا ہے) ظاہر کر سکتا ہے اور ہندوستان میں نفس کشی کرنے والے جوگیوں کے محیر العقول واقعات مشہور ہیں۔

صوفیاے حق نے حیرت انگیز اور تعجب خیز واقعات کو اہمیت نہ دینے کی غرض سے صوفیا کے لیے اظہار کرامت کی ممانعت فرمائی اور اس کے مقابلے میں اعلیٰ اخلاق اور روحانی اثر پیدا کرنے اور اسے ظاہر کرنے پر زور دیا۔

صوفیاے ربانی کی حقیقی کرامت ان کے باطن اور قلب کی وہ نورانیت ہے، اخلاق کی وہ شرافت ہے، معاملات کی وہ دیانت ہے اور عمل کی وہ صداقت ہے جو تاریک دلوں کو روشن کر دیتی ہے۔ غافل انسانوں کے وجدانی اعتراف حق کو جگا دیتی ہے اور دنیوی تعیشات سے نفرت پیدا کر دیتی ہے۔

کرامت پر ایمان لانا ضروری نہیں:

کراماتِ اولیا حق ہیں، لیکن ان پر ایمان لانا ضروری نہیں، کیوں کہ اس کا امکان ہے کہ کوئی ولی اگر ایک حیرت انگیز واقعہ دکھاتا ہے تو ایک غیر مسلم استدراج کے طور پر اس سے بڑا واقعہ دکھادے۔ اور اس طرح لوگوں کے ایمان میں خلل واقع ہو۔

نبی و رسول جو معجزہ دکھاتے ہیں ان پر ایمان لانا ضروری ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نبی کے مخالفین کو نبی کے معجزے کا جواب لانے سے عاجز کر دیتا ہے، مخالفین میں ممکن ہونے کے باوجود یہ طاقت نہیں ہوتی کہ نبی کے معجزے کے مقابلے میں اپنا کوئی کمال دکھا سکیں اور نبی کے معجزے کا توڑ کر سکیں۔

کرامت، خلاف عقل واقعہ:

شیخ علیہ الرحمہ نے قاضی حمید الدین ناگوریؒ کے حوالے سے ایک بزرگ کی یہ کرامت بیان فرمائی کہ وہ ایک دن میں سات سو مرتبہ قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔ قاضی صاحبؒ نے ان بزرگ سے یہ واقعہ سن کر دل میں یہ خیال کیا کہ موہوم مے خواند۔ ''خیال میں قرآن کے معانی کا تصور کر لیتے ہوں گے'' ان بزرگ نے اس خیال کو پالیا اور سر اٹھا کر فرمایا: ملفوظاً لا موہوماً۔ ''نہیں الفاظ کی تلاوت، محض معانی کا تصور نہیں'' حضرت قاضی صاحبؒ کو یہ بزرگ بیت اللہ شریف کا طواف کرتے ہوئے مل گئے تھے۔ قاضی صاحبؒ نے ان کی روحانی عظمت کو محسوس کر لیا (کیوں کہ یہ خود بھی صاحب کشف بزرگ تھے) اور ان کے قدموں پر قدم رکھ کر طواف کرنے لگے۔ بزرگ نے کہا متابعت ظاہری چہ مے کنی؟ ''یہ کیا ظاہری پیروی کر رہے ہو؟'' متابعت آن کن کہ من مے کنم۔ ''میں جو کام کرتا ہوں اس کی پیروی کرو۔''

قاضی صاحبؒ نے سوال کیا کہ آپ کیا کرتے ہیں؟ بزرگ نے اوپر والا جواب دیا،

یہ واقعہ سن کر مجلس شیخ کے حاضرین میں سے اعز الدینؒ (مرید خاص) نے پوچھا شاید یہ کرامت ہوگی؟ آپ نے فرمایا ہاں کرامت تھی۔

''ہر معاملہ کہ بہ عقل باز خواند آں دیگر است و آں چہ در عقل راگنجائی نباشد، آں کرامت باشد۔''

''ہر وہ کام جو عقل میں آجائے وہ تو اور چیز ہے اور جو عقل میں نہ آئے وہ کرامت ہوتی ہے۔''

معجزہ اور کرامت میں فرق۔ معجزے کے لیے معتبر شہادت ضروری ہے:

علمائے اسلام نے لکھا ہے کہ معجزے کے ثبوت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ معتبر شہادت اور مستند نقل و روایت کے ذریعے بیان کیا گیا ہو۔ کیوں کہ خلاف عقل واقعہ پر ایمان لانے کے لیے معتبر شہادت ضروری ہے۔ لیکن کرامت کے نقل و حکایت کے لیے یہ شرط ضروری نہیں، کیوں کہ کرامت پر ایمان لانا ضروری نہیں البتہ جس کو ناقل اور راوی کے ساتھ حسن اعتقاد ہو گا وہ اسے تسلیم کر لے گا، ورنہ نہیں۔

کرامات اولیا کا ثبوت قرآن کریم میں:

جہاں تک کرامت کے انکار کا تعلق ہے یہ بات بھی غلط ہے، کیوں کہ قرآن کریم نے اولیاء اللہ کی کرامت پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر کیا اس کا بھی انکار کیا جائے گا؟

قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ حضرت مریم علیہا السلام کی ایک کرامت بیان کی ہے:

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يٰمَرْيَمُ أَنّٰى لَكِ هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ O

(مریم:۱۹)

جب حضرت مریم کے مربی حضرت زکریا علیہ السلام اپنی بھانجی مریم سے ملنے ان کے حجرے میں داخل ہوتے تو ان کے پاس کچھ کھانے کا سامان پاتے، پھر ان سے پوچھتے کہ مریم! یہ کہاں سے آیا ہے۔ بے شک خدا تعالیٰ جسے چاہتا ہے بے قیاس

روزی عطا فرماتا ہے۔

قرآن کریم نے حضرت مریم کو صدیقہ کہا ہے **وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ.** (مائدہ:۷۵)

شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلویؒ نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے:

اور اس کی (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی) ماں ولی تھیں۔ صدیق نبی و رسول کے بعد دوسرا مقبول بارگاہ اور خدائی انعام یافتہ مرتبہ ہے، اس کا ترجمہ ولی کے لفظ سے بہترین ترجمہ ہے۔

حضرت مریم کے رزق کی تفسیر اکثر علمائے تابعین حضرت عکرمہؒ، مجاہدؒ وغیرہ نے بے موسم کے پھل سے کی ہے یعنی **فَاكِهَةُ الصَّيْفِ فِي الشِّتَاءِ وَفَاكِهَةُ الشِّتَاءِ فِي الصَّيْفِ** گرمیوں میں سردیوں کے پھل اور سردیوں میں گرمیوں کے پھل۔

اور اردو مفسرین میں قدیم مفسرین کے علاوہ جدید مفسرین نے بھی دنیا کا مادی رزق مراد لیا ہے۔ سوائے مولانا حمید الدین صاحب فراہیؒ کے شاگرد رشید مولانا امین احسن صلاحی صاحبؒ کے، مولانا نے تدبر قرآن میں معنوی رزق اور روحانی غذا (علم و عبادت) سے رزق کی تفسیر کی ہے۔ اس کے علاوہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر آصف ابن برخیا کا یہ واقعہ یمن کی خاتون حکم راں بلقیس نے جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت قبول کرلی اور آپ کی خدمت میں آنے کا انتظام کیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ خبر سن کر فرمایا:

اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ.
(النمل:۴۰)

"اے درباریو! تم میں کون ایسا ہے جو بلقیس کے آنے سے پہلے میرے پاس اس کا شاہی تخت لے آئے؟ ایک قوی ہیکل جن بولا۔ اے نبی! آپ اپنی جگہ سے اٹھنے نہیں پائیں گے کہ وہ تخت لے آؤں گا۔"

یہ سن کر آصف ابن برخیا بولے:

قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ

اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ لِيَبْلُوَنِيْ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ. (النمل:۲۷)

"جس شخص کے پاس کتاب الٰہی کا علم تھا وہ بولا میں پلک جھپکنے سے پہلے اسے لے آؤں گا (پھر واقعی وہ لے آیا) اور جب سلیمان (علیہ السلام) نے اسے اپنے سامنے پایا تو خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے بولے، یہ سب میرے خدا کا فضل و کرم ہے اس نے میری آزمائش کی ہے کہ میں شکر ادا کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں اور جو شخص اس کا شکر ادا کرتا ہے تو وہ اپنے بھلے کے لیے کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو میرا پروردگاہ بے نیاز ہے بزرگ ہے۔"

عقل پرستوں کی بات کو تو جانے دیجیے، مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ نے پلک جھپکنے کے محاورے سے فایدہ اٹھا کے اسے جلدی اور سرعت کے ساتھ لانے سے تعبیر کیا ہے اور علم کتاب سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے توشہ خانے کا علم مراد لیا ہے، جہاں ان کے خیال کے مطابق وہ تخت رکھا ہوا تھا۔

لیکن علمائے سلف نے بالاتفاق اسے آصف ابن برخیاؒ کی کرامت قرار دیا ہے۔ آصفؓ حضرت سلیمان علیہ السلام کے مقرب صحابی تھے۔ جیسے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم تھے۔

مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی علیہ الرحمہ نے قصص القرآن میں آصفؓ کی کرامت کے ساتھ اس محیر العقول واقعہ کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ بھی قرار دیا ہے۔ کیوں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے یہ الفاظ کہ **هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ**، اشارہ کررہے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس واقعے کو اپنے اوپر خدا کا فضل فرمارہے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایک صحابیٔ رسول کے پاس جو کمال بھی ہوتا ہے وہ رسول کے فیضِ صحبت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ولی کی کرامت نبی کا معجزہ ہے۔ (بیان القرآن، جلد ۸، صفحہ ۷۶)

مولانا رومیؒ اور کرامت:

مولانا نے معجزے اور کرامت کا فلسفہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

نطق آب و نطق خاک و نطق گل ہست محسوس حواس اہل دل
فلسفی کر منکر حنانہ است از حواس انبیا بے گانہ است

''اللہ تعالیٰ نے جو حواس (روحانی) اہل دل (انبیا و اولیا) کو عطا کیے ہیں۔ فلسفی اس سے واقف نہیں، وہ اس معجزے کا منکر ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی میں کھجور کا تنہ (جس پر آپ ٹیک لگا کر خطبہ دیتے تھے) کس طرح رویا تھا؟''

تصرف کیا چیز ہے؟:

آصف ابن برخیاءؒ کی اس اعجازی قوت کی تشریح میں مفتی محمد شفیعؒ صاحب معارف القرآن کے حوالے سے ہمیں یہ بات معلوم ہوئی کہ علم الحقائق کے امام شیخ ابن عربی علیہ الرحمہ اس قوت کو تصرف فرماتے ہیں اور ان کی تحقیق یہ ہے کہ تصرف خیال و نظر کی قوت کا نام ہے، معجزہ اور کرامت فعل خداوندی ہے۔ تصرف میں انسانی فعل کو دخل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فعل خداوندی قرار پانے کے بعد اس فعل میں کوئی استحالہ اور عدم امکان نہیں رہتا کہ مآرب (یمن) سے بیت المقدس تک ڈیڑھ ہزار میل کا فاصلہ ایک تخت شاہی پلک جھپکتے طے کر لیتا ہے۔ کیوں کہ زمان و مکان اور مادہ و حرکت کے جو تصورات ہم نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر قایم کیے ہیں۔ ان کے جملہ حدود صرف ہم پر ہی منطبق ہوتے ہیں، خدا کے لیے یہ تصورات صحیح نہیں ہیں اور نہ وہ ان حدود سے محدود ہے۔

جس خدا کے ایک حکم سے یہ عظیم کائنات وجود میں آگئی ہے اس کا ایک اشارہ ہی سبا کی ملکہ کے تخت کو روشنی کی رفتار سے چلا دینے کے لیے کافی تھا۔

آخر اسی قرآن میں یہ ذکر بھی تو موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ راتوں رات اپنے بندۂ خاص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے بیت المقدس لے گیا اور پھر آگے (حدیث کے مطابق) ملاء اعلیٰ اور آسمان اعلیٰ تک عروج عطا فرمایا اور واپس لے آیا اس طرح کہ مکان کی کنڈی ہلتی رہی۔

حضرت مخدوم نصیر الدینؒ کا محاکمہ:

شیخ ابوالغیث یحییٰؒ اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے درمیان کرامت کے اظہار اور عدم اظہار کے بارے میں جو بحث مخدومؒ صاحب نے نقل کی اور پھر اس پر ایک علمی پہلو سے محاکمہ کیا اسے خیر المجالس سے آگے نقل کیا گیا ہے۔ جسے تعلیمات شیخ کے تحت حسن اخلاق کے عنوان میں دیکھا جائے۔

جلد:۵
پہلی مجلس:

سچی محبت پیروی کرنا ہے
علم اور علما کی فضیلت

خواجہ حسن علیہ الرحمہ نے علم و علما کے ساتھ محبت کی فضیلت پر شیخ علیہ الرحمہ کے حضور میں یہ حدیث پیش کی اور اس حدیث کی رو سے اپنی بخشش و مغفرت کی امید قایم کی۔

مَنْ اَحَبَّ الْعِلْمَ وَ الْعُلَمَاءَ لَمْ یُکْتَبْ خَطِیْئَتُہٗ۔

''یعنی جو شخص علم اور علما سے محبت کرتا ہے اس کی خطائیں نہیں لکھی جاتیں۔''

شیخ علیہ الرحمہ نے فرمایا:

''فرمود کہ صدق محبت متابعت است، چوں کسے محب ایشاں شد، ہر آئینہ متابعت ایشاں کند و از ناشائستہ دور باشد چوں ایں چنیں شود ہر آئینہ گناہ او را ننویسند۔'' (صفحہ ۹۲۵)

''سچی محبت اتباع کرنا ہے، جب کسی سے محبت کی جائے گی تو ضرور اس کی پیروی کی جائے گی اور گناہ کے کاموں سے پرہیز کیا جائے گا، جب ایسا ہوگا تو ظاہر ہے اس کے گناہ نہیں لکھے جائیں گے۔''

شیخ علیہ الرحمہ نے سچی محبت کی تفسیر اتباع سے کی۔ یہ تشریح ایک صوفی اور شیخ روحانی کی زبان سے ہمارے کانوں میں پڑ رہی ہے۔ حضرات محدثین و فقہا کے مجالس میں اس تشریح کا چرچا عام ہے۔ صوفیائے کرام کے بارے میں یہ غلط فہمی رہی ہے کہ یہ حضرات محبت، محبت ہی پکارتے ہیں اور اتباع و متابعت (خدا کی اور خدا کے

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی) اس حلقے میں وہ اہمیت نہیں رکھتی جس کی اہمیت کا اظہار قرآن وحدیث میں ملتا ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ کی اس تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخؒ کے قلب مبارک پر حضرات صوفیا کے مرشد اعلیٰ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ مبذول ہوئی اور خواجہ حسن بصریؒ نے اس مختلف ماحول میں صوفیائے کرام کے سامنے اپنے ذوق (عملیت پسندی) کا اظہار کرایا۔ مشہور حدیث قدسی ہے:

اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ.

”میں بندے کے گمان کے ساتھ ہوں، وہ مجھ سے جیسی امید رکھے گا میں اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کروں گا۔“

یہ اس حدیث پاک کا عام مفہوم ہے۔ لیکن حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ اس کا یہ مطلب بیان فرماتے تھے:

”میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں اگر وہ میرے احکام کے بارے میں اچھا گمان اور پختہ یقین کر کے عمل کرے گا تو میں اس کے ساتھ اچھا معاملہ کروں گا اور اگر وہ میرے احکام کے ساتھ بے یقینی کا معاملہ کرے گا اور ان پر عمل کرنے سے گریز کرے گا تو میرا معاملہ بھی اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوگا۔“ (تفسیر روح المعانی جلد اول: ۵۱۸)

حضرات صوفیا کے اس طریقہ محبت کو سمجھنے کے لیے قرآن کریم کے ایک اسلوب خاص کو سمجھنا ضروری ہے۔

قرآن کریم نے محبت اور اطاعت دونوں طریقوں پر روشنی ڈالی ہے۔ محبت کی اہمیت پر فرمایا:

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآءُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ

فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝ (توبہ: ۲۴)

”اے نبی! آپ فرما دیں کہ اگر تمہارے باپ دادا اور تمہاری اولاد اور بھائی بند اور بیویاں اور خاندان اور وہ مال ودولت جو تم نے کمایا ہے اور وہ تجارت جس میں نقصان کا تمہیں اندیشہ لگا رہتا ہے اور تمہارے پسندیدہ مکانات تمہیں اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ محبوب ہیں اور راہ خدا میں جان قربان کرنے سے زیادہ مرغوب ہیں تو پھر اس نافرمانی کی سزا کا انتظار کرو یہاں تک کہ امر الٰہی آجائے اور خدا تعالیٰ نافرمانوں کو ہدایت نہیں کرتا۔“

یہ محبت کا پیرایہ ہے۔ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے تمام کائنات کے مقابلے میں زیادہ محبت کرنا ہی فرماں برداری ہے ورنہ نافرمانی اور فسق ہے۔

اتباع واطاعت کی اہمیت پر فرمایا:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ ۝ (آل عمران: ۳۱)

”اے نبی! آپ فرما دیں کہ اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو وہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطائیں معاف کر دے گا، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحیم ہے، آپ فرما دیں کہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تابع داری کرو۔ اگر تم نے منہ موڑا تو اللہ تعالیٰ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔“

اطاعت کی دو صورتیں ہیں — ایک اتباع واطاعت سزا کے خوف سے۔ دنیا میں اسلامی حکومت کی سزا ہو یا آخرت میں خدا کے عذاب کی سزا ہو۔

دوسری اتباع واطاعت اس کے رحم وکرم اور پرورش وپروردگاری اور اس کے

رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی خلق خدا کے ساتھ پیار و رحمت کے شوق میں۔

قرآن کی اصطلاح میں ان دونوں محرکوں اور طریقوں کو رجا اور خوف کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَآءِ.

قرآن کریم نے اس دوسرے پیرائے اور طریقے پر زیادہ زور دیا ہے۔ کیوں کہ یہ ضروری نہیں تھا کہ سیاسی قوت اور سزا کی طاقت دنیا میں ہمیشہ اسلام کے ہاتھ میں رہے اور آخرت کی سزا کل کی بات ہے، آج کی بات نہیں۔

قرآن کریم کی پہلی سورت (الفاتحہ) کے مضامین پر غور کرو۔

اس سورۂ مبارکہ میں انسان کے وجدانی جذبۂ عبادت اور فطری اقرار توحید کو ابھارنے اور جگانے کے لیے پہلے خدا کی پروردگاری اور ربوبیت اور پھر اس کے رحم و کرم کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد خدا کے جلال وقہر کا تصور پیش کیا اور وہ بھی عدل وانصاف کے عنوان سے۔ سیدھے عنوان سے نہیں۔

اس کے علاوہ قرآن کریم نے اس کائنات ہستی میں پھیلے ہوئے رحمت و جمال اور حسن فطرت کے مختلف پہلوؤں پر بار بار توجہ دلائی۔

کائنات میں اس کے قہر وجلال کے مظاہرے بھی بے شمار نظر آتے ہیں اور قرآن کریم نے ان کی طرف بھی انسانی توجہ کو مبذول کرایا مگر خالق کائنات کے رحم و کرم کے جلوؤں اور نظاروں کو قہر کے مناظر سے زیادہ اہمیت دی۔

توازن کب ختم ہوا؟:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ تک اتباع وفرماں برداری کے دونوں جذبوں کے درمیان توازن قایم رہا۔

رسول رحمت علیہ السلام اور آپ کے رفقائے کرام نے خلق خدا کو محبت، خدمت اور عدالت کے وہ منظر دکھائے کہ دنیا جھوم اٹھی، ضرورت پیش آئی تو سیاسی قوت کے ذریعے بھی برائی کو دبایا گیا۔ لیکن جب اسلام کے ہاتھ سے سیاسی قوت چھین کر

مسلمان خاندانوں اور بادشاہوں نے اپنے قبضے میں لے لی اور محبت اور خدمت کی جگہ شاہانہ تکبر اور شاہانہ تعیش کا دور دورہ ہو گیا تو اس وقت صوفیائے کرام کی خانقاہیں وجود میں آگئیں اور مشیت الٰہی نے محبت کی راہ سے اطاعت کے نظام کی حفاظت اور بقا کے لیے علمائے حق کی ایک جماعت کو اس مشن پر مامور کر دیا۔

اتباع شریعت اور شیخ ابن عربیؒ:

امام عبدالوہاب شعرانیؒ نے اپنی مشہور کتاب الیواقیت والجواہر شریعت اور طریقت کے درمیان تطبیق دینے کی غرض سے ۹۵۵ھ میں تالیف فرمائی اور اس میں حضرات صوفیا کے ترجمان کی حیثیت سے شیخ محی الدین ابن عربی (شیخ اکبرؒ) کی کتاب فتوحات مکیہ کو سامنے رکھا ہے اور اسی کے اقتباس نقل کیے، کیوں کہ شیخ اکبرؒ نے بعض اشاراتی افادات کا ان کی مخصوص اصطلاحات سے الگ کر کے سمجھنے کی وجہ سے کچھ لوگ شیخؒ کے خیالات پر طعن کرتے ہیں۔ شیخ اکبرؒ اتباع شریعت کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اس مبحث (۲۶) کو شروع کرتے ہیں۔ یہ کتاب شیخ اکبرؒ (متوفی ۶۳۸ھ) کی آخری تصنیف ہے، وصال سے تین سال پہلے شیخؒ اس کی تصنیف سے فارغ ہوئے۔

شیخ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"کسی ولی کے لیے یہ بات جائز نہیں کہ وہ کسی ایسی معصیت کے ارتکاب میں سبقت کرے، جس کے متعلق اسے بذریعہ کشف یہ معلوم ہو گیا ہو کہ اس معصیت میں مبتلا ہونا اس کے لیے مقدر ہو چکا ہے، مثلاً کسی ولی کو اس بات کا کشف ہوا کہ وہ رمضان شریف کی فلاں تاریخ کو بیمار پڑ جائے گا۔ اس نے اپنے اس کشف کی وجہ سے اس دن کا روزہ ہی نہ رکھا تو یہ اس کے لیے جائز نہیں ہے۔ اسے چاہیے کہ صبر کرے یہاں تک کہ وہ اس بیماری میں مبتلا ہو جائے، بیمار ہونے کے بعد وہ افطار کی اجازت سے فایدہ اٹھا سکتا ہے۔ کیوں کہ خدا تعالیٰ نے بیمار ہونے کے بعد ہی افطار کی

اجازت دی ہے۔ یہی مذہب ہے ہمارا اور محققین کا۔"

مطلب یہ ہے کہ محض کشف کی بنا پر افطار کرنے کا حکم شریعت الٰہی نے نہیں دیا بلکہ اس وقت دیا جب عملی طور پر اس حالت سے دوچار ہو جائے خواہ وہ ولی اپنے اس کشف پر کتنا ہی بھروسہ کیوں نہ رکھتا ہو۔

اس کی تائید میں دیکھیے کتنی عمدہ بات کہی ہے اور اس آیت سے کتنا عجیب استدلال کیا ہے۔

ایک بدری صحابی نے مکہ والوں کو مسلمانوں کے حالات سے باخبر کرنے کی کوشش کی، لیکن خدا نے بروقت اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے آگاہ کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے اس مسلمان کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ دیا کہ "اسے قتل کر دیا جائے یہ منافق ہو گیا ہے۔"

آپ نے جواب میں فرمایا:

مَا يُدْرِيكَ اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اَطَّلَعَ عَلٰى اَهْلِ بَدْرٍ فَقَالَ اِفْعَلُوْا مَاشِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ فَاِنَّهٗ لَمْ يَقُلْ قَدْ اَبَحْتُ لَكُمْ وَاِنَّمَا قَالَ قَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ.

"عمر! تمہیں نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کے متعلق فرمایا ہے" تم جو چاہو کرو، میں نے تمہیں بخش دیا۔" اس میں یہ نہیں فرمایا گیا ہے تمہارے لیے ہر گناہ مباح کر دیا گیا ہے، یہ فرمایا معاف کر دیا گیا۔"

مباح فرماتے تو یہ معلوم ہوتا کہ ان کے حق میں گناہ گناہ نہ رہا تھا، مغفرت کا لفظ بول کر یہ واضح کیا کہ گناہ تو گناہ ہی رہے گا، حرام بھی حرام ہی رہے گا، لیکن خدا اس کو معاف فرما دے گا۔

جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ جو امام الصوفیہ اور شیخ العارفین ہیں، اور بقول سلطان العارفین حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ صوفیہ میں ایسے ہیں جیسے فرشتوں میں حضرت جبرئیل علیہ السلام۔ ان سے پوچھا گیا:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ تکالیف شرعی ساقط ہو جاتی ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ

تکالیف شرعی تو وسیلہ ہیں وصول وقرب کا۔

صَدَقُوْا فِي الْوُصُوْلِ وَلٰكِنْ اِلٰى سَقَرٍ وَالَّذِيْ يَزْنِيْ وَيَسْرِقُ خَيْرٌ مِّمَّنْ يَّعْتَقِدُ هٰذَا وَلَوْ اَنِّيْ بَقِيْتُ اَلْفِ عَامٍ مَانَقَصْتُ مِنْ اَوْرَادِيْ شَيْئًا اِلَّا بِعُذْرٍ شَرْعِيٍّ.

"تصدیق کرو ان کے پہنچنے کی لیکن جہنم میں (پہنچنے کی) اور وہ شخص جو زنا اور چوری کرتا ہے اس شخص سے بہتر ہے جو اس قسم کا اعتقاد رکھے اور میں اگر ایک ہزار سال زندہ رہوں گا تو اپنے مشاغل ذکر میں کوئی کمی نہیں آنے دوں گا۔ ہاں! شرعی مجبوری کی بات الگ ہے۔"

اس سے یہ معلوم ہوا کہ کچھ گم راہ لوگوں نے "سقوط" کا مطلب یہی لینا شروع کر دیا تھا کہ شریعت کی تابع داری سے مستثنیٰ کر دیا جاتا ہے، ان لوگوں کو جنید بغدادیؒ قدس اللہ سرہٗ "واصل جہنم" دوزخی فرما رہے ہیں۔

خطاب شرعی کے بارے میں شیخ اکبرؒ دوسروں کے مقابلے میں بہت متشدد معلوم ہوتے ہیں۔ الزام تو صوفیوں پر اس بات کا ہے کہ یہ لوگ ظاہر شریعت کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے، مگر امام صوفیہ اس بارے میں جو رائے رکھتے ہیں وہ ملاحظہ ہو:

شیخ فتوحات مکیہ میں نماز نفل پر کلام کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اَقُوْلُ بِهٖ اِنَّ مَنْ غَلَبَ عَلَيْهِ حَالٌ اَوْ كَانَ مَجْنُوْنًا اَوْ صَبِيًّا فَهُوَ تَحْتَ خِطَابِ الشَّرْعِ خَلَافًا لِبَعْضِهِمْ.

"مغلوب الحال صوفی، مجنون اور بچہ یہ بھی خطاب شرع کے ماتحت ہیں، بعض کا اس میں خلاف ہے۔"

وجہ اس کی یہ ہے کہ کوئی حالت مومن کی ایسی نہیں ہے جس میں وہ بالکلیہ حکم شریعت سے خارج ہو جائے۔ دیکھو! بچے اور مجنون کو ان بعض چیزوں میں تصرف کی اجازت ہے، جس میں دوسروں کو نہیں۔ لیکن یہ اجازت کس نے دی؟ شریعت ہی نے تو دی ہے پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ حکم شرع سے یہ لوگ نکل گئے، بڑا عجیب نکتہ ہے جو شیخ نے بیان کیا ہے۔ (یواقیت: ۱۳۹۔۱۴۰)

اتباع شریعت اور اقوال صوفیائے کبار:

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں:

ہدایت کا دروازہ اسی پر کھلتا ہے جو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرے، ہمارا مذہب تصوف کتاب وسنت میں جکڑا ہوا ہے۔

ابو حفصؒ فرماتے ہیں:

جو شخص ہر وقت اپنے افعال واعمال کو شریعت کے ترازو میں نہیں تولتا اس کا شمار مردان خدا کی فہرست میں نہیں ہوتا۔

ابو سلیمان فرماتے ہیں:

میرے دل میں تصوف کے مختلف نکتے الہام ہوتے ہیں، مگر میں ان میں سے ان ہی کو قبول کرتا ہوں جن میں کتاب وسنت کے دونوں سچے گواہوں کی تصدیق وتائید حاصل ہو جاتی ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں:

میں نے ایک روز عورتوں کے ابتلاء سے محفوظ رہنے کے لیے دعا کرنے کا ارادہ کیا، لیکن مجھے پھر جلدی ہی اس بات کا خیال آیا کہ میرے لیے اس قسم کی دعا کیسے جائز ہو سکتی ہے جب کہ میرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی دعا نہیں کی، اس خیال کے آتے ہی میں نے دعا کا ارادہ ترک کر دیا۔

جلد:۵

پانچویں مجلس:

سماع اور مزامیر کے بارے میں تفصیلی بحث

مشائخ چشت میں حضرت محبوب الٰہی علیہ الرحمہ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ آپ کو سماع سے بڑی دل چسپی تھی۔ فوائد الفواد (اردو) کے مقدمے میں شیخ علیہ الرحمہ کی اس دل چسپی کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ آپ کبھی قوالوں کو دیکھ کر رونے لگتے تھے۔ کسی نے اس پر سوال کیا تو آپ نے فرمایا یہ قوال محبوب کے پیامی ہیں انھیں دیکھ کر تو رونا آنا ہی چاہیے۔

غیاث الدین تغلق کے زمانے میں علمائے شریعت کے ساتھ شیخ علیہ الرحمہ کے سماع کے جواز وعدم جواز پر مباحثے کا تذکرہ بھی آیا ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ بڑے بڑے مشائخ نے سماع کی اباحت کے بارے میں احادیث نبوی سے موازنہ کر کے شیخ علیہ الرحمہ کی خدمت میں بھیجا تا کہ شیخ علمائے دین کے ساتھ مناظرہ کر سکیں۔ اس مناظرے کی یہ روداد بھی نقل کی گئی ہے کہ مناظرے کی مجلس میں علمائے کرام نے امام ابو حنیفہؒ کا قول طلب کیا اور شیخ علیہ الرحمہ نے احادیث نبوی سے استدلال فرمایا۔

علما نے جب قول امام پیش کرنے کا تقاضا کیا تو شیخ مجلس سے اٹھ کر چلے آئے اور یہ فرمایا وہ شہر کیوں برباد نہیں ہو جاتا جہاں حدیث نبوی کے مقابلے میں قول ابی حنیفہؒ طلب کیا جاتا ہے اور احادیث نبوی سننے سے بھی انکار کیا جاتا ہے۔

(مجلس ۵، جلد ۵، صفحہ ۱۴۰)

یہاں تک کہ شیخ علیہ الرحمہ کی اس وصیت کا بھی تذکرہ آیا ہے کہ آپ نے اپنے جنازے کے ساتھ اہل سماع کو چلنے کی وصیت کی تھی، مگر اسے شیخ رکن الدین ملتانیؒ نے یہ کہہ کر رکوا دیا کہ اگر ایسا ہوا تو شیخ علیہ الرحمہ جنازے سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

اس ساری بحث سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ سماع سے کیا مراد ہے؟ سماع بالمزامیر یا سماع سادہ بلا مزامیر۔

ہوسکتا ہے کہ فوائد الفواد اردو کے مقدمہ نگار صاحب نے چشتی بزرگوں کی موجودہ خانقاہوں میں سماع بالمزامیر کے عام رواج کو دیکھ کر اس مسئلے کو مختصر رکھا ہو، لیکن صوفیائے ربانی میں قرآن وحدیث اور فقہ حنفی پر ایک وسیع النظر عالم اور محبت حق اور خوف آخرت کے جذبات سے معمور دل رکھنے والے شیخ طریقت کے تعلق سے اس نزاعی مسئلے کو تشنہ چھوڑنا کسی طرح شیخ علیہ الرحمہ کے ساتھ عقیدت وانصاف نہیں کہا جاسکتا۔

ہمیں شیخ علیہ الرحمہ کے ملفوظات میں اس مسئلے پر کئی جگہ بحث ملتی ہے۔ پہلی بحث جلد ۳، مجلس ۵، صفحہ ۵۱۲ تا ۵۱۷ میں کی گئی ہے۔ اس مجلس میں آپ نے فرمایا:

''من منع کردہ ام کہ مزامیر ومحرمات درمیان نباشد۔''

''میں نے منع کیا ہے کہ مزامیر ومحرمات نہ ہوں گے۔''

پھر فرمایا نماز کے اندر امام کو کوئی عورت کسی غلطی پر متنبہ کرے تو ہتھیلیاں نہ بجائے کہ اس سے کھیل تماشے کے ساتھ مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ پھر سماع میں تو اور بھی ضروری ہے کہ یہ چیزیں (تالیاں) بجانا وغیرہ نہ ہو۔

سیر الاولیا کے مؤلف امیر خورد نے بھی یہ الفاظ نقل کیے ہیں۔ (صفحہ ۷۹۱)

دوسری بحث جلد ۵، مجلس ۲۰، صفحہ ۱۰۲۱ میں کی گئی ہے، اس میں سماع کے جائز ہونے کی چار شرطیں بیان کی گئی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

''ہرگاہ کہ چند چیز موجود شود آنگاہ سماع شنود۔''

پہلی شرط: مُسمِع، گوئندہ است، آدمی باید کہ مرد باشد ومرد تمام باشد، کودک نباشد وعورت نباشد۔''

''گانے والا مرد کامل ہو یعنی نوعمر لڑکا اور عورت نہ ہو۔''

دوسری شرط: مَسموع، آنچہ مے گویند باید کہ ہزل وفحش نباشد۔

''جو کچھ پڑھا اور گایا جائے وہ بے ہودہ گوئی اور بے حیائی کا کلام نہ ہو۔''

تیسری شرط: مُستمِع، آنکہ مے شنود او باید کہ حق شنود و مملو از یاد حق باشد۔

''جو کلام سنا جائے وہ حق کے لیے سنا جائے اور وہ یاد حق سے بھرا ہو۔''

چوتھی شرط: آلہ سماع، آں مزامیر است چوں چنگ ورباب ومثل آں باید کہ درمیان نہ باشد۔

''سماع کا آلہ وہ مزامیر ہے جیسے چنگ ورباب اور انہی جیسی چیزیں وہ سماع کے اندر نہ ہوں۔''

''ایں چنیں سماع حلال است۔ آنگاہ فرمود کہ سماع صوتے است، موزوں آں چرا حرام باشد؟''

''اس قسم کا سماع حلال ہے۔ پھر فرمایا، سماع ایک موزوں آواز ہے یہ حرام کیسے ہوسکتی ہے؟''

وآں چہ مے گویند کلامیست مفہوم المعنی آں چہ حرام باشد؟ دیگر تحریک قلب است آں اگر تحریک بیاد حق باشد مستحب است و اگر میل بہ فساد باشد حرام است۔''

''گانے والے جو کچھ گاتے ہیں وہ بامعنی کلام ہے وہ کیسے حرام ہوسکتا ہے؟ پھر یہ سماع اگر یاد حق کی قلبی تحریک اور دلی جذبے کے تحت ہے تو مستحب ہے اور اگر گندے جذبے کے تحت ہے تو حرام ہے۔''

اقبالؒ قلبی تحریک کو سوز وگداز کے جذبے سے تعبیر کرتا ہے اور اس جذبے کو سجدے کے لیے ضروری سمجھتا ہے:

پیکر نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا
اس کو میسر نہیں سوز و گداز سجود

مزامیر عربی لفظ مزمار کی جمع ہے جس کے معنی بانسری کے ہیں۔ لیکن عرف عام میں ہر قسم کے باجے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور عوام ہر قسم کے باجے کو مزمار کہتے ہیں۔ (لغات کشوری: ۶۹۳)

تیسری بحث جلد ۵، مجلس ۵، صفحہ ۹۵۳ پر کی گئی ہے جو حسب ذیل ہے۔

اجتہادی اختلاف میں حاکم کی رائے:

اس کے بعد سماع کا ذکر نکلا۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ شاید اس وقت حکم ہوگیا ہے کہ مخدوم جب چاہیں سماع سنیں ان کے لیے حلال ہے۔ خواجہ ذکر اللہ بالخیرؒ نے فرمایا جو چیز حرام ہے کسی کے حکم سے حلال نہیں ہوجاتی اور جو چیز حلال ہے وہ کسی کے حکم سے حرام نہیں ہوسکتی اور اگر ہم ایسے مسئلے پر آئیں جس کے بارے میں اختلاف ہے جیسے کہ یہی سماع کا فتوی ہے تو امام شافعیؒ ہمارے علما کے برخلاف سماع کو دف اور چغانہ ڈفلی کے ساتھ مباح رکھتے ہیں۔ اب اس اختلاف میں حاکم جس رائے کے مطابق حکم دے ویسا ہی ہوگا۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا انہی دنوں بعض آستانے دار درویشوں نے ایک ایسے مجمع میں جہاں چنگ و رباب اور مزامیر تھے خوب رقص کیا۔ خواجہ ذکر اللہ بالخیرؒ نے فرمایا کہ انہوں نے اچھا نہیں کیا۔ جو چیز غیر شرعی ہے ناپسندیدہ ہے۔ اس کے بعد ایک آدمی نے کہا کہ جب وہ لوگ اس جگہ سے باہر آئے تو ان سے کہا گیا کہ یہ آپ حضرات نے کیا کیا؟ اس محفل میں مزامیر تھے سماع کیوں سنا اور رقص کیوں کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم سماع میں ایسے ڈوبے ہوئے تھے کہ پتہ ہی نہ چلا کہ وہاں مزامیر ہیں یا نہیں۔ خواجہ ذکر اللہ بالخیرؒ نے یہ بات سنی تو فرمایا کہ یہ جواب بھی کچھ نہیں ہے یہ بات تو ہر گناہ کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ (جلد ۵، مجلس ۵، صفحہ ۹۵۲)

تلاوت قرآن شعر گوئی پر غالب ہے:

سماع یعنی عارفانہ شعری کلام سے حضرت شیخ علیہ الرحمہ کو بڑی دل چسپی اور اس کا بڑا ذوق تھا لیکن اسی کے ساتھ شیخ علیہ الرحمہ اس بات کی بھی ہدایت فرماتے تھے کہ قرآن کریم کی تلاوت شعر گوئی پر غالب رہنی چاہیے۔

خواجہ حسنؒ نے عرض کیا:

''بندہ عرض داشت کرد کہ بارہا از لفظ مبارک مخدوم شنیدہ شدہ است مے باید کہ قرآن خواندن بر شعر گفتن غالب آید، بہ برکت نفس مخدوم بندہ ہر روز قرآن خواند امید آنکہ از آنچہ گفتہ شدہ است و مے شود ہم توبہ کردہ آید ان شاء اللہ تعالی ایں عرض داشت پسندیدہ افتاد۔''

''یعنی بندہ نے عرض کیا کہ زبان مبارک سے بارہا سنا گیا ہے کہ قرآن کی تلاوت کرنا شعر گوئی پر غالب رہنا چاہیے، مخدوم کے حکم کی برکت سے بندہ روزانہ یہ امید رکھ کر قرآن پڑھتا ہے کہ جو کچھ شعری کلام کہا جاچکا ہے اور جو کچھ کہا جائے گا اس سے بھی توبہ کرلی جائے۔''

یہ گذارش پسند کی گئی۔

بارہا از لفظ، کے الفاظ یہ بتا رہے ہیں کہ شیخ علیہ الرحمہ برابر یہ تاکید فرماتے تھے۔ قرآن کریم کی تلاوت کا عمل زیادہ سے زیادہ کیا جائے اور سماع اس کے مقابلے میں کم سنا جائے۔

قرآن کریم سے عشق تھا:

شیخ علیہ الرحمہ کی یہ ہدایت بتا رہی ہے کہ اس صوفی ربانی کے دل میں کلام رب العالمین کی محبت کا جذبہ فروزاں تھا۔

شیخؒ خود حافظ قرآن تھے اور شیخ نے تجوید قرآن کا علم اپنے مرشد حق حضرت بابا صاحبؒ سے حاصل کیا تھا۔ شیخ اپنے گھر والوں کے لیے اپنی خانقاہ میں اچھے قاریوں اور حافظوں کا انتظام کرتے تھے جو انھیں قرآن پڑھاتے تھے۔

خلیق نظامی صاحبؒ کے الفاظ میں شیخؒ کی خانقاہ حفظ خانہ معلوم ہوتی تھی۔ شیخؒ کے کلام میں جو تاثیر تھی وہ بقول حافظ شیرازی کلام ربانی کا اثر تھا:

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ
بقرآنے کہ اندر سینہ داری

حافظ اپنی عبادت اور اپنے اخلاق کو قرآن کریم کی برکت قرار دیتا ہے:

صبح خیزی و سلامت طلبی چوں حافظ
ہر چہ کردم ہمہ از دولت قرآن کردم

شیخ علیہ الرحمہ قرآن کریم کی روحانی تاثیر سے اہل تصوف کو یہ کہہ کر آگاہ کرتے رہتے تھے کہ قرآن کریم سے جو سلوک (معرفت حق) حاصل ہوتا ہے وہ پائیدار ہوتا ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ نے سماع میں سنائے جانے والے شعری کلام کے لیے یہ ضروری ہدایت فرمائی کہ اس میں یاد حق اور ذکر حق موجود ہو اور شیخ علیہ الرحمہ کے سامنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث مبارک تھی۔

لَا تُكْثِرُ الْكَلَامَ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللّٰهِ فَإِنَّ كَثْرَةَ الْكَلَامِ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللّٰهِ قَسْوَةٌ لِلْقَلْبِ وَإِنَّ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنَ اللّٰهِ الْقَلْبُ الْقَاسِيُّ.

(مشکوٰۃ:۱۹۸ عن ابن عمر رضی اللہ عنہ بہ حوالہ ترمذی)

"آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام نہ کیا کرو، کیوں کہ ایسے کلام سے جو ذکر حق سے خالی ہو قلب میں قساوت اور سختی پیدا ہوتی ہے اور سخت دل آدمی خدا تعالیٰ سے تمام برے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ دور ہوتا ہے۔"

جہاں تک خوش آوازی اور لب و لہجے کے حسن و اثر کا تعلق ہے وہ خدا تعالیٰ کا انعام قرار دیا گیا ہے اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے:

حَسِّنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ فَإِنَّ الصَّوْتَ الْحَسَنَ يَزِيدُ الْقُرْآنَ حُسْنًا. (مشکوٰۃ:۱۹۱ عن براء ابن عازب)

"قرآن کریم کو اپنی آوازوں سے حسین بناؤ کیوں کہ اچھی آواز سے تلاوت کرنا قرآن کریم کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔"

قرآن کریم میں خوش آوازی کی اتنی اہمیت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا:

لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ.

"وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو قرآن کریم کو خوش آوازی سے تلاوت نہ کرے۔"

ائمہ فن قرأت نے فرمایا ہے کہ حسن لہجہ سے آواز کا قدرتی اور فطری حسن مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کمال درجہ بہ درجہ تمام انسانوں بلکہ پرندوں کو بھی عطا کیا ہے۔
وہ خوش آوازی جو باقاعدہ فن تجوید کی تعلیم و مشق سے حاصل ہوتی ہے ہر شخص اس کا مکلف نہیں بنایا گیا۔

سماع کے مسئلے کی آزمائش:

سماع کے مسئلے نے شیخ علیہ الرحمہ کے حق میں ایک ایسی آزمائش کی صورت اختیار کر لی تھی جس آزمائش سے حضرات انبیائے کرام علیہم السلام اور خاص طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گزرنا پڑا تھا۔ اور یہ آزمائش تھی اپنوں کے حسد و عناد کی۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی قوم (عرب) کو آپ کے پیغام سے زیادہ آپ کی عظمت و فضیلت کے مقام کی جلن اور کھولن تھی۔ وہ کہتے تھے:

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْآنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ. (زخرف:۳۱)

"یہ قرآن مکہ معظمہ اور طائف کی دو بڑی بستیوں کے کسی شخص (ابوجہل اور عروہ ابن مسعود) پر کیوں نازل نہیں کیا گیا۔"

یہود و نصاریٰ کے بارے میں قرآن کریم نے کہا:

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلٰى مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ.
(نساء:۵۴)

"کیا یہ لوگ اس بڑائی پر حسد کرتے ہیں جو خدا تعالیٰ نے آپ کو عطا کی ہے۔"

ان اہل کتاب کو اس بات کی جلن تھی کہ آخری نبی ہمارے (بنی اسحاق) میں سے کیوں نہ آیا اور یہ عظمت بنی اسماعیل (اہل عرب) کے حصے میں کیوں آئی؟

مشائخ چشت میں شیخ علیہ الرحمہ کو ہر طبقے (علمائے شریعت، اہل روحانیت، رؤسائے شہر اور شاعروں وادیبوں) میں جو قبولیت وعقیدت حاصل تھی اس کی مثالیں بہت کم نظر آتی ہیں۔

علمائے شرع میں ایک سے ایک بڑا عالم، اہل روحانیت میں ایک سے ایک بڑا صاحبِ دل اور امراء ورؤسا اور شاعروں اور ادیبوں میں اپنے عہد کے بڑے بڑے بااثر لوگ اس شمع علم وروحانیت کے گرد پروانوں کی طرح قربان ہوتے نظر آتے ہیں لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ حسد وعناد کا یہ مظاہرہ اہلِ اقتدار اور شاہی دربار کی طرف سے نہیں کیا گیا بلکہ ان اہل علم کی طرف سے کیا گیا جن کے دل شیخ علیہ الرحمہ کی عظمت کے قائل تھے۔ قرآن کریم نے اہل کتاب کے بارے میں کہا:

الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ. (بقرہ:۱۴۶)

"جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توراۃ) دی وہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)
کو ایک نبی کی حیثیت سے اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح یہ لوگ اپنی
اولاد کو پہچانتے ہیں۔"

قرآن کی یہ بات ان علمائے کرام پر پوری طرح صادق آتی ہے جو سماع کے اختلاف کی آڑ لے کر شیخؒ کی مقبولیت کو اپنے دل کی جلن کا نشانہ بنا رہے تھے۔

اکابر مشائخ تصوف کے پانچ ستون حضرت اجمیریؒ، حضرت قطب صاحبؒ، حضرت بابا صاحبؒ، حضرت سلطان جیؒ اور حضرت مخدوم صاحبؒ جن مسلمان بادشاہوں کے دور میں تھے وہ (ایک دو کے سوا) سب دین داری اور عدل پروری میں ممتاز مقام کے مالک تھے۔

سلطان شمس الدین التمشؒ، غیاث الدین بلبن، علاء الدین خلجی، قطب الدین مبارک شاہ، غیاث الدین تغلق، محمد ابن تغلق، فیروز شاہ تغلق۔ ان میں اکثر سلاطین

دین دار تھے، علاء الدین خلجی کی سخت مزاجی مشہور ہے، اس نے فوجی فتوحات کے نشے میں اسلام کے مقابلے میں ایک نئے مذہب کو رائج کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن سیاسی فتوحات میں حضرت سلطان جیؒ کی کرامات کے ظہور کی وجہ سے اس کے پتھر جیسے دل میں بھی آپ کی عقیدت نے جگہ بنالی تھی۔

اس کا بیٹا قطب الدین مبارک شاہ البتہ شیخ علیہ الرحمہ سے انتہائی بغض وکینہ رکھتا تھا لیکن قدرت نے اسے صرف پانچ ماہ حکومت کی بہار دکھا کر اٹھالیا تھا۔

پھر تغلق خاندان میں محمد ابن تغلق پر باوجود نیک اعمال ہونے کے دیوانگی کا یہ دورہ پڑا تھا کہ اس نے دارالسلطنت دہلی کو دولت آباد (دکن) میں منتقل کرنے کا اعلان کیا تھا اور اس تبدیلی آبادی میں حضرات مشائخ اور صوفیا کو بھی سخت تکلیفیں اٹھانی پڑی تھیں۔

حضرت مخدوم چراغ دہلیؒ اور شیخ شہاب الدینؒ جیسے بزرگ انسانوں کے ساتھ جو بربریت کا سلوک کیا وہ مشہور ہے لیکن اس بد دماغ سلطان کے ہاتھوں جب حکومت بربادی کے کنارے پہنچ گئی تو قدرت نے فیروز شاہ تغلق کو تخت سلطنت پر بٹھایا۔

حضرت مخدوم چراغ دہلیؒ ان خواص میں سے تھے جنہوں نے آگے بڑھ کر اس کی تخت نشینی کی تائید کی۔

تاریخ نے فیروز شاہ کے ۳۸ سالہ دور کو دین داری اور جہاں داری دونوں لحاظ سے نہایت کامیاب دور کہا ہے۔

اس مختصر تبصرے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ان پانچوں اکابر تصوف کا دور سلطنت و اقتدار کے لحاظ سے مجموعی حیثیت سے اسلام اور اسلامی دعوت وتربیت کے لیے معاون وسازگار دور تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس دور کے اکابر صوفیا نے مسلم اقتدار سے کوئی دنیوی فائدہ حاصل نہیں کیا بلکہ سیاسی مفادات کی چھینٹوں سے بھی اپنے دامن پاک صاف رکھے اور اس وجہ سے ان مسلم سلاطین کی نظروں میں ان حضرات کی بے پناہ وقعت قایم رہی۔

امیر خوردؒ نے لکھا ہے کہ سلطان جی کے حاسد گروہ کو علاء الدین خلجی اور اس کے سخت مخالف شیخ بیٹے قطب الدین کے عہد میں یہ موقع نہیں ملا کہ انھیں دربار سلطنت میں بلا کر اپنی آرزوئے حسد پوری کرے۔ لیکن فیروز شاہ کے عہد میں انھیں موقعہ مل گیا۔

گھر کے آدمی نے اگوائی کی:

شیخ علیہ الرحمہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت سے بھی حصہ ملنا مقدر تھا کہ شیخؒ کی حاسد جماعت کی قیادت شیخ رحمتہ اللہ علیہ کے ایک پروردۂ خاص اور مرید شیخ زادہ حسام الدین فرجام نے کی۔ آخر حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کنعان اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابولہب کی مثالیں بھی موجود ہیں کہ ایک بیٹے، بیوی، اور چچا نے نہ صرف انکار کی راہ اپنائی بلکہ مخالفین کی مددگاری بھی کرتے رہے۔

شیخ زادہ نے اس شفقت ومحبت کے مجسمے کو قریب سے برتنے کے باوجود اپنے محسن کے خلاف سازش کیوں کی؟

مؤرخ تاریخ فیروز شاہی نے یہ لکھا ہے کہ شیخ زادہ کو سلطان قطب الدین کے دربار میں قربت حاصل کرنے کا یہی راستہ نظر آیا کہ وہ سلطان جیؒ کے ساتھ عداوت ظاہر کرے اور سلطان جیؒ کے مخالف بادشاہ سے دنیوی مفاد حاصل کرے۔

اسی دنیوی خواہش نے اس پر غلبہ کیا اور وہ بچپن کی غربت اور شیخؒ کے احسانات کو بھول گیا اور پھر اس دنیا پرستی کے روگ میں مبتلا رہ کر فیروز شاہ کے عہد میں اپنے محسن و منعم کے مخالفین کا آلۂ کار بن گیا۔

قاضی حمید الدین ناگوریؒ اور قاضی منہاج الدین جوزجانیؒ کے متعلق شیخؒ فرماتے تھے کہ دہلی میں ان دونوں قاضیوں کی وجہ سے سماع کا رواج زیادہ ہوا۔ علما نے قاضی حمید الدینؒ کے خلاف سماع کے عدم جواز کا ایک فتویٰ مرتب کیا تھا، وہ فتویٰ بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ ذاتی طور پر مسئلۂ سماع سے بالکل ناواقف تھا۔ اسے تعجب

ہوا کہ جب علما کا یہ فتویٰ ہے تو پھر سلطان المشائخ اسے کیوں تسلیم نہیں کرتے۔

اس نے حکم دیا کہ دربار میں تمام علما اور سلطان المشائخ کو جمع کیا جائے اور بحث ومباحثہ کر کے اس کا فیصلہ کیا جائے۔ چناں چہ مجلس مناظرہ منعقد ہوئی۔

مجلس میں سلطنت کے نائب قاضی جلال الدین لوالجی نے شیخؒ کے ساتھ گستاخانہ انداز میں گفتگو کی اور شیخ حسام الدین نے سلطان جیؒ کی مجلس سماع پر نکتہ چینی کر کے بات شروع کی۔

شیخؒ نے حسام الدین سے ایک اصولی سوال کیا کہ فضول باتیں مت کرو، پہلے یہ بتاؤ کہ سماع کا مطلب کیا ہے؟ حسام الدین نے کہا میں اس کے معنی نہیں جانتا، علما کا یہ فتویٰ موجود ہے کہ سماع حرام ہے۔

شیخؒ نے فرمایا جب تم سماع کے معنی ہی نہیں جانتے تو پھر اس کی حلت وحرمت پر تم سے کیا بات چیت ہو سکتی ہے؟ پھر طویل گفتگو کے بعد قاضی صاحب نے بادشاہ سے کہا کہ آپ سماع کی حرمت کا حکم جاری کر دیں اور مذہب امام ابوحنیفہؒ کے مطابق فیصلہ کر دیں لیکن شیخ نے بادشاہ کو حکم دینے سے منع کیا اور بادشاہ نے شیخ کا مشورہ قبول کر لیا۔

اس مناظرے کا جو دلچسپ پہلو ہے وہ شیخ نے واپس آ کر قاضی محی الدین کاشانیؒ اور امیر خسروؒ کو بتایا اور فرمایا:

دہلی کے اہل علم و دانش میری عداوت اور حسد سے بھرے ہوئے تھے۔ میدان مخالفت کو وسیع پا کر انہوں نے مخالفت کی بہت سی باتیں کیں اور ایک عجیب بات جو آج مشاہدے میں آئی وہ یہ کہ استدلال کے میدان میں وہ حضور علیہ السلام کی احادیثِ صحیحہ کو بھی نہیں سنتے تھے اور یہ بھی کہے جاتے تھے کہ ہمارے شہر میں حدیث سے فقہ کی روایت پر عمل مقدم ہے۔

یہ باتیں وہی لوگ کرتے ہیں جن کا حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر عقیدہ نہیں ہوتا۔ جب بھی ان کے سامنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث صحیح پیش کی جاتی تو وہ منع کرتے اور کہتے کہ یہ حدیث تو امام شافعیؒ کی دلیل

ہے جو ہمارے علما (احناف) کے مخالف ہیں، اس لیے ہم یہ حدیث نہیں سنتے۔ خدا جانے یہ کیا زمانہ آگیا ہے جس شہر میں اس قسم کے مکابرے (فضیلت میں مقابلے) کیے جاتے ہوں وہ کیسے آباد رہ سکتا ہے؟ جب عام مسلمان قاضی شہر (شیخ جلال الدین لوالجی) اور دوسرے علمائے شہر کے بارے میں یہ سنیں گے کہ اس شہر میں حدیث پر عمل نہیں ہوتا تو وہ حدیث نبوی کے ساتھ عقیدت میں کیسے پختہ ہوں گے۔

(سیرالاولیا:۸۰۶)

اس واقعے کے چار سال کے بعد وہ علما جو اس مقابلے میں شریک تھے دیوگیر جلا وطن کیے گئے اور انہوں نے وہیں وفات پائی اور شہر دہلی میں (بہ عہد محمد ابن تغلق) بڑی تباہی آئی۔

مزامیر کے معاملے میں مکمل احتیاط

سماع کے بارے میں جو نظریہ حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے واضح فرمایا ہے اس کے روشنی میں چند باتیں قابل غور ہیں۔

۱۔ شیخ علیہ الرحمہ کے مذکورہ نظریے پر اس عہد کے علما کو آخر اعتراض کیا تھا؟ یہ بات سمجھ میں آنے کے قابل نہیں۔

شیخ علیہ الرحمہ کی مجلسیں ۱۸۸ منعقد ہوئیں جو ۱۵ سال پر پھیلی ہوئی تھیں۔ شیخؒ نے کسی مجلس میں مزامیر کی وکالت نہیں فرمائی یہاں تک کہ بخاری کی صحیح روایت کے مطابق انصار کی لڑکیوں کے دف بجانے کا واقعہ بھی بیان نہیں کیا۔

صوفیائے کرام کے قصوں میں ضرور اس کا ذکر آیا لیکن شیخ علیہ الرحمہ نے اس معاملے میں اپنی ذاتی دل چسپی کا اظہار نہیں فرمایا۔

۲۔ کیا وہ علمائے کرام صرف سماع کے لفظ سے بھڑک جاتے تھے یا وہ شیخؒ کے سماع کو دوسرے حضرات کے سماع بالمزامیر پر قیاس کر کے شور مچاتے تھے؟

فوائدالفواد کے اردو مترجم نے شیخ علیہ الرحمہ کے لفظِ سماع کا ترجمہ قوسین میں قوالی کے لفظ سے کیا ہے اور یہ احتیاط کے خلاف ہے۔ کیوں کہ قوالی کا لفظ موجودہ قوالی کی طرف ذہن کو لے جاتا ہے کیا ایسا ہی اس دور کے صوفی حضرات، شیخ علیہ الرحمہ کے سماع کی اپنے خیال و ذوق کے مطابق ترجمانی کرتے تھے اور اس سے علما میں غلط فہمی پھیلتی تھی؟

شیخ علیہ الرحمہ نے سماع کا جو مفہوم بیان کیا ہے اس کی روشنی میں سماع کا ترجمہ حمد گوئی، نعت گوئی اور کلامِ معرفت ہو سکتا ہے۔

سماع کے بارے میں ایک لطیفہ:

حضرت سید گیسودرازؒ (جانشین حضرت مخدوم چراغ دہلویؒ) نے حضرت محبوب الٰہیؒ کے سماع سے متعلق ایک لطیفہ بیان کیا اور وہ یہ کہ ایک روز شیخ علیہ الرحمہ کو سماع سننے کی خواہش ہوئی۔ مشہور قوال حسن میمندی موجود نہ تھا۔ شیخؒ کے خادم محمد اقبال اور بعض دوسرے خدام نے سماع سنایا۔ شیخؒ پر کیفیت طاری ہوگئی اور آپ نے اپنے کپڑے اتار کر ان لوگوں کو دے دیے۔ اس کے بعد ایک دن حسن میمندی سے ان لوگوں نے اپنے سماع کا حال بیان کیا اور شیخؒ کے انعام واکرام کا ذکر کیا، ان کا مقصد حسن کو چھیڑنا تھا۔

حسن میمندی نے اس چھیڑخانی کا جواب دیا اور کہا کہ شیخ پر اس دن گریہ وبکا اس لیے طاری ہوا کہ میں کن لوگوں کے ہاتھ میں پھنس گیا ہوں ان سے چھٹکارا کس طرح ملے گا؟

شیخؒ ان لوگوں کی باتیں سن رہے تھے۔ آپ نے حسن کو بلا کر پوچھا۔ یہ لوگ کیا کہہ رہے تھے؟ حسن نے بتایا اور اپنا جواب بھی سنایا۔

شیخ علیہ الرحمہ نے مسکرا کر فرمایا، حسن! تم سچ کہتے ہو، کچھ بات یہ بھی تھی۔

(منادی سید گیسودراز نمبر ۱۹۸۹ء)

سماع میں وجد کی بحث:

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے سماع میں وجد کی کیفیت کے حوالے سے اسمائے حسنیٰ پر گفتگو فرمائی اور خدا کے صفتی نام الواجد کا مطلب بیان کیا۔ (جلد اول، مجلس ۳۱، صفحہ ۲۹۷)

شیخ علیہ الرحمہ کے ارشادات کا مطلب سمجھنے کے لیے پہلے وجد کی حقیقت جاننی ضروری ہے۔ عربی میں وجد مادہ ہے جس سے وجود، وجدان، جدت، ایجاد، مشتق ہوئے ہیں۔ اس مادے کا بنیادی مفہوم پانا اور حاصل کرنا ہے۔

وجدان۔ سمجھنے اور جاننے کی فطری قوت کا نام ہے۔ اسی باطنی قوت کے جوش میں آنے کو وجد کہا جاتا ہے، وہ جوش احساسِ خوشی کا ہو یا احساسِ غم کا۔

حضرت حق تعالیٰ جل مجدہ کی ذاتِ عارضی اور فانی تاثرات سے پاک ہے۔ اس کی تمام صفات حسنہ قدیم ہیں، ازلی اور ابدی ہیں۔ اس لیے وجد کی کیفیت خدا کی ذات پاک کے منافی ہے اور واجد کا مفہوم شکور کی طرح ہے یعنی بندے کے باطن میں جوش کی کیفیت پیدا کرنے والا اور شکور یعنی بندے کی شکرگذاری کو قبول کرنے والا۔

وجد اور جدۃ کے الفاظ کو اہل عرب دولت اور طاقت کے مفہوم میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے علما نے واجد کو غنی کے معنی میں بھی لیا ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ کے تذکرہ نگار صاحب نے فوائد الفواد کے حاشیہ پر عوارف المعارف کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے:

ایک بدو نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عربی کے دو شعر پڑھے۔

فَتَوَاجَدَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَوَاجَدَ اَصْحَابُهٗ مَعَهٗ حَتّٰى سَقَطَ رِدَآءُهٗ عَنْ مَنْكِبِهٖ.

"ان اشعار پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے وجد کیا یہاں تک کہ آپ کی چادر کاندھوں سے گر گئی۔"

اس نوٹ کے سلسلے میں پہلی گذارش تو یہ ہے کہ اگر یہ روایت کسی مستند کتابِ حدیث میں ہوتی تو حضرت شیخ سہروردیؒ اس کا حوالہ دیتے جیسا کہ شیخ کا معمول ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عربی لغت میں تواجد (باب تفاعل) کے مفہوم میں تکلف اور تصنع ہے۔ اہل لغت نے اس کے معنی میں لکھا ہے کہ دکھاوے کے طور پر محبت یا افسوس کا اظہار کرنا۔ (تسہیل العربیہ: ۹۴۳)

یہ واقعہ اگر درست ہے تو اس کا راوی جو صاحبِ زبان ہوگا وہ اس صیغے کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی اس کیفیت کو بیان نہیں کرسکتا تھا۔

تیسری بات یہ کہ غلبہ حال (باطن کی کیفیت سے عقل وہوش کا مغلوب ہوجانا) حضرت انبیائے کرام علیہم السلام کی شان کے خلاف ہے۔

حضرت انبیا علیہم السلام کی تمام باطنی اور ذہنی صلاحیتیں عام انسانوں (ولی ہوں یا غیرولی) کے مقابلے میں ممتاز وقوی ہوتی ہیں۔ فطری امتیاز کے علاوہ ملائکۃ اللہ

حضرات انبیا کی مکمل نگرانی پر مامور ہوتے ہیں۔ وہ عالم بشر میں ایک فرد بشر ہوتے ہیں لیکن ایسے ہی بشر جیسے عام پتھروں میں ہیرا ہوتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر خوف کی ایک خاص کیفیت اس وقت طاری ہوئی جب آپ اپنے کم زور ۳۱۳ ساتھیوں کو لے کر ایک ہزار طاقت ور مسلح دشمنوں کے مقابلے میں آئے اور ساری رات ایک پہاڑی پر خدا کی شان بے نیازی کے پیش نظر اسلام کی نصرت کے لیے دعا فرماتے رہے اور جب ابوبکر صدیقؓ نے اس جھونپڑی میں گھس کر دیکھا تو آپ کے کندھے سے چادر گری ہوئی تھی اور آپ بڑی بے خودی کے ساتھ دعا میں مصروف تھے۔

خوشی اور مسرت کی کیفیت کا مظاہرہ اس وقت ہوا جب مدینہ منورہ کے ایک خوش گوار موسم میں آپ شہر سے باہر ایک باغ کے کنویں کی مینڈ پر پیر لٹکائے بیٹھے تھے اور جب ابوہریرہؓ آپ کی خدمت میں باغ کی نالی کے اندر سے (کیوں کہ دروازہ بند تھا) گھس کر آپ کے پاس پہنچے تھے اور اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا کے رحم و کرم کی شان کا جو اثر تھا اس سے متاثر ہو کر آپ نے حضرت ابوہریرہؓ کے ذریعے امت کو یہ پیغام بھیجا تھا:

مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَدَخَلَ الْجَنَّةَ.

"جو شخص کلمہ توحید لا الہ الا اللہ کا اقرار کرے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔"

لیکن جب عمرؓ نے حاضر خدمت ہو کر یہ فرمایا تھا حضور! یہ بشارت سن کر لوگ نماز روزہ کی عبادات سے بے پرواہ ہو جائیں گے تو آپ نے حضرت ابوہریرہؓ کو منع کر دیا تھا۔ کیوں کہ حضرت عمرؓ کے توجہ دلانے پر آپ کے دل سے وہ اثر رحمت دور ہو گیا تھا۔ یہ واقعہ مسلم شریف کے حوالے سے صاحب مشکوٰۃ (۱۵) نے بیان کیا ہے، جس کے راوی حضرت ابوہریرہؓ ہیں۔

شیخ علیہ الرحمہ نے یہ واقعہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے حوالے سے بیان فرمایا اور صوفیائے کرام کے حال کا تعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کیفیت سے قایم کیا جو اس وقت آپ پر طاری تھی۔ شیخؒ کے الفاظ یہ ہیں:

"مشایخ راہ و مردان حق را حالے کہ پیدا مے شود از انجاست کہ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نیز احوال بود۔"

(جلد ۴، مجلس ۳۹، صفحہ ۸۴۲)

"صوفیائے کرام پر جو حال طاری ہوتا ہے اس کی بنیاد اور اس کی اصل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حال سے وابستہ ہے۔"

حضرت شیخ علیہ الرحمہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صوفیائے کرام کا وجد و حال (جس میں ہوش و حواس مغلوب ہو جاتے ہیں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر بھی موجود تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر خوف اور امید کی دونوں کیفیتیں آپ کی شان نبوت کے مطابق طاری ہوتی تھیں اور صوفیائے کرام پر یہ دونوں حال اور دونوں کیفیتیں ان کے درجۂ ولایت (جو نبوت سے بدرجہا فروتر اور کم زور ہے) طاری ہوتی ہیں۔

مولانا رومیؒ نے سماع کی یہ صوفیانہ مصلحت بیان کی ہے ۔

پس غذائے عاشقاں آمد سماع — کہ درو باشد خیال اجتماع
قوت گیر و خیالات ضمیر — بلکہ صورت گرد داز بانگ صفیر
آتش عشق از نوا ہا گشت تیز — آں چناں کہ آتش آں جوز ریز

"سماع اہل عشق کی غذا ہے اس سے اس کے خیالات یک سو ہو جاتے ہیں اور دل کے خیالات میں قوت پیدا ہو جاتی ہے بلکہ گانے بجانے کی آواز سے اس کے جذبات مجسم ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔"

یہ اہل سماع صوفیا کی بڑی مؤثر ترجمانی ہے۔

حافظ شیرازی سماع کے لیے اتنی کشش اور اتنی تاثیر کو ضروری سمجھتا ہے۔

یار ما چوں کرد آغاز سماع
قدسیاں بر عرش دست افشاں کنند

سماع کے بارے میں حضرت ہجویریؒ کی رائے:

حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ کشف المحجوب میں سماع کے بارے میں فرماتے

ہیں کہ کرمان میں شیخ ابو احمد مظفرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں پریشان حال تھا، شیخ نے میرے مزاج پوچھے اور فرمایا کیا خواہش ہے؟ میں نے عرض کیا سماع کی خواہش ہے۔ شیخ نے میرے لیے سماع کا انتظام کیا، اس موقع پر کچھ درویش اور بھی آ گئے۔ سماع سے میرے اندر اضطراب پیدا ہو گیا پھر جب میری حالت درست ہوئی تو شیخ نے پوچھا اب کیا حال ہے؟ میں نے عرض کیا کہ مجھے بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ شیخ نے فرمایا اے ابوالحسن! ایک وقت وہ آئے گا جب سماع کی آواز اور کوے کی آواز میں تمہیں کوئی فرق محسوس نہ ہوگا کیوں کہ سماع کا اثر تو اس وقت تک ہے جب تک مشاہدہ حق کی نعمت حاصل نہیں ہوتی۔ جب یہ نعمت حاصل ہو جاتی ہے تو سماع کی خواہش نہیں رہتی۔

شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ فرماتے ہیں:

"میں علی ابن عثمان جلابی کہتا ہوں کہ سماع میں مشغول ہو کر اپنے آپ کو اضطراب میں ڈالنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔"

(کشف المحجوب، بحث سماع)

محفل عیش وطرب اور محفل وجد وسماع میں فرق:

امرا کی محفل عیش وطرب اور فقرا کی محفل وجد وسماع میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلی حیوانی خواہشات کا طوفان برپا کرتی ہے اور دوسری مادی خواہشات سے اوپر اٹھا کر حق سے واصل کر دیتی ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ نے سماع کے جواز کی جو شرطیں بیان کی ہیں ان پر غور کرو، قرآن کریم جب نازل ہوا تو دنیا اسی قسم کی محفلوں (ناچ، رنگ، طاؤس ورباب وشعرو شباب) سے آباد تھی۔ امرا کی محفلیں ہوں یا شہنشاہوں کی محفلیں ہوں۔

اقبالؒ نے ٹھیک کہا ہے:

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

قرآن کریم نے عیش وعشرت کے انہی مشاغل کو حرام قرار دیا، سورۂ لقمان کی مشہور آیت ۶ ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ.

"اور کچھ لوگ وہ ہیں جو غافل کرنے والی باتوں کو خریدتے ہیں تاکہ اپنی جہالت سے خدا کے بندوں کو گمراہ کریں اور دعوت حق کو مذاق میں اڑا دیں، یہی لوگ ہیں جن کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار ہے۔"

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ مکہ کا ایک سردار نضر ابن حارث عراق سے ایرانی بادشاہوں کے شاہ نامے اور گانے بجانے والی لونڈیاں خرید کر لایا اور مکہ میں داستان گوئی اور ناچ گانے کی محفلیں منعقد کرنے لگا تاکہ عوام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرآنی دعوت اور وعظ ونصیحت کی محفلوں سے دور رہیں اور ان محفلوں میں مشغول رہا کریں۔ اس آیت پاک میں اس کی مذمت کی گئی ہے۔

لَهْوَ الْحَدِيْثِ.

"غفلت میں ڈالنے والی باتیں۔"

وہی شاہوں کے شاہ نامے اور پیشہ ور گانے بجانے والیوں کا کلام اور ان کا ساز و سامان اس وقت جو بھی ہوتا ہو۔

یہی وہ غنا (گانا) ہے جن سے قرآنی لفظ **لَهْوَ الْحَدِيْثِ** کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے تین بار قسمیں کھا کر فرمایا:

هُوَ وَاللّٰهِ الْغِنَاء.

"وہ خدا کی قسم غنا ہے۔"

امام حسن بصریؒ نے صحیح فرمایا:

نَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ فِى الْغِنَاءِ وَالْمَزَامِيْرِ.

"یہ آیت غنا اور مزامیر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔"

مشہور مفسر امام ابن جریر طبریؒ لَھْوَ الْحَدِیْثِ کی تفسیر کرتے ہیں:

كُلَّ كَلَامٍ يَصُدُّ عَنْ آيَاتِ اللّٰهِ وَاتِّبَاعِ سَبِيلِهٖ.

"ہر وہ کلام جو خدا کے احکام و آیات سے غافل کر دے اور شریعت الٰہی کی پیروی سے روک دے وہ لَھْوَ الْحَدِیْثِ ہے اور اس کا مشغلہ اختیار کرنا حرام ہے۔" (ابن کثیر، جلد ۳، صفحہ ۴۴۲)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے گانے بجانے اور اس قسم کے گانے بجانے میں کام آنے والے آلات غنا اور آلات موسیقی کو ہلاکت کا پیش خیمہ قرار دیا ہے:

لَيَشْرَبَنَّ نَاسٌ مِنْ أُمَّتِي الْخَمْرَ يُسَمُّوْنَهَا بِغَيْرِ اسْمِهَا يُعْزَفُ عَلٰى رُؤُسِهِمْ بِالْمَعَازِفِ وَالْمُغَنِّيَاتِ يَخْسِفُ اللّٰهُ بِهِمُ الْأَرْضَ وَيَجْعَلُ اللّٰهُ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ. (معارف جلد ۷، صفحہ ۲۵، بہ حوالہ ابوداؤد و ابن ماجہ)

"ضرور ایسا وقت آئے گا کہ میری امت کے کچھ لوگ شراب پئیں گے اور اس کا نام بدل دیں گے اور ان کے سامنے ساز و سارنگی اور گانے والی عورتوں کا مظاہرہ ہوگا اس وقت اللہ تعالیٰ ان کی ذہنی حالت بندروں اور خنزیروں جیسی کر دے گا، اور وہ زمین کی بربادی کے عذاب میں گرفتار ہو جائیں گے۔"

یہ قرآن کریم اور حدیث نبوی کا اسلوبِ خاص ہے کہ اس میں عمل کے فطری نتائج کو خدائی عمل کے پیرایے میں بیان کیا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب لوگ بندروں اور خنزیروں جیسی گندی عادتوں اور ذلیل خصلتوں کا شکار ہو جائیں گے تو ان کی دل چسپی شراب و کباب اور ناچ گانے والی بے حیا عورتوں کے ساتھ وابستہ ہو جائے گی۔ اس وقت زمین کے مختلف عذاب سیلاب، قحط، خون ریزی اور خانہ جنگی ان پر مسلط ہو جائیں گے۔

زمین میں دھنسنا یہی ہے۔ عربی زبان میں خَسْف کے جامع مفہوم میں دھنسنا

نقصان، ذلت، کم زوری سب معنی داخل ہیں۔

اسی لیے اس حدیث کے ترجمہ میں استاد مرحوم مفتی محمد شفیعؒ مفتی اعظم پاکستان (صاحب معارف القرآن) نے خسف کے لفظ کا اردو میں کوئی ترجمہ نہیں کیا بلکہ اسی عربی لفظ کو باقی رکھا۔

گانے بجانے اور راگ و رنگ کی ان محفلوں کے متعلق جو وعیدیں آئی ہیں، انھیں صوفیائے کبار کی محافل سماع پر چسپاں کرنا افسوس ناک انتہا پسندی اور گستاخی ہے۔

دف کے جواز اور عدم جواز کی احادیث:

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دف کے جواز کی حدیث حضرت عائشہ صدیقہؓ سے جلد اول، صفحہ ۱۳۵ اور جلد ثانی صفحہ ۷۷۵ دو جگہ نقل کی ہے۔

إِنَّ أَبَابَكْرٍؓ دَخَلَ عَلَيْهَا وَعِنْدَهَا جَارِيَتَانِ فِي أَيَّامِ مِنٰى تَدُفَّفَانِ وَتَضْرِبَانِ وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَغَشٍّ بِثَوْبِهٖ فَانْتَهَرَهُمَا أَبُوْ بَكْرٍؓ فَكَشَفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ وَجْهِهٖ فَقَالَ دَعْهُمَا يَا أَبَابَكْرٍؓ فَإِنَّهَا أَيَّامُ عِيْدٍ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ أَيَّامُ مِنٰى وَقَالَتْ عَائِشَةُؓ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتُرُنِيْ وَأَنَا أَنْظُرُ إِلَى الْحَبَشَةِ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ فِي الْمَسْجِدِ فَزَجَرَهُمْ عُمَرُؓ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعْهُمْ أَمْنًا بَنِيْ أَرْفِدَةَ.

"ابوبکر صدیقؓ میرے گھر تشریف لائے اور عائشہ صدیقہؓ کے پاس دو لڑکیاں دف بجا رہی تھیں اور دف پر ہاتھ مار رہی تھیں اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم چادر پاک سے چہرۂ انور ڈھانکے ہوئے تھے، ابوبکرؓ نے ان لڑکیوں کو ڈانٹا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوبکر! انھیں چھوڑ دو، آج

عید کے ایام ہیں اور وہ منیٰ (عید الضحیٰ) کے ایام تھے۔"

"عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھ پر پردہ کیے ہوئے تھے (میرے سامنے کھڑے ہو کر) اور میں حبشیوں کی نیزہ بازی کے کرتب دیکھ رہی تھی جو وہ مسجد کے سامنے دکھا رہے تھے، ان حبشیوں کو حضرت عمرؓ نے ڈانٹا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بھی فرمایا، بنی ارفدۃ کو امن کے ساتھ چھوڑ دو (کہ وہ کھیلتے رہیں)۔"

اس حدیث کے بارے میں محدثین نے جو کلام کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے:

وَقَدْ اِسْتَدَلَّ بَعْضُ الْمُتَصَوِّفَةِ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ وَبِمِثْلِهٖ عَلٰى اِبَاحَةِ الْغِنَاءِ وَهُوَ سَاقِطٌ لِاَنَّ دَلَالَةَ الْحَدِيْثِ عَلٰى مَنْعِهٖ اَظْهَرُ مِنْ دَلَالَتِهٖ عَلٰى اِبَاحَتِهٖ. فَعُلِمَ اَنَّ الْاَصْلَ هُوَ الْمَنْعُ وَالتَّجْوِيْزُ كَانَ لِيَوْمِ عِيْدٍ. (حاشیہ بخاری)

"اس روایت سے بعض صوفیا نے غنا کے مباح ہونے پر استدلال کیا ہے اور یہ استدلال ساقط ہے کیوں کہ حدیث کی دلالت منع (عدم جواز) پر اباحت کی دلالت سے زیادہ واضح ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غنا کے بارے میں اصل حکم عدم جواز کا ہے، اس کا جواز عید کے دن کے لیے ہے۔"

ایک روایت شادی بیاہ کے موقعے پر اظہار خوشی (لہو) کے جواز کی یہ ہے:

اِنَّمَا زُفَّتْ اِمْرَأَةٌ اِلٰى رَجُلٍ مِنَ الْاَنْصَارِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَائِشَةُ! مَا كَانَ مَعَكُمْ لَهْوٌ فَاِنَّ الْاَنْصَارَ يُعْجِبُهُمُ اللَّهْوُ. (جلد ثانی، صفحہ ۷۷۵)

"حضرت عائشہؓ کے گھر سے ایک لڑکی کسی انصاری کے ساتھ رخصت کی جا رہی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے آپ نے فرمایا عائشہ! تم نے کسی خوشی اور کھیل کود کا اظہار نہیں کیا؟! انصار اس موقعے پر کھیل کود سے

خوش ہوتے ہیں۔"

غنا کو مباح کہنے والے حضرات لہو سے گانا بجانا مراد لیتے ہیں جو شادی بیاہ کے موقع پر گھر کی لڑکیاں گاتی ہیں۔

ایک واقعہ دف بجانے کا وہ ہے جس میں ایک حبشی باندی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دف بجانے اور گانے کی اجازت دی۔ اس وقت جب آپ ایک غزوے سے کامیاب واپس آئے اور اس باندی نے کہا کہ میں نے نذر مانی تھی کہ آپ کی واپسی پر ایسا کروں گی۔ آپ نے اجازت دے دی، اس مجلس میں حضرت ابو بکرؓ آئے وہ باندی دف بجاتی رہی، پھر حضرت علیؓ آئے، پھر حضرت عثمانؓ آئے وہ دف بجاتی رہی، آخر میں حضرت عمرؓ آئے تو اس نے حضرت عمرؓ کے خوف سے دف رکھ دیا اور اس کے اوپر بیٹھ گئی۔ آپ نے فرمایا: **اِنَّ الشَّيْطَانَ لَيَخَافُ مِنْكَ يَا عُمَرُ!** "عمر! تم سے شیطان ڈرتا ہے۔" (مشکوٰۃ فضائل عمر رضی اللہ عنہ: ۵۵۸، بہ حوالہ ترمذی)

محدثین اور فقہا نے اس حدیث کے مختلف پہلوؤں پر مفصل بحث کی ہے۔ محدثین نے دف بجانے کے واقعے میں عدم جواز کے کئی پہلو نکالے ہیں، ایک یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم منہ ڈھانکے ہوئے لیٹے تھے اور دف کے ساتھ گانے سے بے رغبتی کا اظہار فرما رہے تھے۔ دوسرے دف ایک سادہ باجا ہے جس میں دوسرے باجوں کی طرح موسیقیت نہیں ہے۔ تیسرے گھر کی لڑکیاں گا رہی تھیں باقاعدہ فن کار گویے نہیں تھے۔

اس قسم کے غنا اور گانے پر موسیقی اور ساز کے گانوں کو قیاس نہیں کیا جا سکتا اور نہ تہوار کی خوشی کے علاوہ ہر موقع پر اس کا عام استعمال ثابت ہوتا ہے۔

حضرات صوفیہ کا ایک طبقہ غنا کی اباحت کے لیے ان میں سے بعض شرائط کو تسلیم نہیں کرتا۔

دف کی ممانعت:

بعض احادیث میں دف بجانے کی ممانعت آئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا:

فَصَلَ مَابَیْنَ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ اَلصَّوْتُ وَالدُّفُّ فِی النِّکَاحِ. (مشکوٰۃ:۲:۲۷۲ بہ حوالہ ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

"نکاح کی تقریب کے حرام طریقے اور حلال طریقے کے درمیان آواز (گانا) اور دف بجانے کا فرق ہے۔"

اسی کے ساتھ صاحب مشکوٰۃ نے حضرت عائشہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے:

اَعْلِنُوْا هٰذَا النِّکَاحَ وَاجْعَلُوْهُ فِی الْمَسَاجِدِ وَاضْرِبُوْا عَلَیْهِ الدُّفُوْفَ. (مشکوٰۃ:۲:۲۷۲ بہ حوالہ ترمذی)

"نکاح کا اعلان کیا کرو اور نکاح کی تقریبات مساجد میں کیا کرو اور اس تقریب میں دف بجایا کرو۔"

فقہائے احناف ان تمام احادیث کو سامنے رکھ کر یہ فرماتے ہیں:

۱۔ دف بجانے کی اجازت شادی بیاہ کے موقع پر ہے اس میں سادہ طریقے پر اظہار مسرت ہے اور اعلان تقریب نکاح ہے۔

۲۔ ممانعت کی احادیث کا تعلق عام تفریح طبع کے طور پر دف بجانے سے ہے۔

جلد: ۸

آٹھویں مجلس:

احداث فی الدین میں شیخؒ کی مکمل احتیاط

دین میں نئی بات پیدا کرنا، محدثین اور فقہا کے ہاں ایک اہم بحث ہے۔ حضرت شیخ علیہ الرحمہ کی مجلس میں بھی یہ مسئلہ پیدا ہوا اور السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ کے بیان میں آپ نے احداث فی الدین کی برائی کی طرف متوجہ کیا۔

آپ نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے فرمایا کہ صحابۂ کرامؓ کی مجلس مبارک میں ایک آنے والے نے اوپر والا سلام پیش کیا، ایک صحابی نے اس کے جواب میں "ومغفرتہ" کا اضافہ کر دیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے منع کیا اور فرمایا "وبرکاتہ" سے آگے کچھ نہیں۔ (جلد ۵، مجلس ۸، صفحہ ۹۶۷)

قرآن کریم نے ہدایت کی ہے:

وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا ۝ (النساء:۸۶)

"اور اے مسلمانو! جب تمہیں سلام کیا جائے احترام کے ساتھ تو تم اس کا جواب دو اس سے بہتر طریقے سے یا اسی طرح جواب دے دو، بے شک اللہ تعالیٰ ہر شے کا حساب لینے والا ہے۔"

عربی لغت میں تحیہ کے معنی زندگی کی دعا دینے کے ہیں۔ لیکن مفسرین نے قرآن میں واقع لفظ تحیہ سے سلام کرنا مراد لیا ہے۔

مفسرین نے اس آیت کے شان نزول میں لکھا ہے کہ اس وقت مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سخت کش مکش برپا تھی اور اس کا اندیشہ لاحق تھا کہ مسلمان غیر مسلموں (قریش مکہ) کے ساتھ کج خلقی سے پیش آئیں۔ ملت ابراہیمی میں سلام

کرنے کا رواج تھا اور ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو سلام کرنا (کسی لفظ سے ہو)
انسانی معاشرے میں ہمیشہ رہا ہے۔

قرآن کریم نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ ہر سلام کرنے والے کو جواب میں سلام کریں اور اس سے بہتر الفاظ میں جواب دیں یا اسی کے الفاظ دہرا دیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اپنے والد (آزر) سے رخصت ہوئے تو باوجود اس کے کہ آزر نے انھیں گھر سے نکالا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انھیں سلام کیا۔

قَالَ سَلَامٌ عَلَيْكَ. (مریم:۴۷)

"ابراہیم بولا، بابا جی، سکھی رہو!"

یہ ترجمہ ہندی کے الفاظ میں حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادیؒ نے کیا ہے۔ قرآن نے اس سے بہتر الفاظ کی ہدایت کی۔ لیکن احسن اور بہتر کی حد کیا ہے؟ اس حد کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین اور محدود کیا اور جب ایک صحابی نے پورا اسلام کیا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ، تو آپ نے انہی الفاظ کو لوٹا دیا، وعلیک۔ اور تم پر بھی اسی طرح سلام ہو۔ اس شخص نے کہا، حضور! آپ نے پہلے آنے والوں کے جواب میں تو سلام کے ساتھ رحمت اور برکت کے الفاظ زیادہ کیے لیکن میرے جواب میں کوئی لفظ نہیں بڑھایا تو آپ نے فرمایا:

اِنَّکَ لَمْ تَدَعْ لَنَا شَیْئًا.

"تم نے ہمارے لیے کچھ نہیں چھوڑا۔"

یعنی بس سلام کے ساتھ رحمت اور برکت کے الفاظ کافی ہیں۔

یہ ایک معقول اور منظم دین کی بات ہے، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اگر الفاظ دعا کی حد بندی نہ کرتے تو سلام اور جواب سلام کئی کئی لمبی سطروں تک پہنچ جاتا۔ کیوں کہ اچھے دعائیہ الفاظ کی کوئی حد نہیں۔

شیخ علیہ الرحمہ نے حضرت ابن عباسؓ کا جو قول (اثر) نقل فرمایا اس میں آپ نے رحمت اور برکت کے الفاظ پر مغفرت کے لفظ کی زیادتی کو غلط سمجھا، کیوں کہ رسول

اکرم علیہ السلام نے دعا کے صرف دو لفظوں پر اکتفا فرمایا اور ایک صحابی کے کہنے پر یہ فرمایا کہ ان دو لفظوں کے بعد اب باقی ہی کیا رہا ہے؟

ظاہر ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس زیادتی کو سنت نبوی سے تجاوز قرار دیا اور اسے حدیث نبوی کی اصطلاح میں 'احداث' کہا گیا ہے۔

مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَالَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ.

(مشکوٰۃ:۲۷ بہ حوالہ متفق علیہ)

"جو شخص ہمارے دین میں اس چیز کا اضافہ کرے جو اس میں نہیں ہے تو وہ زیادتی نا قابل قبول ہے۔"

ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ سے یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

قَالَ مَنْ سَلَّمَ عَلَیْکَ مِنْ خَلْقِ اللّٰهِ فَارْدُدْ عَلَیْهِ وَاِنْ کَانَ مَجُوْسِیًّا ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ یَقُوْلُ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْرُدُّوْهَا. (جلد اول، صفحہ ۵۳۲)

"یعنی خدا کی مخلوق میں سے جو کوئی بھی تجھے سلام کرے تو اسے جواب دے، اگرچہ وہ سلام کرنے والا آتش پرست مجوسی ہو۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ سلام کا جواب اچھے الفاظ میں دو یا اسی کے الفاظ دوہرا دو۔"

محدث ابن کثیرؒ نے قتادہؒ تابعی کا یہ قول نقل کیا کہ مسلمان کے جواب میں اچھے الفاظ کہو اور غیر مسلم اہل ذمہ کو اسی کے الفاظ میں جواب دے دو۔ اور یہ قول نقل کر کے اسے محل نظر قرار دیا ہے اور ابن عباسؓ کے قول کو ترجیح دی ہے۔ شان نزول بتا رہا ہے کہ ملاقاتی سلام دعا میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے۔

فقہا نے لکھا ہے کہ ضرورت کے طور پر غیر مسلموں (اہل ذمہ) کو سلام کرنا چاہیے۔

وَفِی الدُّرِّ الْمُخْتَارِ یُسَلِّمُ الْمُسْلِمُ عَلٰی اَهْلِ الذِّمَّةِ لِحَاجَةٍ اِلَیْهِ وَاِلَّا کُرِهَ. (حاشیہ جلالین:۸۳)

ضرورت سے مراد کوئی مالی ضرورت اور دنیوی منفعت نہیں ہے بلکہ ایک مسلمان
کے لیے سب سے بڑی ضرورت اظہار اخلاق و شرافت ہے۔ جو ایک داعی الی اللہ،
خدا کے دین کی طرف بلانے پر مامور جماعت کا مذہبی فریضہ ہے۔ تاکہ خدا کی مخلوق
کے دل میں اس جماعت کے لیے ہمدردی اور نرمی پیدا ہو اور پھر وہ اس کی تقریر اور اس
کے عمل سے اسلام کی طرف راغب ہو۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے سواد ابن ربیعہؒ تابعی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ جب
راستے میں کسی نصرانی اور یہودی کو دیکھتے تو اسے السلام علیکم کہتے، لوگ ان سے پوچھتے
کہ یہ آپ کیا کرتے ہیں؟ تو وہ جواب دیتے، قرآن کی اس آیت کا یہی مطلب ہے۔

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا. (بقرہ:۸۳)

"اور مسلمانو! لوگوں سے اچھا کلام کیا کرو۔"

فقہا کے ہاں اسلامی حکومت کے پر امن شہریوں کو اہل ذمہ کہا جاتا ہے یعنی جن
کے جان و مال کی حفاظت خدا اور اس کے رسول نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے اور مسلم حکم
رانوں کو خدا اور رسول کے عہد کی پاس داری کا ذمہ دار بنایا ہے۔

آج کے جدید دور میں دنیا کے ہر خطے میں آباد مسلمان اور غیر مسلم دونوں کو شرعی
اصطلاح کے مطابق معاہد (امن اور آزادی کے باہمی معاہدے میں بندھے ہوئے)
کے لفظ سے یاد کیا جائے گا۔ اور معاہد قوم میں ایک دوسرے کی جان، مال اور عزت و
آبرو کی حفاظت کی ذمہ دار ہیں۔

فقہا نے السلام علیکم کہنے کے لیے جس ضرورت کی طرف اشارہ کیا ہے موجودہ
عہد میں وہ ضرورت مسلم اور غیر مسلم طبقوں کے درمیان اعتماد اور رواداری کے جذبہ کا
فروغ ہے اور اس فرقہ وارانہ منافرت کا ازالہ کرتا ہے جو ملک کے اندر ہونے والی
سیاسی کش مکش کی وجہ سے پھیلی ہوئی ہے اور اس کش مکش کی وجہ سے اسلام کی امن پرور
تعلیمات کی طرف سے بھی غیر مسلم طبقے غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ یہ ہے اس دور کی
سب سے بڑی شرعی ضرورت۔

جلد:
نویں مجلس:

صبر و رضا پر گفتگو

شیخ علیہ الرحمہ رحمۃً واسعۃً حضرت فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ نقل
فرماتے ہیں کہ جب نیشاپور پر تاتاری مغلوں نے حملہ کیا تو حاکم شہر نے حضرت عطارؒ
سے درخواست کی کہ دعا فرمائیں کہ یہ بلا ٹل جائے۔ خواجہ عطارؒ نے جواب دیا "وقت
دعا گذشت وقت رضا است"، یعنی بلائے خدا نازل شد، تن بر رضا باید داد۔

یعنی دعا کا وقت گزر گیا، اب رضا کا وقت ہے، اپنے آپ کو خدا کی مرضی کے
حوالے کرو، شیخ علیہ الرحمہ نے خواجہ عطارؒ کے اس جواب کے بعد جو بیش قیمت حکیمانہ
بات فرمائی۔ وہ دراصل خواجہ عطارؒ کی رائے سے اختلاف ہے، لیکن ادب کے طور پر شیخ
علیہ الرحمہ اختلاف کا اظہار کیے بغیر وہ بات فرما رہے ہیں جو احادیث نبوی کے گہرے
مطالعے کے بعد شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے سمجھی ہے۔ فرماتے ہیں:

"بعد از نزول بلا ہم دعا باید کرد اگر چہ بلا دفع نشود اما صعوبت بلا
کم شود۔"

"مصیبت نازل ہونے کے بعد بھی دعا کرنی چاہیے اس دعا سے بلا دفع
نہیں ہوتی مگر اس سے مصیبت کی تکلیف کم ہو جاتی ہے۔"

پھر آپ نے صبر و رضا کے درمیان فرق واضح کیا، فرمایا:

صبر یہ ہے کہ مصیبت کو برداشت کرے اور اس کی شکایت نہ کرے۔ اور رضا یہ
ہے کہ اس مصیبت پر اسے ناگواری بھی نہ ہو جیسے کوئی مصیبت آئی ہی نہ ہو۔

پھر فرمایا:

علمائے کلام (متکلمین) رضا کے اس مفہوم سے اتفاق نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں:

کہ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ مصیبت آئے اور اس کا احساس ہی نہ ہو۔ یہ فطرت کے خلاف ہے۔

شیخ فرماتے ہیں کہ اس کا جواب یہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص جلدی میں کہیں جا رہا ہو اور راستے میں اس کے پیر میں کانٹا چبھ جائے اور خون بہنے لگے لیکن اس جلدی جانے والے کو اس تکلیف کا خیال ہی نہیں رہتا اور بعد میں اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کے پیر میں کانٹا چبھ گیا ہے تو اگر جسمانی مشغولیت تکلیف سے بے خبر رکھ سکتی ہے تو خدا کی یاد میں جس کا دل مشغول ہو اسے کسی مصیبت کا احساس نہ ہو تو اس میں کیا تعجب ہے؟ (جلد ۲، مجلس ۹، صفحہ ۳۶۴)

مولانا رومیؒ رضا کی اس کیفیت کو واضح کرتے ہیں ؎

اولیا اصحاب کہف انداے عتود — در قیام و در قعود ور قود
گر تو بینی شاں بدشواری دروں — نیست شاں خوفے ولا ہم یحزنون
مے رو دایں ہر دو ازمردم پدید — بے خبر زیں ہر دو ایشاں در مزید
مے رو دایں ہر دو کا رازانبیا — بے خبر زیں ہر دو ایشاں چوصدا

کتنی عمدہ مثال دی ہے، اہل اللہ مشکلات و مصائب سے گزرتے ضرور ہیں لیکن انھیں ان پریشانیوں کا احساس نہیں ہوتا وہ غم زدہ نہیں ہوتے۔ جیسے پہاڑوں میں سے کوئی شخص آواز بلند کرے تو وہ آواز گونجتی ہے لیکن ان آوازوں سے وہ پہاڑ اور گنبد بے خبر ہوتے ہیں۔

یہ بات پھر ذہن میں رکھیے کہ شیخ علیہ الرحمہ رضا اور دعا دونوں کو جمع رکھنے کے قائل ہیں اور حالت رضا میں بھی دعا کرنے کی ضرورت سمجھا رہے ہیں، کیوں کہ احادیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر حال میں دعا کی اہمیت واضح فرمائی ہے۔

اِنَّ الدُّعَاءَ یَنْفَعُ مِمَّا نَزَلَ وَمِمَّا لَمْ یَنْزِلْ فَعَلَیْکُمْ عِبَادَ اللّٰہِ بِالدُّعَاءِ۔

(مشکوٰۃ: ۱۹۴، عن ابن عمر رضی اللہ عنہ بہ حوالہ ترمذی)

”بے شک دعا فایدہ پہنچاتی ہے اس مصیبت میں بھی جو نازل ہو چکی ہو اور اس مصیبت میں بھی جو نازل نہ ہوئی ہو۔“

علامہ علی قاریؒ شارح مشکوٰۃ نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی حسب ذیل تشریح نقل کی ہے۔ امام فرماتے ہیں:

”تم کہو گے کہ تقدیر و قضا جو رد نہیں ہوتی اس کے ساتھ دعا کا کیا فایدہ ہے؟ تو سمجھ لو کہ قضا اور بلا دونوں کا تعلق دعا سے ہے۔ دعا بلا کو روکنے اور خدا کی رحمت نازل ہونے کا سبب ہے۔ جس طرح ڈھال تیر و تلوار کے حملے کو روکنے کا سبب ہے اور باران رحمت زمین سے نباتات کے اگنے کا سبب ہے تو ڈھال اور تلوار کے درمیان ٹکراؤ ہوتا ہے اسی طرح دعا اور بلا کے درمیان ٹکراؤ ہوتا ہے۔ لہٰذا تقدیر اور قضائے الٰہی کو تسلیم کرنے کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ ہتھیار اپنے ساتھ نہ رکھا جائے۔“

دیکھو سورۂ نساء میں قرآن کریم نے کیا فرمایا ہے؟

وَلْیَأْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ۔ (۱۰۲)

”اور انھیں چاہیے کہ نماز خوف ادا کرتے ہوئے اپنے بچاؤ کا سامان اور ہتھیار اپنے پاس رکھیں۔“

پس اللہ تعالیٰ نے اپنا حکم (قضا) بھی مقرر کر دیا ہے اور اس کا سبب بھی مقرر کر دیا ہے۔ اور دعا کے اور بھی فوائد ہیں۔ مثلاً دعا سے حضور قلب حاصل ہوتا ہے، بندے کی محتاجگی ظاہر ہوتی ہے اور یہ دونوں باتیں عبادت اور معرفت کی روح ہیں۔

(مرقات کتاب الدعاء)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ڈھال اور تیر کے درمیان تصادم اور ٹکراؤ کی جو بات کہی ہے اسے حضرت محبوب الٰہی علیہ الرحمہ نے مزید واضح کرنے کی غرض سے یہ بات بھی فرمائی۔ آپ کے الفاظ عربی میں تھے، خواجہ حسنؒ نے ان الفاظ کا ترجمہ فارسی میں اس طرح کیا۔

”بلا چوں نازل مے شود دعاء از فرو بالا مے رود و ہر دو در ہوا

یک جا متعارض مے شوند، اگر دعا را قوتے باشد بلا را باز گرداندو
گرنہ بلا فرود آید۔"

"یعنی جب بلا نازل ہوتی ہے تو دعا اوپر بلند ہوتی ہے اور دونوں آپس میں
متصادم ہوتے ہیں، ٹکراؤ ہوتا ہے اور اگر دعا میں قوت ہوتی ہے تو وہ بلا کو
واپس کر دیتی ہے اور اگر کمزور ہوتی ہے تو بلا نازل ہو جاتی ہے۔"

محدثین کے ہاں قضاو دعا کے ٹکراؤ کی وضاحت میں چند قول ہیں:

۱۔ تَيَسُّرُ الْاَمْرِ مِنْهُ حَتّٰى كَانَ الْقَضَآءُ النَّازِلَ كَاَنْ لَّمْ يَنْزِلْ.

"قضاو تقدیر کے نافذ ہونے کی صورت میں دعا سے تقدیری مصیبت
آسان ہو جاتی گویا وہ نازل ہی نہیں ہوئی۔"

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے اسی توجیہ کو پسند کیا ہے۔

۲۔ دعا سے تقدیر معلق (مشروط) رک جاتی ہے البتہ قضائے مبرم نہیں رکتی۔
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی تقدیر کے رک جانے اور ٹل جانے کی طرف
حسب ذیل حدیث میں اشارہ کیا ہے:

لَا يَرُدُّ الْقَضَآءَ اِلَّا الدُّعَآءُ وَلَا يَزِيْدُ فِی الْعُمُرِ اِلَّا الْبِرُّ.

"قضا کو دعا ٹال دیتی ہے اور نیکی سے عمر بڑھ جاتی ہے۔"

نیکی سے عمر بڑھنے کا مطلب محدثین نے یہ بیان کیا ہے کہ نیکی سے عمر میں
برکت ہو جاتی ہے اور تھوڑے وقت میں انسان بڑے بڑے کام انجام دے لیتا ہے۔
اس اعتبار سے گویا اس کی عمر بڑھ جاتی ہے۔ حدیث میں استعارہ ہے۔

رضا بالقضا پر ایک اردو شاعر نے کہا:

طلب عادت نہیں اہل رضا کی
یہ لغزش تھی زبان مدعا کی

مخمور دہلوی نے کہا:

عشق کی توہین، تذلیل وفا کرتا ہوں میں
ضبطِ غم سے آج گھبرا کر دعا کرتا ہوں میں

شیخ علیہ الرحمہ اس فلسفۂ رضا سے اتفاق نہیں کرتے۔

مولانا رومی علیہ الرحمہ نے مقام رضا کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔

اولیا اصحاب کہف اندامے عتود — در قیام و در تقلب ہم رقود
گر تو بینی شان بدشواری دروں — نیست شاں خوفے ولا ہم یحزنون

حافظ شیرازی کہتا ہے:

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد از او غیر او تمنائی

خواجہ عطارؒ کی شہادت، رضا کا عملی نمونہ:

یہ خواجہ عطار علیہ الرحمہ تاتاری سپاہیوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ واقعہ اس طرح
پیش آیا کہ جب تاتاری سپاہی نیشاپور کے اندر قتل و غارت گری کرنے داخل ہوئے تو
خواجہؒ اپنے سترہ مریدوں کے ساتھ قبلے کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے اور ان قاتلوں کا
انتظار کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ سفاک سپاہی آپہنچے اور انہوں نے پہلے شیخ کے
مریدوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ خواجہ عطارؒ اپنے ہر مرید کے قتل پر فرماتے:

"ایں چہ تیغ قہاری است وایں چہ تیغ جباری است۔"

"یہ کیسی قہاری کی تلوار ہے؟ یہ کیسی جباری کی تلوار ہے؟

ہر مرید کے قتل ہونے پر یہی فقرے ادا کرتے رہے لیکن جب ان سفاکوں نے
خواجہ عطارؒ پر حملہ کیا تو فرمایا:

"ایں چہ کرم است، ایں چہ مکرمت است، ایں چہ احسان است۔"

"یہ کیسا کرم ہے؟ یہ کیسی نوازش ہے؟ یہ کیسا احسان ہے؟"

(جلد ۵، مجلس ۲۵، صفحہ ۱۰۴۰)

رضا کے ساتھ نہی عن المنکر :

خواجہ عطارؒ نے اپنے ساتھیوں کے قتل پر اظہارِ مذمت کے جو فقرے استعمال فرمائے وہ نہی عن المنکر کا فریضہ تھا جو خواجہ صاحبؒ نے ادا کیا۔ حدیث پاک میں ہے:

مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَذَالِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانُ.

"تم میں سے جو شخص کسی زیادتی اور برائی کو دیکھے تو اسے ہاتھ سے مٹائے اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے اس کی مذمت کرے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو اسے دل سے برا جانے اور یہ تیسرا درجہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔"

تاتاری ظلم کی یلغار میں زبان سے اظہار بیزاری نہی عن المنکر کا دوسرا درجہ ہے جو خواجہ عطارؒ نے ادا کیا لیکن جب ان کی اپنی باری آئی تو آپ رضا کی تصویر بن گئے اور حسن ازل بے حجاب ہو کر اپنے دیوانے کے سامنے آگیا۔

جاں پرورست قصہ ارباب معرفت
رمزے برو بپرس حدیثے بیا بگو

صبر اور شکر دونوں لازم وملزوم ہیں

سیرت پاک کا بنیادی پہلو! فرض گذاری اہم ہے حق طلبی سے:

سورۂ مدثر وہ پہلی سورت ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ دین کے لیے کھڑے ہونے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس سورۃ میں آپ کو چھ ابتدائی حکم دیے گئے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ O قُمْ فَاَنْذِرْ O وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ O

وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ O وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ O وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَکْثِرُ O وَلِرَبِّکَ فَاصْبِرْ O

"اے کملی والے! کھڑے ہو جاؤ اور لوگوں کو ہوشیار کرو اور اپنے پروردگار کی کبریائی اور اقرار و اعلان کرو اور اپنے لباس کو پاک رکھو اور شرک سے دور رہو اور اس خیال سے کسی پر احسان نہ کرو کہ تم اس سے بدل چاہو اور اپنے پروردگار کے حکم کا انتظار کرو۔"

امام تفسیر شاہ عبد القادر محدث دہلویؒ نے آخری فقرے کا ترجمہ یہ کیا ہے:

"اپنے رب کی راہ دیکھ۔ مطلب یہ ہے کہ صبر کر اور خدا کے حکم کا انتظام کر۔"

شاہ صاحبؒ نے اس فقرے کی تفسیر کرتے ہوئے یہ لکھا:

"اور ہمت سکھائی کہ جو کسی کو مدد دے اس سے بدلہ نہ چاہ، اپنے رب کے دیے پر شاکر رہ۔"

تفسیر میں شاہ صاحبؒ نے صبر کا ترجمہ شکر کیا ہے اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ صبر اور شکر کی دونوں صفتوں کے درمیان گہرا تعلق بلکہ لازم وملزوم کا رشتہ ہے۔

اردو محاورے میں بھی صبر شکر کرو آتا ہے اور دونوں الفاظ ساتھ ساتھ بولے جاتے ہیں البتہ ترتیب الٹی ہے۔ معنوی اعتبار سے شکر صبر کرو ہونا چاہیے تھا۔

صبر اور شکر کے درمیان تعلق یہ ہے کہ جو انسان خدا کے انعامات (جو ہر مخلوق پر ہیں) پر شکر گزار ہوتا ہے۔ اس کی نعمتوں پر خوش رہتا ہے، وہی زندگی کی جفاؤں پر صبر کرتا ہے۔ زندگی مصیبت اور راحت کے مجموعے کا نام ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں اسباب کے ذریعے انسان پر نازل ہوتی ہیں۔

بعض اسباب آسمانی ہیں اور بعض اسباب زمینی ہیں۔ قرآن کہتا ہے دونوں قسم کی مصیبتوں میں صبر کرو۔

قرآنی صبر بے عملی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی طاقت کی حد تک کوشش کرے اور جب ناکامی رہے تو اب صبر کرے اور خدا کے حکم کا

انتظار کرے۔

مثال کے طور پر غریبی کو دیکھو۔ حکم ہے کہ کوشش کی حد تک اپنے جسم اور اپنی عقل سے کام لو اور پھر یہ افلاس دور نہ ہو تو اب صبر سے کام لو۔

غربت دور کرنے کے لیے بدحواسی، گھبراہٹ اور غلط سلط کام نہ کرو۔ تو اب

اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ لوگوں پر احسان کریں، انھیں دین حق کی دعوت دیں، دنیوی پریشانیوں میں ان کی مدد کریں اور اپنے فرض کی ادائیگی پر قایم رہیں اور اہل دنیا کی جفا کاریوں پر صبر کریں اور خدا کے انعامات پر شکر ادا کریں، اس کے احسانات ہی آپ کے لیے کافی ہیں۔ پھر اگر اہل جفا آپ کی خدمت کا حق ادا نہ کریں، ایمان نہ لائیں اور آپ کو تکلیفیں پہنچائیں تو آپ صبر سے کام لیں، جلد بازی سے دور رہیں۔

اسی تعلیم سے یہ اصول نکلتا ہے کہ فرض ادا کرو، حق طلبی میں صبر سے کام لو اپنے حق کا اظہار اور اس پر اصرار ایک الگ چیز ہے اور اس میں بے صبری اور جلد بازی ایک الگ چیز ہے۔

پہلی بات انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ دوسری بات فطرت انسانی کے تجربے کے خلاف ہے۔ فطرت میں صبر و برداشت ہے۔ انسان جب جلد بازی اور بے صبری کرتا ہے تو وہ فطرت کی خلاف ورزی کرتا ہے اور اس کی سزا بھگتتا ہے۔

حق طلبی کی جدوجہد میں اسوۂ حسنہ کیا ہے؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم سے دعوت و خدمت پر حق طلب کرتے ہوئے کیا انداز اختیار فرمایا؟

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى۔

(شوریٰ:۲۳)

"لوگو! میں تم سے تبلیغ حق پر کوئی اجرت طلب نہیں کرتا سوائے اس کے کہ میں تم سے یہ چاہتا ہوں کہ تم آپس کی رشتہ داریوں کا لحاظ رکھو۔"

یعنی اختلافِ رائے کی بنا پر رشتہ داری کے حق کو پامال نہ کرو اور اپنے اسلام قبول کرنے والے رشتہ داروں کو اذیت نہ پہنچاؤ۔

ایک موقعے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ۔

"آپ کہہ دیں میں تم لوگوں سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا اور میں یہ بات بناوٹ اور تکلف سے نہیں کہہ رہا۔"

قرآن کریم میں یہ اعلان ہر نبی و رسول کی طرف سے نقل کیا گیا ہے۔

اہل جفا کی حق تلفیوں کا بدل:

قرآن کریم میں ایمان والوں کو یقین دلایا ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے دین پر شکر گزار رہیں گے اور اہل جفا کی ستم رانیوں پر صبر کریں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے انعامات اور زیادہ کردے گا۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِىْ لَشَدِيْدٌ۝ (سورۂ ابراہیم:۷)

"اور تمہارا پروردگار تمہیں آگاہ کرتا ہے کہ اگر تم شکر گزاری کرتے رہو گے تو میں اور زیادہ دوں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو سمجھ لو کہ میری سزا بہت سخت ہے۔"

ناشکری اور کفران نعمت میں بے صبری کا پہلو پوشیدہ ہے اور بے صبری عجلت پسندی اور جلد بازی کی سزا قانون قدرت میں بہت سخت رکھی گئی ہے۔

عجلت شیطانی حرکت ہے:

حدیث پاک میں آتا ہے:

اَلْاَنَاءَةُ مِنَ اللّٰهِ وَالْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ۔ (مشکوٰۃ:۴۲۹)

"تحمل اور برداشت خدا کی طرف سے ہے یعنی اس کا خاص انعام ہے اور
جلد بازی شیطان کی تحریک ہے۔"

ایک حدیث میں فرمایا:

لَا حَلِيْمَ اِلَّا ذُوْ عُثْرَةٍ وَلَا حَكِيْمَ اِلَّا ذُوْ تَجْرِبَةٍ.

(ایضاً)

"تحمل اور صبر ٹھوکر کھانے کے بعد پیدا ہوتا ہے اور حکمت ودانائی تجربے کے
بعد پیدا ہوتی ہے۔"

دونوں حدیثوں کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جو تحمل، وقار اور صبر وانکسار ٹھوکر کھانے سے پہلے ہی پیدا ہو جائے وہ خدا کا خاص انعام ہے ورنہ عام طور پر ٹھوکر لگنے کے بعد ہی عقل آتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ عقل مند گھوڑے کے لیے ایک چابک ہی کافی ہے۔

ایمان بالتقدیر کا تقاضا:

صبر وتحمل جہاں شکر الٰہی کا تقاضا ہے وہاں تقدیر پر ایمان کا تقاضا بھی ہے۔ مولانا حسرت موہانیؒ کا ایک شعر ہے ؂

تیری محفل سے اٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال
دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارہ کر دیا

قرآن کریم نے مصائب ومشکلات میں گھرے ہوئے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابۂ کرامؓ کو زندگی کے نازک ترین دور میں تقدیر الٰہی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ (انعام:۱۲۳)

"اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں بڑے بڑے مفسد پیدا کیے تا کہ وہ اس

میں حق کے خلاف مکر ومکاری پھیلائیں اور وہ جو مکر وفریب کرتے ہیں وہ
اپنے ہی خلاف کرتے ہیں اور انھیں اس حقیقت کا شعور نہیں۔"

اور ایک جگہ فرمایا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ۝ (الفرقان:۳۱)

"اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے جرائم پیشہ لوگوں میں سے دشمن کھڑے کیے اور آپ کا پروردگار ہدایت کرنے اور مدد کرنے میں کافی ہے۔"

تیرہ سال صبر محض کے:

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تیرہ سالہ مکی زندگی صبر محض کی زندگی ہے اس زندگی میں آپ نے اس قرآنی اصول پر جس طرح عمل کیا وہ ظاہر وباہر ہے اور پھر مدینہ کے دس سال جو اقتدار واختیار کے تھے اس میں آپ نے شاہی میں فقیری کی مثال پیش کی اور اقتدار میں آ کر بھی خدمت اور زہد کا راستہ اختیار کیا یہ بھی اسی اصول کے تحت تھا۔

مکہ میں حضرت حمزہؓ کے اسلام قبول کرنے کا واقعہ مشہور ہے۔ حضرت حمزہؓ نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

کیا یہ صحیح ہے کہ ابوجہل نے تمہیں اذیت پہنچائی ہے؟ اگر تم تصدیق کر دو گے تو میں ابھی جا کر اس کا سر قلم کر دوں گا۔ آپ نے فرمایا چچا جان! آپ کی محبت کا شکریہ! لیکن اگر آپ بھتیجے کے ساتھ محبت کا حق ادا کرنے چاہتے ہیں تو اس کی یہ صورت ہے کہ میرا پیغام توحید قبول کر لیجیے۔ دشمن کا سر قلم کرنے سے مجھے خوشی نہ ہوگی۔

آج حضرت حمزہؓ نے بہادری کی ایک نئی قسم دریافت کی۔ گالی کے جواب میں تھپڑ مارنا بہادری نہیں۔ بہادری یہ ہے کہ اپنے پیغام اور اپنے مشن پر اپنے جذبات کو قربان کر دیا جائے۔ حضرت حمزہؓ نے اسلام قبول کر لیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چالیس برس کی عمر میں نبوت عطا ہوئی۔ تریسٹھ برس کی عمر شریف کے ابتدائی چالیس سال آپ نے کس طرح گزارے؟ کیا صرف ایک کامیاب تاجر کے طور پر گزارے؟ تجارت ہی آپ کا مقصد رہی؟

ایک عظیم منصب پر فائز ہونے والے مستقبل کے عالم گیر اور عالمی نبی جس کو اپنے عظیم مستقبل کا فطری شعور تھا، نبوت کے منصب کا تعلق ریاضت ومجاہدہ سے نہیں ہوتا۔ یہ ایک وہبی منصب ہوتا ہے پھر آپ کے یہ چالیس سال کس طرح گزرے؟ اخلاق حسنہ میں گزارے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کے بنیادی حقوق کو زندہ کرنے میں گزارے۔ تجارت ایک ذریعہ اور وسیلہ تھا۔ مخلوق کی مدد کرنے کا۔

وہ پانچ بنیادی اخلاق یہ ہیں۔ آپ کی رفیقہ حیات حضرت خدیجہؓ فرماتی ہیں:

اِنَّکَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْکُلَّ وَتَکْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِی الضَّیْفَ وَتُعِیْنُ عَلٰی نَوَائِبِ الْحَقِّ۔

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کیوں گھبراتے ہیں **وَاللّٰہُ لَایُخْزِیْکَ اللّٰہُ اَبَدًا** خدا کی قسم! خدا تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ آپ رشتہ داروں کا حق ادا کرتے ہیں اور غریبوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں اور بے سروسامان لوگوں کی مدد کرتے ہیں اور مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں اور بے گناہ مصائب میں گرفتار لوگوں کی اعانت کرتے ہیں۔

کوئی اس پر غور نہیں کرتا کہ ۲۳ سال کی تبلیغی زندگی سے پہلے چالیس سال یا ۲۵ سال آپ نے کس طرح گزارے؟

کارِ نبوت شروع کرنے کے بعد:

آپ نے تیرہ برس تک ہر قسم کے ظلم وستم سہہ کر خدا کی عبادت کا اور مخلوق کی خدمت کا حق ادا کیا۔ پھر دس سال مدینہ میں گزارے اور دس سال کے بعد اسی مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک امن پسند اور محافظ انسانیت کے طور پر داخل ہوئے۔

قریش مکہ اور قبیلہ بنی خزاعہ کے درمیان جنگ برپا ہوگئی اور بنی خزاعہ نے اپنی جان اور مال کی حفاظت کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دی۔

اور آپ **اَلْیَوْمُ یَوْمُ الْمَرْحَمَۃُ** فرماتے ہوئے اپنے بارہ ہزار ساتھیوں کے ساتھ مکہ میں داخل ہوگئے۔ اگر یہ خدا کی طرف سے انعام نہیں تھا تو کیا تھا؟ اور یہی مقام عبدیت ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصف خاص ہے:

چہ عظمت دادہٴ یا رب بخلق آں عظیم الشان
کہ انی عبدہ گوید بجائے قول سبحانی

یہی اصول درویشوں کے ہاں اپنی انتہائی شکل اختیار کر گیا اور اہل اللہ نے یہ کہا کہ خدا کی عبادت کا حق ایک مالک کا حق سمجھ کر ادا کرے آخرت کے اجر وثواب کی طلب سے بھی بے نیاز ہو جائے۔

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

مشہور خاتون درویش حضرت رابعہ بصریؒ کا واقعہ ہے کہ شبلیؒ نے انھیں ایک روز نہایت بے خودی کے عالم میں ایک ہاتھ میں پانی کا آب خورہ اور دوسرے ہاتھ میں آگ لے کر بھاگتے ہوئے دیکھا۔ یہ عجیب منظر دیکھ کر شیخ شبلیؒ نے پوچھا اے دیوانی بی بی! یہ کیا حال ہے؟ وہ بولیں: آج میں اس پانی سے خدا کے جہنم کو بجھانا چاہتی ہوں اور اس آگ سے خدا کی جنت کو جلا دینے کا ارادہ ہے تاکہ خدا کے بندے صرف اپنے مالک کی رضا کے لیے اس کی بندگی کریں۔ جنت اور دوزخ کا خیال ہی دل سے نکال دیں۔

اے کاش! ہندوستان میں ہم مسلمان بھی اسی اصول پر کار بند ہو جائیں اور پھر نصرت آسمانی کا تماشا دیکھیں۔

علما وصوفیا کی محبت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے دین برحق کی ترقی اور حفاظت

علماے حق اور صوفیائے ربانی کی ذمہ داری ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ذمہ داری کے پیش نظر یہ بشارت دی ہے:

اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ.

"علما حضرات انبیا کے وارث ہیں۔"

ہمارے شیخ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی علیہ الرحمہ فرماتے تھے کہ اس بشارت میں علما سے علمائے کاملین مراد ہیں جو علم ظاہر اور علم باطن دونوں قسم کے علوم سے آراستہ ہوں۔

کسی نے سوال کیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ورثہ (دین حق) کی اشاعت کا فرض اصطلاحی علما اور صوفیا دونوں نے انجام دیا ہے تو پھر یہ دونوں ہی طبقے وارث انبیا ہیں؟ حدیث میں صرف علما کا تذکرہ ہے۔ اس کا جواب شیخ مدنیؒ نے یہ دیا۔

شیخ علیہ الرحمہ نے خواجہ حسنؒ کا سوال سن کر اسی دائرہ میں جواب مرحمت فرمایا۔ جواب کا انداز بدل کر علما کی محبت کی جگہ صوفیا کی محبت اور اس محبت کا مفہوم بیان نہیں فرمایا۔

شیخ علیہ الرحمہ خود ایک بڑے عالم شریعت تھے، آپ کے ذہن میں علما کے لفظ اور علما کے طبقے کے بارے میں کوئی انقباض نہیں ہوسکتا تھا۔

شیخ علیہ الرحمہ نے ایک مجلس میں (عہد رسالت وصحابہ کے بعد کے) علما اور صوفیا کے درمیان فرق واضح کرتے ہوئے فرمایا:

"فرمود درمیان ایہنا تضادست، علما اہل عقل اند و درویشاں اہل عشق۔ عقل علما بر عشق غالب است و عشق ایں قوم بر عقل غالب۔ انبیا علیہم السلام ہر دو حال بود۔" (جلد ۵، مجلس ۱۴، صفحہ ۶۳۷)

"علما اور درویشوں کے درمیان تضاد (ایک دوسرے کی ضد) ہے۔ علما اہل عقل ہیں درویش اہل عشق ہیں۔ علما کی عقل عشق پر غالب ہے اور درویشوں کا عشق عقل پر غالب ہے اور حضرات انبیا علیہم السلام میں دونوں صفات موجود تھیں۔"

شیخ علیہ الرحمہ نے علما اور صوفیا کے درمیان عقل وعشق کے غالب ومغلوب ہونے کا فرق بیان کیا ہے جس میں ان دونوں صفتوں کے امتزاج اور اجتماع کی ضرورت کا اظہار مقصود ہے۔ کسی صفت کی توہین اور نفی مقصود نہیں ہے۔ لفظ تضاد و تخالف اسی معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور نفی کیسے کی جاسکتی ہے؟

اقبال نے وجہ بتائی ہے ؎

ہر دو بہ منزل رواں — ہر دو امیر کارواں
عقل بہ حیلہ می برد — عشق برد کشاں کشاں

حضرت انبیائے کرام کی جامعیت اور کاملیت کے حوالے سے شیخ نے بتایا کہ کمال انسانیت کا مقام عقل وعشق کا اجتماع تام ہے۔ یہی کمال ہے جس کی قوت سے حضرات انبیائے کرام دنیا کے ظلمت کدے کو عالم نور میں بدل دیتے ہیں۔

عشق چوں بازیر کی ہم برشود — نقش بند عالم دیگر شود
خیز و نقش عالم دیگر بنہ — عشق را بازیر کی آمیزہ دہ

اور حضرات انبیا کے اندران دونوں قوتوں کا یکساں اجتماع کوئی معمولی بات نہ تھی بلکہ وحی الٰہی کی سرپرستی میں یہ معجزہ وجود میں آتا تھا۔ فطری تقاضوں کے تحت دونوں قوتوں کے توازن میں کبھی فرق بھی پڑجاتا تھا۔ کسی خاص ماحول میں محبت و رحمت کا رنگ غالب آجاتا تھا اور کبھی کسی خاص موقعہ پر صفت جلال وعدل کا رنگ غالب آجاتا تھا۔ پہلا رنگ عشق کا تھا، دوسرا عقل کا تھا۔ احادیث میں دونوں قسم کے احوال میں موجود ہیں۔

حضرات صحابہؓ کے اندر بھی دونوں صفتوں کے حضرات الگ الگ موجود تھے صدیق اکبرؓ پر عشق کا رنگ غالب تھا اور حضرت عمرؓ پر عقل کا رنگ غالب تھا۔ صدیق اکبرؓ فرماتے تھے کہ استقامت (احقاف:۱۳) کے معنی توحید پر قایم رہنا ہے اور نجات کے لیے یہ کافی ہے۔ حضرت عمرؓ کہتے تھے استقامت کے معنی پورے احکام کی پابندی پر قایم رہنا ہے اس کے بغیر نجات کیسی؟

پھر تابعین کرام میں امام حسن بصریؒ پر عقل (فہم دین) کا غلبہ تھا اور امام کے ہم

عصر ابن سیرینؒ پر محبت و رحمت غالب تھی۔ لیکن ابتدائی دور اخلاص کا تھا۔ دونوں طبقے آپس میں احترام اور ادب کے ساتھ رہتے تھے۔ اور ہر طبقہ سمجھتا تھا کہ قرآن وحدیث میں دونوں قسم کے رنگ موجود ہیں اور دونوں قسم کے جذبات کی اپنی اپنی جگہ دین کو ضرورت ہے۔ البتہ جب اخلاص کی جگہ نفسانیت نے لے لی تو دونوں طبقوں کے درمیان محاذ آرائی قایم ہوگئی اور مدرسہ اور خانقاہ دو متضاد اور مخالف محاذ بن گئے۔

حضرت محبوب الٰہی علیہ الرحمہ کا دور ایسا ہی تھا اور حضرت شیخ علیہ الرحمہ اپنے انداز تعلیم و تربیت میں پوری طرح اعتدال اور میانہ روی کا خیال رکھتے تھے۔

اے کاش! آج کے حضرات (علما و مشائخ) بھی اس کی ضرورت کو محسوس کریں اور انتہا پسندی اور غلو سے اپنے اپنے طریقۂ دعوت و اصلاح کو بچانے کی کوشش فرمائیں۔

امام حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ:

اوپر اشارۃً کہا گیا کہ امام حسن بصریؒ اور ان کے ہم عصر امام ابن سیرینؒ دونوں پر الگ الگ رنگ غالب تھے۔ امام حسن بصریؒ پر شریعت اور آخرت کا خوف اس قدر غالب تھا کہ امام کے شاگرد ابراہیم ابن عیسیٰؒ کہتے ہیں۔

"میں نے حسن سے زیادہ کسی کو مغموم و محزون نہیں دیکھا۔ جب ان پر نظر پڑتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص کسی زندہ مصیبت میں گرفتار ہے۔"

(حلیۃ الاولیا:۱۴۳)

اور ابن سیرینؒ کی زندہ دلی اور خوش طبعی کا یہ حال تھا کہ ابن سیرینؒ کے ایک رفیق ابو سہلؒ کہتے ہیں:

كَانَ ابْنُ سِيرِينَ كَثِيرُ الْمِزَاحِ وَكَثِيرُ الضِّحْكِ.

(حلیہ، جلد۲، صفحہ۲۷۴)

"ابن سیرین بے حد خوش طبع اور بے حد ہنس مکھ تھے۔"

اس اختلاف مزاج کے باوجود امام حسن بصریؒ کی نظر میں ابن سیرینؒ کی جلالت

وعظمت کتنی تھی؟ ثابت بنانیؒ امام حسن بصریؒ کے بہترین شاگرد بلکہ جانشین تھے، یہ فرماتے ہیں کہ جب امام حسنؒ کی صاحبزادی کا انتقال ہوا تو اس وقت امام حسنؒ حجاج ابن یوسف کی گرفت سے بچ کر کہیں گوشہ نشین تھے۔ ثابت بنانیؒ نے امام حسنؒ کو ان کی لڑکی کے انتقال کی خبر جا کر سنائی۔ امامؒ نے خبر سن کر فرمایا:

إِذَا أَخْرَجْتُمُوهَا فَمُرُوا مُحَمَّدَ ابْنَ سِيرِينَ يَصِلُ عَلَيْهَا. (حلیہ، جلد☆، صفحہ۱۴۸)

"جب تم اس کا جنازہ باہر لاؤ تو محمد ابن سیرینؒ سے کہنا کہ وہ اس کی نماز پڑھائیں۔"

ثابتؒ کہتے ہیں:

رَجَوْتُ اَنْ يَأْمُرَنِي اَنْ اُصَلِّيَ عَلَيْهَا.

"مجھے یہ امید تھی کہ امامؒ مجھے حکم دیں گے کہ میں نماز پڑھاؤں، مگر ایسا نہیں ہوا۔"

بات یہ تھی کہ ابن سیرینؒ اپنے فطری مزاج میں خوش طبع تھے۔ حسن بصریؒ صاحب خشیت تھے، مگر تقویٰ اور طہارت میں دونوں اپنی اپنی جگہ نہایت بلند مرتبہ تھے۔ مزاجوں کے فطری فرق کو باہر سے دیکھنے والے اس انداز سے بیان کرتے تھے۔

قَالَ الْحَسَنُ اِنَّمَا هِيَ طَاعَةُ اللّٰهِ اَوِ النَّارِ وَقَالَ ابْنُ سِيرِينَ اِنَّمَا هِيَ رَحْمَةُ اللّٰهِ اَوِ النَّارِ.

(حلیہ، جلد۳، صفحہ۲۷۰)

"حسنؒ کہتے تھے خدا کی تابع داری یا جہنم کی آگ۔ ابن سیرینؒ کہتے تھے خدا کی رحمت یا جہنم کی آگ۔"

علم باطن اور صوفیہ:

علم باطن کی تعریف اور فضیلت میں صوفیہ نے جو کچھ کہا ہے اس پر مولانا اصلاحیؒ

نے اپنی کتاب تزکیہ نفس میں کچھ اس انداز سے تنقید کی ہے کہ جیسے صوفی علم باطن کو علم
ظاہر کا حریف اور مد مقابل قرار دیتے ہیں۔ حالاں کہ یہ بات نہیں ہے۔
مدارج السالکین کے مصنف علامہ ابن قیمؒ کا شمار ان چوٹی کے علما میں ہوتا ہے
جنہوں نے کتاب وسنت کی شان دار خدمات انجام دی ہیں وہ کتاب وسنت کے بلند
پایہ محقق ہیں۔

علامہ جب منازل السائرین کے اس مقام کی شرح کرتے ہیں جہاں علم باطن کی
قسمیں اور ان کے درجات بیان کیے گئے ہیں اور اصلاحی صاحبؒ کے نزدیک جن
میں شدید فتنے پوشیدہ ہیں تو وہاں علامہ علم لدنی (جو علم باطن کی اعلیٰ قسم ہے) پر ان
الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں۔

اب آپ دیکھ لیجیے کہ اس علم باطن کی اگر صوفیہ برتری بیان کرتے ہیں تو کیا بے
جا کرتے ہیں۔ علم باطن کی فضیلت عین شریعت کی فضیلت ہے یا نہیں؟

علم لدنی ثمرہ ہے عبودیت کا، اتباع کا، صدق واخلاق کا اور اس جدوجہد کا جو
مشکوٰۃ رسول یعنی کتاب وسنت سے علم حاصل کرنے کے لیے کی جاتی ہے ایسے ہی شخص
کے لیے خدا تعالیٰ خاص طور پر کتاب وسنت کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے سائل کے جواب میں فرمایا:

وَالَّذِیْ خَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَأَ النَّسَمَةَ (الی) اِلَّا فَهْمًا یُّؤْتِیْهِ اللّٰهُ عَبْدًا فِیْ كِتَابِهٖ۔

"قسم ہے اس ذات کی جس نے پھاڑا بیج کو اور مخلوق کو پیدا کیا (آپ نے
اس قسم کا علم مجھے نہیں سکھایا) مگر میرے پاس وہ فہم ہے جو اللہ اپنی کتاب کا
کسی بندے کو عطا فرماتا ہے۔"

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے قصے پر تبصرہ
کرتے ہوئے علامہ نے ایک بڑی عمدہ بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں:

"جو شخص حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کے قصے سے یہ سمجھتا
ہے کہ علم لدنی کے ہوتے ہوئے علم وحی کی ضرورت نہیں رہتی وہ اسلام

سے خارج ہے وہ واجب القتل ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ شریعت اسلام کے مطابق علم لدنی وہی ہے جو علم وحی کے
مطابق ہو اور کتاب وسنت سے نہ ٹکرائے۔ اگر کوئی شخص کتاب وسنت سے اعراض کرتا
ہے تو اس کا علم لدنی رحمانی نہیں بلکہ شیطانی ہے۔

علم لدنی کی اصطلاح کہاں سے لی گئی ہے؟ ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

"علم لدنی وہ ہے جو بغیر واسطے کے صرف الہام الٰہی سے براہ راست
حاصل ہوا ہو جیسے حضرت خضر علیہ السلام کو بغیر واسطہ حضرت موسیٰ علیہ
السلام کے حاصل ہوا تھا۔

خدا تعالیٰ نے فرمایا:

آتَیْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔

"حق تعالیٰ نے رحمت اور علم کے درمیان فرق کیا۔"

مِنْ عِنْدِنَا کہا ہے۔ رحمت کے ساتھ اور مِنْ لَّدُنَّا کہا علم کے ساتھ لَدُنَّا۔
عِنْدِنَا سے اخص واقرب ہے اس لیے فرمایا:

مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا۔

(مدارج السالکین: ۲۴۳۔۲۴۴ جلد ۲)

"علمائے امتی" کی فضیلت میں باعمل علمائے ظاہر اور صوفیائے کرام دونوں شامل ہیں:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے علما کو اعزاز واکرام سے نوازتے
ہوئے ایک موقعے پر فرمایا:

عُلَمَآءُ اُمَّتِیْ كَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ۔

"میری امت کے علما بنی اسرائیل کے پیغمبروں جیسے ہیں۔"

یعنی ذمہ داری اور درجے دونوں کے لحاظ سے۔ میرے بعد نبوت ختم ہو چکی،
اب دین کی تعلیم وتبلیغ کا فریضہ میری امت کے علما انجام دیں گے۔ اس لیے ان کا

رجہ خدا کے ہاں بھی بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے برابر ہوگا۔

بنی اسرائیل میں تبلیغ دین کا کام نبی کرتے تھے اور ایک ایک نبی کے نائب اس
ی حیات میں بھی اور اس کے بعد بھی کثرت سے مقرر کر دیے جاتے تھے۔ جیسے اصلی
ی (صاحب وحی) حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے اور ان کے بڑے بھائی ہارون علیہ
سلام ان کے نائب نبی مقرر کیے گئے تھے۔ اسی طرح حزقیل علیہ السلام نبی، سموئیل
لیہ السلام نبی، یسعیاۃ علیہ السلام نبی تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نائب کے
لور پر توراۃ کی شریعت پھیلاتے تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے موقع پر فرمایا:

اَلْعُلَمَآءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَآءِ۔

''حضرات انبیا کے وارث علما ہوتے ہیں۔''

کیوں کہ انبیا کا حقیقی ورثہ علم ہے، دولت نہیں۔

سوال یہ ہے کہ ان احادیث میں علما کا لفظ کیا مفہوم رکھتا ہے؟ اگر علما کا مفہوم
ہی ہے جو آج ہمارے عرف ومحاورے میں استعمال ہوتا ہے یعنی دین کے پڑھنے
ڑھانے والے لوگ تو پھر اس فضیلت سے صوفیائے ربانی کی جماعت نکل جاتی ہے۔
کیوں کہ صوفیا ان حضرات کا نام ہے جو اپنی تربیت وتزکیے کے ذریعے دین پھیلاتے
ہیں۔ حالاں کہ جس طرح دینی تعلیم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض نبوت کا
یک حصہ تھا اسی طرح دینی تربیت بھی آپ کے پیغمبرانہ مشن کا ایک حصہ تھا۔ قرآن
کریم نے کہا:

یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ۔

(آل عمران:١٦٤)

''وہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) انھیں کتاب الٰہی کی تعلیم دیتے ہیں اور اس
کتاب کے مطابق ان کی ذہنی وعملی تربیت کرتے ہیں۔''

اب ہمیں لفظ علما کا مفہوم متعین کرنے کے لیے قرآن کریم کی طرف رجوع کرنا
چاہیے۔

قرآن کریم میں علما کا لفظ دو مقام پر آیا ہے۔ سورۂ شعراء: ١٩٧ میں بنی اسرائیل
کے علما کا ذکر ہے:

اَوَلَمْ یَکُنْ لَّھُمْ اٰیَۃً اَنْ یَّعْلَمَہٗ عُلَمٰٓءُ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ۔

''کیا اہل مکہ کے لیے یہ دلیل اور نشانی کافی نہیں کہ (قرآن کے نزول کی
خبر کا) بنی اسرائیل کے پڑھے لکھے لوگ علم رکھتے ہیں۔''

دوسرا مقام سورۂ فاطر: ٢٨ ہے وہاں فرمایا گیا:

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓءُ۔

''اللہ تعالیٰ سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو سمجھ والے ہیں۔''

ارباب تراجم علما میں صرف شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلویؒ وہ بزرگ ہیں جو
الہامی علم کی مدد سے کتابی علم کے اسرار ورموز کھولتے ہیں اور کتاب الٰہی کے عربی الفاظ
کا شرعی اور مرادی مفہوم اردو میں بیان کرتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے پہلی آیت میں علما کا لغوی اور عام مفہوم لکھا یعنی پڑھے لکھے
لوگ۔ وہ لوگ جن کے پاس کتابی معلومات ہیں اور وہ لوگ کتابوں کے الفاظ اور
کتابوں کی عبارت پڑھ لیتے ہیں اور لکھ لیتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے دوسری آیت کے ترجمے میں علما کے لفظ کا شرعی اصطلاحی مفہوم
تحریر کیا ہے۔ پھر شاہ صاحبؒ نے ''سمجھ'' کو عام اور مطلق رکھا ہے۔ دین کے ساتھ
خاص نہیں کیا یعنی دین اور دنیا، دونوں کی سمجھ، دین اور دنیا دونوں کی حقیقت کا عرفان،
دونوں کی گہرائی اور تہ کا شعور۔

قرآن کریم نے دین اور دنیا دونوں پر غور وفکر کرنے کا حکم دیا ہے۔ دنیا کے لیے
کہا۔

وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

(آل عمران:١٩١)

''اور وہ آسمان اور زمین کی پیدائش پر غور کرتے ہیں۔''

دین کے لیے کہا:

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡهِمۡ وَلَعَلَّهُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ O (نحل:۴۴)

"اے نبی محترم! ہم نے تمھاری طرف یہ کتاب ذکر نازل کی تا کہ تم ان ہدایات کی تشریح و بیان کا کام کرو جو تمھاری طرف اتاری گئی ہیں تا کہ وہ لوگ ان پر غور کریں۔"

غور و فکر یہ کہ یہ دنیا اور اس کی نعمتیں خدا کی طرف سے امانت ہیں۔ ان کا شکر ادا کرنا ضروری ہے اور اس معبود برحق اور خالق کے شکر ادا کرنے کا طریقہ ہی مذہب کہلاتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ خشیت الٰہی (جس کا تعلق قلبی کیفیت سے ہے) انھی لوگوں کے اندر ہوتی ہے جو دین کا فہم اور شعور رکھتے ہیں، دین کی حقیقت کو سمجھتے ہیں، قرآن و حدیث کے جاننے والوں (جانکاروں) میں عیسائی دنیا کے اندر کثرت سے لوگ موجود ہیں جنھیں اصطلاح میں مستشرق کہا جاتا ہے وہ جانکار ہیں سمجھ دار نہیں۔ ان کے پاس قرآن و حدیث کے ظاہر کا علم ہے، کتابی علم ہے۔ قرآن و حدیث اور شریعت کے باطن اور اس کی روح کا شعور و فہم نہیں اس لیے وہ خشیت الٰہی سے خالی ہیں۔

قرآن کریم نے علم کے ساتھ دو لفظ اور بھی استعمال کیے ہیں ایک لفظ بصیرت، دوسرا لفظ حکمت۔

سورۂ بقرہ: ۲۶۹ میں کہا گیا:

وَمَنۡ یُّؤۡتَ الۡحِکۡمَةَ فَقَدۡ اُوۡتِیَ خَیۡرًا کَثِیۡرًا O

"اور جسے سمجھ دی گئی اسے خیر کثیر عطا کی گئی۔"

سورۂ یوسف: ۱۰۸ میں کہا گیا:

قُلۡ هٰذِهٖ سَبِیۡلِیۡۤ اَدۡعُوۡۤا اِلَی اللّٰهِ عَلٰی بَصِیۡرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیۡ

"اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! تم یہ اعلان کر دو کہ یہ میرا راستہ ہے، میں اور میرے پیرو اس کی طرف سمجھ بوجھ کر تمھیں بلاتے ہیں۔"

ابتدائے اسلام میں علم ظاہر اور علم باطن دونوں ایک ہی شخصیت میں جمع تھے اس لیے اصحاب درس اور اصحاب اخلاق، معلم اور مزکی دونوں کے لیے علما کا لقب استعمال کیا جاتا تھا۔ کیوں کہ قرآن کریم نے اس امت کے امام و ہادی کے مشن (کار نبوت) کے دونوں جز مقرر کیے ہیں۔

یُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ...... وَیُزَکِّیۡهِمۡ O

"وہ نبی کتاب کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کی اخلاقی اور روحانی تربیت کرتے ہیں۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی براہ راست تعلیم و تربیت نے علمائے کاملین پیدا کیے جو بیک وقت تعلیم اور تزکیۂ اخلاق کا فرض ادا کرتے تھے پھر بعد کے عہد میں تقسیم کار کے تحت علمائے ظاہر اور علمائے باطن کے دائرے الگ الگ ہو گئے۔ ایک جماعت نے کتاب و سنت کی تعلیم و تدریس کا میدان سنبھالا۔ یہ محدث، فقیہ اور متکلم و قاضی کہلائے اور ایک جماعت نے اخلاقی اور روحانی تربیت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ یہ صوفیائے ربانی اور مشائخ کہلائے۔

عرف عام میں علما اور اہل علم کا لقب محدثین و فقہا کے ساتھ خاص ہو گیا اور اخلاقی معلمین کے لیے صوفیا اور اہل حقیقت کی اصطلاح قرار پا گئی۔

کارِ نبوت کے دو جز — تعلیم، تربیت:

نادان یہ سمجھتے ہیں کہ شریعت اور طریقت دو متضاد اور ایک دوسرے کے خلاف محاذ ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ تعلیم و تدریس اور تربیت و تزکیہ دونوں کار نبوت کے جز ہیں۔

علما اور صوفیا کے دائروں کی تقسیم آپسی جھگڑے کی وجہ سے عمل میں نہیں آئی بلکہ جب دعوت و تبلیغ کا کام وسیع ہوا تو تقسیم کار کے تحت اپنے اپنے ذاتی ذوق کے مطابق علما اور صوفیا الگ الگ بیٹھ گئے اور مدرسہ اور خانقاہ کے دو میدان عمل وجود میں آ گئے۔

علم ظاہر، علم باطن ــ قرآنی تعبیر:

قرآنی تعبیر کے مطابق کس علم کو علم باطن کہا جاسکتا ہے۔ قرآن نے منکرین حق کے متعلق کہا:

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غَافِلُوْنَ O (روم:۷)

"یہ لوگ دنیا کے ظاہر کا علم رکھتے ہیں اور آخرت یعنی اس کے انجام اور اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔"

ظاہر کے مقابلے میں باطن کا لفظ آتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے ظاہراً کا ترجمہ اوپر اوپر کیا ہے۔ یعنی یہ منکرین دنیا کی زندگی کی اوپر اوپر کی یعنی سطحی باتوں کا علم رکھتے ہیں اگر اندر کی باتوں کا انھیں علم ہوتا تو یہ آخرت پر ایمان لے آتے۔

یہ حقیقت کھلی ہوئی ہے کہ انسان دنیا سے آخرت کی طرف جاتا ہے۔ ظاہر سے باطن کی طرف پہنچتا ہے اس لیے جہاں باطن کا علم ہوگا وہاں ظاہر کا علم بھی ہوگا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جہاں ظاہر کا علم ہو وہاں باطن کا علم بھی ہو۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ قرآن کریم کا پڑھنے پڑھانے والا، اس کے الفاظ کا مطالعہ کرنے والا ضروری نہیں اس کے معانی و مطالب کا عالم بھی ہو۔ لیکن قرآن کے معانی (باطن) کا عالم (فقیہ) اس کے الفاظ و عبارت کا جاننے والا ضرور ہوگا۔ عبارت والفاظ ہی سے معانی کی طرف پہنچ ہوسکتی ہے۔

دوسری مثال یہ ہے کہ شریعت کے بعد ہی طریقت کی طرف پہنچ ہوسکتی ہے۔ پہلے شریعت اور اس کے بعد طریقت۔

طریقت اور تصوف کے معنی شریعت کے اسرار و رموز اور شریعت کے اصلی مقصد (اخلاقی حسن و جمال) کا علم حاصل ہونا۔

اب بات صاف ہوگئی۔ قرآن وحدیث میں علما کے اصطلاحی معنی۔ علماے کاملین، ظاہر اور باطن دونوں کے عالم مراد ہیں۔

ظاہر کے عالم اصحاب تدریس و تعلیم اور باطن کے عالم مشایخ اور صوفیا ہیں۔

علم باطن اور علم ظاہر میں ٹکراؤ:

ظاہر اور باطن کے مندرجہ بالا مفہوم سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ ان دونوں کے درمیان ٹکراؤ اور تضاد نہیں ہے۔

ایک طبقہ علما اور صوفیا کے درمیان اختلاف ذوق اور تقسیم کار کی ذمہ داری کو سمجھے بغیر یہ کہتا ہے کہ کوئی معلم کتاب و سنت صوفی نہیں ہوسکتا۔ اور جو حضرات اصلاح اخلاق اور روحانی ترقی کا کام کرتے ہیں ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ کتاب و سنت کے علم سے خالی دامن ہیں۔

علم ظاہر اور علم باطن کے درمیان جو تعلق ہے اسے حضرت سید علی ہجویریؒ (داتا گنج بخش لاہوریؒ) نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"علم ظاہر میں لوگوں کے ساتھ معاملات کی درستگی اور علم باطن میں نیت کا صحیح رکھنا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا قیام دوسرے کے بغیر ناممکن ہے۔ کیوں کہ ظاہر حال باطنی حقیقت کے بغیر نفاق ہے۔ اسی طرح باطن ظاہر کے بغیر زندقہ ہے۔ ظاہر شریعت باطن کے بغیر ناقص ہے اور باطن بغیر ظاہر کے ہوس ہے۔"

علم ظاہر اور علم باطن کے درمیان ٹکراؤ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی جانب غلو اور تشدد رونما ہوتا ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ باطن کا جوش اور محبت و عقیدت کی افراط انسان کو بے ساختہ اپنے محبوب کے قدموں میں جھکادیتی ہے۔ اسے قدم بوسی اور دست بوسی کہا جاتا ہے۔ علم ظاہر اور علم فقہ کا مسئلہ اس عمل کے ظاہری پہلو کو دیکھ کر اسے گناہ قرار دیتا ہے۔ کیوں کہ قدم بوسی کا عمل عبادت الٰہی کے خاص جز یعنی سجدہ کے مشابہ ہے اور گناہ قرار دینے کا مقصد یہ ہے کہ احتیاط کی جائے، یہ مطلب نہیں کہ وہ شخص جہنمی ہوگیا۔

یہ اعتدال کی راہ ہے۔ افراط و تفریط کی راہ یہ ہے کہ مفتی و فقیہ یہ کہنے لگے کہ قبر پر جھکنا شرک ہے اور صوفی یہ کہنے لگے کہ قدم بوسی کے بغیر کچھ نہیں ملتا۔

ٹکراؤ کی دوسری مثال یہ ہے کہ جس بزرگ کی یاد میں ہم یہاں جمع ہیں۔ ان کا

لقب شیخ محدث دہلویؒ ہے (یہ تقریر احقر نے شیخ محدث دہلویؒ کے عرس پر قطب صاحب میں کی تھی)۔

شیخ کی دینی جدوجہد پر کتاب وسنت کی تعلیم وتدریس کا غلبہ تھا اس لیے ان کا لقب شیخ محدث پڑ گیا۔ حالاں کہ شیخ ''قادری صوفی'' بھی ہیں۔

شیخ کے دوسرے رفیق کار حضرت مجدد سرہندیؒ ہیں، ان کی سرگرمیوں پر روحانی تربیت اور اخلاقی اصلاح کا غلبہ تھا اس لیے وہ امام ربانی اور امام الصوفیہ کہلائے۔

امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کتاب وسنت کے اس قدر پابند ہیں کہ بدعت حسنہ کو بھی برداشت نہیں کرتے۔ لیکن ایک مکتوب گرامی میں مجدد صاحبؒ نے معرفت اور علم باطن کا ایک خاص نکتہ تحریر میں پیش کر دیا وہ مکتوب جب شیخ محدثؒ کے علم میں آیا تو آپ نے اس پر سخت تنقید کی اور ظاہر شریعت کے ایک امام وعالم کا یہ فرض تھا جو آپ نے ادا کیا۔ شیخ اور مجدد صاحبؒ کی وہ خط وکتابت موجود ہے۔

مجدد صاحبؒ نے اس سے رجوع کیا ہے اور شیخ سے معذرت کی ہے۔

علم کسبی اور علم وہبی:

علم باطن کو کبھی وہبی علم کے معنی میں بولا جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں کسبی علم کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔

علم کی یہ تقسیم ''ماخذ علم'' کے لحاظ سے ہے یعنی اگر علم حواس خمسہ (پانچوں حواس) دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے سے حاصل ہوا ہے تو وہ علم کسبی ہے اور اگر براہ راست روح (قلب، باطن) پر خدائے علیم کی طرف سے القا ہوا ہے تو وہ روحانی اور الہامی علم ہے۔

نبی ورسول کا روحانی علم یقینی ہوتا ہے کیوں کہ نبی ورسول کو اپنے معلم حقیقی خداوند علیم کے ساتھ اپنے تعلق کا واضح ادراک ویقین ہوتا ہے اور اس کی طرف سے علم وہدایت کے فیضان کے سبب نبی ورسول کو واضح تصور ہوتا ہے۔

غیر نبی (ولی) کے القا والہام میں یہ احتمال ہوتا ہے کہ یہ وسوسہ شیطانی نہ ہو یا

اس خیال میں خود میری خواہشات کی ملاوٹ نہ ہوگئی ہو۔

یہ اس آخری امت کی خصوصیت ہے کہ اس میں علم الٰہی کا آغاز علم روحانی (علم وحی) سے ہوا۔ وحی قلب رسول پر علم کے القا کا نام ہے۔

پھر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے علم وحی کو تدریس وتعلیم کے ذریعے پھیلایا۔ اور ساتھ ہی اپنے شاگردوں (صحابہ کرامؓ) کے دل میں کتاب وشریعت کے رموز وحکم ڈالے اور یہ کام آپ کی روحانی اور قلبی توجہ سے انجام پایا۔

اسی مفہوم میں علم باطن کے لیے علم لدنی اور علم وہبی کی تعبیریں استعمال کی جاتی ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی معنی میں اُمّی تھے کہ تدریس کتاب کی احتیاج کے بغیر آپ کا سینہ علوم سے منور تھا۔ قرآن کریم نے اس الہامی علم (وحی) کو بھی لفظ علم ہی سے تعبیر کیا ہے۔

حضور علیہ السلام کو ہدایت کی گئی:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِىْ عِلْمًا ○ (طٰہٰ:۱۱۴)

''اور اے نبی! تم قرآن حاصل کرنے میں جلدی نہ کیا کرو جب تک کہ اس کا نزول (وحی) پورا نہ ہو جائے اور تم دعا کیا کرو کہ اے پروردگار! میرا بوجھ میرا علم زیادہ کردے۔''

شاہ صاحبؒ نے اس آیت میں علم کا ترجمہ بوجھ کیا ہے کیوں کہ اس دعا کا تعلق اس ذات گرامی سے ہے جس کا علم ظاہری تعلیم وتدریس کے سہارے وجود میں نہیں آیا۔

چناں چہ خدا تعالیٰ کی طرف سے رسول پاک علیہ السلام پر یہ حقیقت کئی دفعہ واضح کی گئی۔

تعلیم وتدریس کا عام طریقہ یہ ہے کہ شاگرد اپنے استاد کے ساتھ ساتھ پڑھتا رہتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم شروع میں اسی عام طریقے کے مطابق جبرئیل امین

سے قرآن پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔

خدا تعالیٰ نے کئی دفعہ آپ کو سمجھایا کہ تعلیم تمہارے لیے تدریس کتاب کے طریقے پر نہیں ہے بلکہ قلبی القا کے طریقے پر ہے۔ سورۂ قیامہ میں اس کی وضاحت کی گئی ہے:

لَا تُحَرِّکْ بِهٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ.

(۱۶۔۱۹)

"اے نبی! تم اپنی زبان کو حرکت نہ دیا کرو تاکہ جلدی سے قرآن حاصل کرلو قرآن کا (تمہارے سینے میں) جمع کرنا اور پھر اس کا پڑھوانا ہمارے ذمے ہے، پھر جب ہم اسے پڑھ چکیں تو اس کے بعد تم پڑھا کرو پھر ہمارے ذمے تمہارے لیے اس کی تشریح کرنا یا دوسروں کے لیے تم سے اس کی تشریح کرانا۔" (بیان کے لفظ میں دونوں مفہوم شامل ہیں)

خدا تعالیٰ نے جبریل امین کے پڑھنے کو اپنا پڑھنا قرار دیا۔ سورۂ اعلیٰ :۶ میں بھی یہ فرمایا:

سَنُقْرِئُکَ فَلَا تَنْسٰی.

"تم کو ہم پڑھا رہے ہیں پس تم بھول کا شکار نہیں ہوسکتے۔"

جبرئیل امین کی تلاوت کو اپنی طرف منسوب کرنے میں اسی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کی تعلیم عام تدریس کے مطابق نہیں بلکہ قلبی تعلیم اور الہام کے طریقے پر ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ کی طرف سے کئی بار وضاحت و تشریح کے بعد عام فطری عادت کو چھوڑا۔ پھر یہ صورت ہوگئی کہ خدا کی طرف سے طویل سے طویل قرآن کا حصہ جبرئیل امین سنا دیتے اور اس کے بعد آپ تمام نازل شدہ حصے کو فرفر پڑھنا شروع کردیتے۔ یہ بھی ایک معجزہ تھا۔

اور پر ہم نے **فَاِذَا قَرَاْنٰهُ** ..... الخ کی آیت کا ترجمہ ڈپٹی نذیر احمد صاحبؒ کے ترجمے کے مطابق کیا ہے۔ عام طور پر **قَرَاْنٰهُ** کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے۔

"جس وقت پڑھیں ہم اس کو پس پیروی کر پڑھنے میں ہماری۔"

(شاہ رفیع الدینؒ)

"پھر جب ہم پڑھنے لگیں تو ساتھ رہ اس کے پڑھنے کے۔"

(شاہ عبدالقادرؒ)

"تو جب ہم اس کو پڑھنے لگا کریں تو اس کے تابع ہو جایا کیجیے۔"

(مولانا تھانویؒ)

فارسی کے حضرات اتباع کے لغوی مفہوم کی پابندی کر رہے ہیں۔

"پس پیروی کن خواندن او۔" (جرجانی)

"در پے خواندن او کن۔" (شاہ ولی اللہؒ)

اردو والے اس ترجمے کی پیروی سے باہر نہیں جا سکے لیکن ادنیٰ تامل کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تو پڑھنے کا وہی انداز ہے جس سے آپ کو روکنا مقصود ہے۔ یعنی دو دو لفظ ایک ایک آیت جبرئیل امین تلاوت کریں اور آپ اس کی پیروی کریں۔

اس اشکال سے بچنے کے لیے ڈپٹی صاحبؒ نے "پڑھ چکیں" ترجمہ کیا۔ ہندی کا لفظ چکنا اردو میں ختم ہونے اور مکمل ہونے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ دلی والے اس لفظ کو تابع فعل کے طور پر اتمام فعل کے لیے لاتے ہیں اور کبھی تاکید فعل بھی مقصود ہوتی ہے۔ داغ کہتے ہیں۔

پڑھایا ہم نے دل اس کا یہ کہہ کہہ کر دم بسمل — لگا چک تیغ اے قاتل کہیں قاتل بھی ڈرتے ہیں

گلے سے یار ہم اٹھ کے چل چکے تھے مگر — مچل گیا دل پر اضطراب رہتے میں

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اتباع کے لغوی مفہوم کو بالکل چھوڑ دیا اور اس کا تفسیری اور تاویلی ترجمہ اختیار کیا جو تمام مفسرین نے اختیار کیا ہے یعنی اتباع بمعنی استماع۔ لکھتے ہیں، لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں اس وقت تم اس کی قرأت کو غور سے سنتے رہا کرو۔ (مختصر تفہیم :۹۰۸)

مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن میں اس مقام پر اتباع بمعنی استماع پر ائمہ کا اتفاق تحریر کیا ہے۔ (جلد ۸، صفحہ ۶۲۷)

اسمائے حسنیٰ کے غلط استعمال اور اشتباہ شرک سے بچنے کی ہدایت

شیخ المشائخ مولانا نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً کی نظر ایک کامل مصلح کی طرح مسلم معاشرے کے بگاڑ کے ہر پہلو پر تھی۔ وہ دور کانفرنسیں منعقد کرنے، اخبارات ورسائل میں مضامین شایع کرنے اور محلہ محلہ وعظ کی محفلیں قایم کرنے کا نہیں تھا۔ مشائخ کی خانقاہیں، مدرسہ ومسجد، دارالاصلاح، اور دارالہدایت اور اس کے ساتھ ہی ضرورت مندوں کے لیے دارالقیام اور دارالطعام ہوتی تھیں اور مشائخ کے مریدین اسلام کی چلتی پھرتی تبلیغ کی حیثیت رکھتے تھے اور انھیں سختی سے اسلامی زندگی اور محمدی اخلاق کا عملی نمونہ بنا کر عوام میں پھیلایا جاتا تھا۔ چناں چہ آپ دیکھیں کہ ایک مجلس میں شیخ علیہ الرحمہ نے نام رکھنے کے ایک نہایت ہی غلط رواج کی نشان دہی فرمائی۔ فرمایا:

۱۔ اَحَبُّ الْاَسْمَآءِ عِنْدَ اللّٰهِ عَبْدُ اللّٰهِ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ.

۲۔ اَصْدَقُ الْاَسْمَآءِ الْحَارِثُ.

۳۔ اَکْذَبُ الْاَسْمَآءِ الْمَالِکُ وَالْخَالِدُ.

''زیرا کہ مالک خداوند تعالیٰ است وجاوید ہم ہمونست۔''

(جلد ۵، مجلس ۱۴، صفحہ ۹۹۲)

ان کی مجلس میں یہ بحث چل نکلی کہ ناموں میں اچھا نام کون سا ہے؟ شیخ نے فرمایا تین قسم کے نام ہیں۔ ایک وہ نام جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں اور وہ ہیں عبداللہ اور

عبدالرحمٰن وغیرہ یعنی وہ نام جن سے بندے کی حقیقت (بندگی) اور خدا تعالیٰ کے مقام الوہیت اور آقائیت کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسرے وہ نام جن میں صداقت ہے جیسے الحارث (کھیتی کرنے والا) یعنی انسان کی حقیقت یہی ہے کہ وہ کھیتی کرتا ہے نیک اعمال کی کھیتی یا برے اعمال کی کھیتی۔ تیسرے وہ نام ہیں جو مسمّٰی (جس کا نام رکھا جائے) کے اعتبار سے جھوٹے اور خلاف واقعہ ہیں جیسے کسی انسان کا نام مالک اور خالد رکھ دیا جائے حالاں کہ حقیقت میں مالک اور ہمیشہ رہنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ نے تیسری قسم کے ناموں کی مخالفت فرمائی حالاں کہ نام رکھنے والوں کا یہ اعتقاد نہیں ہوتا ہے کہ یہ شخص مسمی حقیقی مالک و جاوید ہستی ہے بلکہ مجازی طور پر خدا کے ان صفاتی ناموں کو برکت حاصل کرنے کی نیت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن شیخ علیہ الرحمہ شرک کے معاملے میں شبہ و اشتباہ کو بھی غلط سمجھتے ہیں کیوں کہ جب دوسرے نام موجود ہیں تو پھر شبہے میں ڈالنے والے نام کیوں استعمال کیے جائیں؟ یہ حقیقی مشائخ تھے جو شرک جلی کے علاوہ شرک خفی پر بھی نظر رکھتے تھے اور مسلمانوں کو اس سے بچانے کی کوشش کرتے تھے۔

سجدۂ تعظیمی کے بارے میں شیخ محبوب الٰہیؒ کی تعلیمات میں اتنی ہی احتیاط ہے جسے راقم نے ایک مضمون میں تحریر کیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ خانقاہ کے موجودہ غلط رسوم ورواج کی وجہ سے مشائخ کبار کی صحیح تعلیمات پر پردہ پڑ گیا ہے۔ اس ناچیز نے چشتی بزرگوں کی معمول بہا (بہ قول شاہ عبدالعزیزؒ) کتاب ''فوائد الفواد'' کی مجلسوں کی تلخیص مع تحقیقات احادیث نبوی کر کے موجودہ خانقاہی رسوم کے خلاف شریعت ہونے پر مدلل بحث کی ہے۔ پیش نظر مضمون اسی کا ایک حصہ ہے۔ بہرحال شیخ علیہ الرحمہ نے دراصل شاہی حلقوں میں پھیلی ہوئی اس خاص بدعت کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، لیکن اپنی عادت شریفہ کے مطابق اس درباری بدعت کی طرف کوئی اشارہ نہیں فرمایا بلکہ عمومی انداز سے اصلاح فرمادی۔

اسمائے حسنیٰ کی اقسام:

اسمائے حسنیٰ خدا تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں جن سے خدا تعالیٰ کی صفات کے درجہ کمال کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں اسمائے حسنیٰ کی تعداد ننانوے بیان کی گئی ہے لیکن اس تعداد میں مشہور اسمائے حسنیٰ بیان کیے گئے ہیں اور دوسری حدیث میں بتایا گیا ہے کہ اسمائے حسنیٰ شمار و تعداد سے زیادہ ہیں۔ مشہور دعائے عبدیت کے الفاظ یہ ہیں:

اَسْئَلُکَ بِکُلِّ اِسْمٍ هُوَ لَکَ سَمَّیْتَ بِهٖ نَفْسَکَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ کِتَابِکَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِکَ اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِهٖ فِیْ عِلْمِ الْغَیْبِ عِنْدَکَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ۔

"میں تجھ سے اے اللہ! تیرے ہر نام پاک کے توسل سے سوال کرتا ہوں جو نام تو نے خود رکھا ہے یا اپنی کتاب میں نازل کیا ہے یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا یا وہ نام تیرے پاس علم غیب میں مخفی ہے کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار بنا دے۔"

ترمذی کی شرح احوذی میں امام ابوبکر ابن عربیؒ نے لکھا ہے کہ قرآن کریم اور حدیث پاک سے جمع کرنے پر اسمائے حسنیٰ کی تعداد ایک ہزار ثابت ہوتی ہے۔

(ابن کثیر، جلد۲، صفحہ۲۶۹)

خاص الخاص اسماء اور مشترک اسماء:

ان اسمائے حسنیٰ میں کچھ صفاتی نام ایسے ہیں جو قرآن کریم میں خدا کی ذات کے علاوہ مخلوق کے حق میں بھی بیان کیے گئے ہیں۔ جیسے رحیم، رؤف، مالک، ملک، رشید، کریم، علی، عزیز، مثلاً اللہ تعالیٰ کو "اَلرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ" کہا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی "رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ" فرمایا گیا: حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔ (التوبہ:۱۲۸) اللہ تعالیٰ کو: "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" کہا گیا اور داروغہ جہنم کا نام

بھی ''مالک'' ہے۔ جیسے اہل جہنم پکاریں گے: **وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ.** (الزخرف:۷۷) کہ اے جہنم کے داروغہ! تیرا پروردگار جو کچھ کرنا چاہتا ہے وہ کر کے ختم کرے۔ جواب آئے گا تم لوگ اس سزا میں ہمیشہ رہو گے۔ اس طرح خدا تعالیٰ کو ''ملک'' کہا گیا: **فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ.** (طٰہٰ:۱۱۴) اور **اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ** (الحشر:۲۳) اور مصر کے حکم ران کو بھی: **قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ.** (یوسف:۵۰)۔

اب غور کرو! اقتدار کی خوشامد پسندی میں لفظ ''ملک'' کی جو بے قدری کی گئی ہے وہ توحید کی دعوے دار قوم کے قطعاً شایان شان نہیں۔ حکم رانوں کے لیے ملک معظم، ملکہ معظمہ (انگریزی حکومت میں برطانوی حکم رانوں کے لیے) جلالۃ الملک (مسلم حکم رانوں کے لیے) شاہی درباروں سے علما اور فضلا کی خوشامد پسندی کے صلے میں انھیں ملک العلماء، ملک الشعراء اور ملک الحکماء کے خطابات دیے گئے۔ مغل حکم رانوں کے دربار میں شاہ جہاں، عالم پناہ اور ظل الٰہی کے نعرے بلند کیے جاتے تھے اور اسی مشرکانہ خوشامد پسندی کی انتہائی معراج تھی کہ جلال الدین اکبر کو خدائی کا درجہ دے کر اس کی پرستش شروع کرادی گئی۔ ہندوؤں میں تو راجہ مہاراجہ بھگوان کا روپ ہوتے ہیں لیکن ان مسلمان علما کو کیا ہو گیا تھا جو الوہیت اور حاکمیت کو خدا کی ذات کے لیے خاص ماننے کا دعویٰ کرتے تھے اور اکبر کو ''مہابلی'' اور ''جہاں پناہ'' کہہ کر پکارتے تھے، حالاں کہ اسلام نے توحید کی حفاظت کے لیے ہر سطح پر شخصیت پرستی کی روک تھام کی، آسمانی نمایندوں کو رسول (پیغام پہنچانے والا) اور نبی (خبر دینے والا) کہا، نبی کے جانشینوں کو خلیفہ (نائب) اور امیر و امام کے القاب دیے، مقبول بارگاہ بندوں کو ولی اور اولیا کہا گیا یعنی اللہ کے پیارے بندے۔

اسمائے حسنیٰ کی دوسری قسم ان خاص الخاص اسماء کی ہے جنھیں کتاب الٰہی اور احادیث نبوی میں خدا کے سوا کسی مخلوق کے لیے استعمال نہیں کیا گیا جیسے رحمٰن، غفار، سبحان، ستار وغیرہ۔ لفظ اللہ اسم ذات کی حیثیت رکھتا ہے جو تمام صفات کمال کا جامع ہے۔

نام رکھنے کا مسئلہ:

مسلمان برکت کے طور پر خدا کے صفاتی ناموں پر اپنے نام رکھتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ مسلمانوں میں ناموں کو بگاڑنے کا رواج بھی عام ہے اور نام کے آخری لفظ سے لوگوں کو پکارا جاتا ہے۔ جہاں تک مشترک اسما کا تعلق ہے ان میں اگر کسی کو عبد الرحیم، عبد الکریم، یا عبد العلیٰ کہنے کے بجائے رحیم، کرم یا صرف علی کہہ کر پکارا جائے تو ان پاک ناموں کے ساتھ بے ادبی کا پہلو ہے لیکن اگر یہ تخفیف خاص الخاص اسمائے حسنیٰ میں کی جاتی ہے اور عبد الرحمٰن کو صرف رحمٰن کہہ کہ پکارا جاتا ہے تو اسے فقہائے اسلام نے حرام اور گناہ کبیرہ قرار دیا ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں کہ یہ نام جتنی مرتبہ منہ سے نکلتے ہیں گناہ کبیرہ لازم آتا ہے اور سننے والا بھی گناہ سے محفوظ نہیں رہتا۔

(معارف القرآن، جلد۴، صفحہ۱۳۳)

ہمارے ہاں کتنے رحمٰن پہلوان، غفار کالیے، ستار لنگڑے، سبحان فیکٹری والے، ستار کباڑیے، غفار حلوائی اور قدوس لباڑیے (بے ہودہ گو) ہیں؟ پھر ان ناموں کے ساتھ دہلی والے جو اب بے تبے کرتے ہیں، لڑائی میں رحمٰن، ستار اور غفار کے الفاظ بول کر آپس میں گالم گلوچ ہوتی ہے، یہاں تک کہ غفار کے باپ اور ستار کی ماں بہن کو پنا جاتا ہے، آخر اس بدتہذیبی کا شرعی گناہ ہماری نظروں سے کیوں اوجھل ہو گیا؟

اللہ تعالیٰ کے مقدس ناموں کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیائے کرام کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔ محمد اور احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ حضور علیہ السلام پر درود و سلام پڑھنا واجب ہے لیکن ہمارے ہاں ان ناموں کے ساتھ گستاخی کا جو افسوس ناک عمل جاری ہے اس کے تصور سے بھی شرم آتی ہے۔ ''محمد کھدرے'' جامع مسجد کے علاقے کا مشہور نام ہے۔ دلّی میں جس کے چہرے پر سیتلا کے داغ ہوتے ہیں اسے کھدرا کہا جاتا ہے۔ محمد پہلوان پھر پہلوانی کے ساتھ جتنی بھلائیاں، برائیاں وابستہ ہیں وہ سب اسی نام پاک کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں۔ حضرات انبیا کے ناموں کے ساتھ خلیل چرسیا، یعقوب سٹے باز، ابراہیم چوڑی گھس (منہیار تھے) یعقوب کفن کھسوٹ (قبرستان نبی کریم کا گورکن تھا) یوسف مسخرا (مستری یوسف مشہور تھا) جیسا سلوک کیا

جاتا ہے۔ مشہور شیر میوات قبرستان مہندیان کے نگراں کو ''علی شیر اموات'' کا نام دیکر
حضرت علیؓ جو شاہ مرداں تھے، کے نام کی یہ گت بنائی جاتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے اسمائے گرامی اور حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کی صاحب زادیوں کے مبارک نام بھی اسی طرح بگاڑے جاتے ہیں۔ عائشہ
صدیقہؓ کو عیشا اور عاشیہ، اور فاطمۃ الزہراءؓ کو فاتو۔ پھر ان مقدس ناموں کے ساتھ بے
ادبی، اری عائشہ، اری فاطمہ، بدزبان شوہر اور بدزبان ساس، نندیں ان ناموں کے
ساتھ جو گستاخیاں کرتی ہیں وہ مسلم معاشرے کا نہایت افسوس ناک پہلو ہے اور
ناقابل بیان ہے۔

اللہ کا لفظ اسم ذات کے طور پر بولا جاتا ہے (جس کا مطلب یہ ہے کہ اس ایک لفظ
میں خداوند عالم کی تمام صفات کمال کا تصور موجود ہے۔ ہمارے ہاں حبیب اللہ کو ''بلا''
اور قدرت اللہ ''تلا'' کہا جاتا ہے۔ غنیمت ہے کہ بگاڑنے والوں نے ''ت'' اور ''ب''
لگادی۔ پہلے شرفا میں ایک بچے کا نام بھی پورا لیا جاتا تھا، پیار میں نام بگاڑنے کو غلط سمجھا
جاتا تھا۔ گھر کے ملازمین کو بھی پورے ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ حضرت سید محمد گیسودرازؒ
خلیفہ حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلویؒ کا واقعہ ہے کہ ایک مجلس میں کسی صاحب نے
اپنے غیر مسلم دوست کو بے تکلفی میں ''او بندا'' کہہ کر مخاطب کیا۔ سید صاحبؒ نے انھیں
ٹوکا کہ یہ کیا تہذیب ہے؟ وہ بولے کہ یہ غیر مسلم ہیں۔ فرمایا ''تم تو مسلمان ہو۔''

اسلامی تہذیب کا بنیادی سبق:

اسلام اخلاق کے مکمل دستور (سورۃ الحجرات) میں ہدایت کی گئی ہے:

وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الْاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ○

''لوگو! ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ اور ایک دوسرے کو برے القاب سے
نہ پکارو، ایمان لانے کے بعد کسی شخص کو (پہلے) گناہ کے نام سے یاد کرنا
برا ہے۔''

جلد: ۵
۲۴ ویں مجلس:

حسد اور غبطہ کی بحث

حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا کے حوالے سے حسد
اور غبطہ کا فرق بیان فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا یہ ہے:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِىْ مَحْسُوْدًا وَّلَا تَجْعَلْنِىْ حَاسِدًا.

''خداوند! مجھے قابل حسد بنادے اور حسد کرنے والا نہ بنا۔''

محسود کا ترجمہ اس خاکسار نے قابل حسد کیا ہے، مطلب یہ ہے کہ میرے اندر
ایسی بھلائیاں اور سعادتیں پیدا کردے کہ میں لوگوں کے لیے حسد کے قابل ہو جاؤں
لیکن میرے اندر ایسا احساس کم تری اور حرص پیدا نہ کر کہ میں کسی دوسرے کے کمالات
دیکھ کر جلنے لگوں اور اسے ہونسنے لگوں۔ محسود بنانے کا یہ مطلب نہیں کہ لوگ مجھ سے
حسد کرنے اور مجھے دیکھ کر جلنے بھننے لگیں اور اس طرح گناہوں میں مبتلا ہوں۔

شیخ علیہ الرحمہ نے غبطہ کا مطلب یہ فرمایا کہ کسی دوسرے کے کمالات دیکھ کر یہ
خواہش کی جائے کہ یہ کمالات میرے اندر بھی پیدا ہو جائیں۔ اس دوسرے کے
کمالات چھین کر خود لینے کی خواہش نہ ہو جیسا کہ حسد میں ہوتا ہے۔

غبطہ کا لفظ اس حدیث میں آیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے **اَلْمُتَحَابُّوْنَ فِی
اللّٰهِ.** خدا کے لیے آپس میں محبت کرنے والوں۔ کا مرتبہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ
یہ لوگ آخرت کی زندگی میں نور کے بلند میناروں پر رونق افروز ہوں گے اور ان کے
درجات عالیہ کو دیکھ کر **يَغْبِطُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ** خدا کے رسول غبطہ کریں گے اور یہ خواہش
کریں گے کہ ہمیں بھی یہ عالی مرتبہ عطا ہو۔ (مشکوٰۃ: ۴۲۶)

شیخ علیہ الرحمہ نے فرمایا حسد کرنا حرام ہے، غبطہ حلال ہے۔ حسد اور کسی سے

جلنے اور اسے ہونسنے کا گناہ ایک بڑا اخلاقی گناہ ہے جس کے لیے شیخ علیہ الرحمہ نے حرام کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اخلاقیات میں حرام و حلال کی بحث تصوف کا خاص موضوع ہے جسے اصلاح باطن کہا جاتا ہے۔ دیوبند کے مشہور محدث علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ فرمایا کرتے تھے کہ نماز میں خشوع وخضوع (عجز و تواضع اور خوف کی کیفیت) اختیار کرنے کی قرآن کریم نے خاص اہمیت بیان کی ہے:

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ. (بقرہ:۴۵)

"خشوع اختیار کرنے والوں پر ہی نماز بھاری نہیں ہوتی۔"

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ O (مومنون:۱-۲)

"اور وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔"

مگر میں نے سالہا سال فقہ کی کتابوں میں تلاش کیا کہ فقہائے کرام نے اس مسئلے کا کہیں ذکر کیا ہے یا نہیں؟ مدت کے بعد فقہ کی ایک قلمی کتاب میں ایک فقرہ مجھے ملا کہ خشوع نماز کے مستحبات میں سے ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فقہا انسانی قالب (جسم وظاہر) کی اصلاح کو موضوع بناتے ہیں اور انسانی قلب و روح ان کے موضوع سے خارج ہے۔

مثال کے طور پر حدیث پاک میں آتا ہے کہ جھوٹ اور غیبت دونوں برائیاں روزے کے ڈھال کو توڑ دیتی ہیں۔ مگر فقہا کے نزدیک روزہ نہ جھوٹ سے ٹوٹتا ہے اور نہ غیبت سے ٹوٹتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جھوٹ اور غیبت سے انسانی قالب، جسم وظاہر متاثر نہیں ہوتا۔ ہاں اس کی روح میں ظلمت پیدا ہو جاتی ہے۔

صوفیائے کرام روح کی ظلمت کو اہمیت دے کر حکم لگاتے ہیں۔ چناں چہ امام غزالیؒ نے روزے کے درست ہونے کی شرطوں میں فقہ کی دو شرطوں ترک طعام اور ترک خواہش کے ساتھ آنکھوں، کانوں، اور زبان و قلب کا برائیوں سے بچنا بھی شامل

کیا ہے۔

شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ نے اپنی کتاب طبقات الصوفیۃ الکبریٰ کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اگر ائمہ فقہ کتاب و سنت سے فرض، واجب اور مستحب اور حرام و مکروہ کے مسائل کا استنباط کرتے ہیں تو صوفیائے کبار اگر کتاب و سنت کے اخلاقی اور روحانی حصہ سے اصلاح باطن کے لیے جزئیات کا استنباط کرتے ہیں تو اس پر تعجب کیوں کیا جاتا ہے؟

آخر میں لکھتے ہیں:

لیس ایجاب مجتهد باجتهاده شیئالم یصرح الشریعة بوجوبه اولی من ایجاب ولی الله حکماً فی طریق لم تصرح الشریعة بوجوبه

"یعنی شریعت میں جن باتوں کے واجب ہونے کی تصریح نہیں ملتی لیکن ایک مجتہد اپنے اجتہاد سے ان پر وجوب کا حکم لگا دیتا ہے تو اپنے خاص طریقے سے ایک ولی کسی بات پر وجوب کا حکم لگا دیتا ہے جس کی تصریح شریعت میں نہیں ملتی تو دونوں میں ایک کو ترجیح دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" (طبقات الصوفیہ الکبریٰ، جلد اول، صفحہ ۴)

البتہ یہ ساری بحث کتاب و سنت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے ہے۔

امت کے حالات میں تغیر وانقلاب کے پانچ دور:

شیخ علیہ الرحمہ نے ایک مجلس میں امت محمدی کے حالات میں تغیر و تبدل کے مختلف پانچ دور اور پانچ طبقے کیے ہیں۔

شیخ کے سامنے اس بیان میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی جو پیشین گوئی ہے پہلے اس پر غور کیجیے، پھر دیکھیے کہ شیخ نے اس نبوی پیشین گوئی کی تشریح میں کیسی حکیمانہ بصیرت سے کام لیا ہے۔

اس مفہوم کی پیشین گوئیاں مسلم، ترمذی، ابن ماجہ وغیرہ کتب صحیح میں مروی ہیں۔

ہم ذیل میں وہ روایت نقل کرتے ہیں۔ جیسے امام شاطبیؒ نے موافقات اور مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ نے اپنی مشہور کتاب منصب امامت میں نقل کیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

پہلا دور۔ **اِنَّ دِیْنَکُمْ نُبُوَّۃٌ وَّرَحْمَۃٌ وَّتَکُوْنُ فِیْکُمْ مَاشَآءَ اللّٰہُ اِنْ تَکُوْنَ ثُمَّ یَدْفَعُھَا اللّٰہُ جَلَّ جَلَالَہٗ۔**

دوسرا دور۔ **ثُمَّ تَکُوْنُ خِلَافَۃٌ عَلٰی مِنْھَاجِ النُّبُوَّۃِ مَاشَآءَ اللّٰہُ اَنْ تَکُوْنَ ثُمَّ یَدْفَعُھَا اللّٰہُ جَلَّ جَلَالَہٗ۔**

تیسرا دور۔ **ثُمَّ تَکُوْنُ مَلَکًا عَاضًا فَیَکُوْنُ مَاشَآءَ اللّٰہُ اَنْ یَّکُوْنَ ثُمَّ یَدْفَعُھَا اللّٰہُ جَلَّ جَلَالَہٗ۔**

چوتھا دور۔ **ثُمَّ تَکُوْنُ مَلَکًا جَبْرِیَّۃً فَتَکُوْنُ مَاشَآءَ اللّٰہُ اَنْ تَکُوْنَ ثُمَّ یَدْفَعُھَا اللّٰہُ جَلَّ جَلَالَہٗ۔**

پانچواں دور۔ **ثُمَّ تَکُوْنُ خِلَافَۃٌ عَلٰی مِنْھَاجِ النُّبُوَّۃِ تَعْمَلُ فِی النَّاسِ بِسُنَّۃِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔**

"یعنی پہلا دور نبوت و رحمت کا ہوگا۔ دوسرا دور نبوت کے طریقہ پر قائم خلافت کا ہوگا، تیسرا دور تکلیف دہ بادشاہت کا ہوگا، چوتھا دور جبری بادشاہت کا ہوگا، پانچواں دور پھر خلافت نبوت کا ہوگا جس میں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق عمل ہوگا۔"

اس حدیث کے راوی حضرت حبیبؓ کہتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ کو سنائی اور کہا مجھے امید ہے کہ آخری خلافت نبوت سے آپ کی خلافت کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت عمرؒ یہ سن کر خوش ہوئے اور انھیں تعجب ہوا۔

بعض علما یہ کہتے ہیں کہ پانچویں دور سے قرب قیامت کے اس دور کی طرف اشارہ ہے جس میں حق کو غلبہ نصیب ہوگا اور یہ دور نزول مسیح کے بعد آئے گا۔

حضرت سفینہؓ کی ایک روایت میں خلافت نبوت کی مدت تیس سال بیان کی گئی ہے۔ یہ مدت اس طرح بنتی ہے۔

خلافت حضرت ابو بکرؓ ۲ سال، خلافت حضرت عمرؓ ۱۰ سال، خلافت حضرت عثمانؓ ۱۲ سال، خلافت حضرت علیؓ ۶ سال اور حضرت حسنؓ چھ ماہ۔

اس پیشین گوئی کی روایت کو حافظ ابن کثیر دمشقیؒ نے اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ (جلد ۸، صفحہ ۲۰) میں ان الفاظ کی زیادتی کے ساتھ نقل کیا ہے۔

ثم کائن عتوا و جبریة وفسادا فی الارض یستحلون الحریر والفروج والخمور ویرزقون وینصرون حتی یلقوا اللّٰہ۔

"پھر اس کے بعد جبر و اکراہ والی حکومت بن جائے گی اور پھر یہ سرکشی تشدد اور فساد میں بدل جائے گی۔ اور مسلمان حکمران ریشم کے استعمال کو اور بدکاری اور شراب نوشی کو جائز افعال کی طرح کرنے لگیں گے، اور انھیں خوب رزق وروزی ملے گی اور اسباب کے ذریعے ان کی مدد ہوگی یہاں تک کہ وہ اسی (مہلت اور معصیت) حالت میں خدا سے جاملیں گے۔"

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ تجزیہ جو آپ کی پیغمبرانہ بصیرت کا نتیجہ ہے امت کے اجتماعی اور سیاسی عروج و اقبال اور انحطاط و زوال کے اعتبار سے ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ نے ان پانچ دوروں کو اخلاقی اور روحانی عروج و زوال کے اعتبار سے واضح کیا۔ فرماتے ہیں:

اَلطَّبَقَۃُ الْاُوْلٰی، طَبَقَۃُ الْعِلْمِ وَالْمُشَاھِدَۃُ۔

"آں صحابہ کرام بودند۔"

"پہلا طبقہ علم اور مشاہدے کا تھا اور یہ حضرات صحابہ کرامؓ کا عہد تھا (جس میں علم الٰہی اور مشاہدہ حقیقت کا غلبہ تھا)۔"

اَلطَّبَقَۃُ الثَّانِیَۃُ، طَبَقَۃُ الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی۔

"آں تابعین بودند۔"

"دوسرا طبقہ نیکی اور تقویٰ کے غلبہ کا تھا اور یہ تابعین کرامؒ کا عہد تھا۔"

اَلطَّبَقَۃُ الثَّالِثَۃُ، طَبَقَۃُ التَّوَاصُلِ وَالتَّرَاحُمِ۔

"تیسرا طبقہ تواصل وتراحم کا تھا۔"

اس دور میں مشترک دنیوی دولت وحشمت کو آپس میں محبت ورعایت کے ساتھ استعمال کیا اور جو مال ودولت انھیں ذاتی ملکیت کے طور پر حاصل ہوا ضرورت پڑنے پر وہ تمام راہ خدا میں صرف کر دیا۔ پہلی صفت کو شیخؒ نے تواصل اور دوسری کو تراحم کہا ہے (اور یہ صفت اس دور کے مسلمانوں کی اکثریت میں رونما ہوئی)۔

اَلطَّبْقَةُ الرَّابِعَةُ، طَبْقَةُ التَّقَاطُعِ وَالتَّدَابُرُ.

"چوتھا دور تقاطع اور تدابر کا ہوا۔"

اس دور کے مسلمانوں نے دنیوی مال وجاہ کی تقسیم میں ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی وعداوت کا رویہ اپنایا اور اس بات کی کوشش کی کہ جن کے ہاتھ میں دولت وحشمت آجائے وہ اسے اپنے قبضہ میں رکھے اور کسی دوسرے تک نہ پہنچنے دے اور ایک دوسرے سے پیٹھ پھیر کر نکل جائے۔

اَلطَّبْقَةُ الْخَامِسَةُ، طَبْقَةُ الْهَرَجُ وَالْمَرَجُ.

"پانچواں دور ہرج اور مرج کا۔"

اس دور میں دولت وعزت حاصل کرنے میں ایک دوسرے کو قتل کیا اور برباد کیا۔

شیخؒ نے ان میں سے ہر دور کے لیے بیس سال کا اندازہ مقرر کیا ہے اور پھر ان دوسو سال کے بعد کے لیے شیخؒ نہایت سخت پیرایے میں فرماتے ہیں:

"بعد ازیں دویست سال اگر کسے سگ بچہ بزاید بہ نہ فرزند آدم۔" (جلد۳، مجلس۱۰، صفحہ۴۹۶)

"ان دوصدیوں کے بعد آدمی کے بچے سے کتے کے بچہ کا پیدا ہونا بہتر ہوا۔"

پھر شیخؒ پر گریہ طاری ہو گیا اور فرمایا:

یہ حال حضور علیہ السلام کے وصال کے بعد دوسو سال میں پورا ہو گیا۔

"ایں ساعت خود مردم چہ گوید۔"

"آج کل کے بارے میں آدمی کیا کہے؟"

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا تجزیہ:

حضرت شاہ صاحبؒ نے امت کے پانچ دوروں کو پانچ انقلاب کے عنوان سے بیان کیا ہے اور وہ اس طرح ہے۔

پہلا تغیر:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہے، جس کی وجہ سے وحی الٰہی کا سلسلہ بند ہو گیا اور امت پر جو آسمانی برکتیں نازل ہو رہی تھی وہ موقوف ہو گئیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

جب تم پر کوئی مصیبت نازل ہو تو اس سے میرے وصال کی مصیبت کو یاد کرنا چاہیے کیوں کہ وہ تمہارے لیے سب سے بڑی مصیبت اور سب سے بڑا حادثہ ہے۔

دوسرا تغیر:

حضرت عمرؓ کی شہادت ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کو دوسرا تغیر اس لیے نہیں قرار دیا کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ دونوں دو قالب ایک جان کی مثل تھے۔

صدیق اکبرؓ نے بنیاد ڈالی اور عمر فاروقؓ نے اس کی تکمیل کی۔

حضرت عمرؓ کی شہادت سے امت پر فتنوں کی بارش شروع ہو گئی۔

حضرت حذیفہؓ کی روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو امت کے لیے فولادی دروازہ قرار دیا تھا۔

تیسرا تغیر:

حضرت عثمانؓ کی شہادت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کے عہد کو زمانہ امن وخیر اور زمانہ شر کے درمیان حد فاصل قرار دیا تھا۔

حضرت عثمانؓ شیخین کی بہ نسبت عزیمت سے رخصت پر اتر آئے تھے ان کے حکام بھی شیخین کے حکام کی مانند نہ تھے، ان کے عہد میں عام مسلمانوں کی عملی حالت اور اطاعت امیر کی کیفیت کم زور پڑ گئی تھی۔

اس انقلاب کے بعد امت میں تین بڑے حادثے رونما ہوئے۔

حضرت علیؓ کی خلافت سے ان فتنوں کا آغاز ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ علیؓ کی خلافت، خلافت منتظمہ نہ ہوگی اور آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشین گوئی کو سن کر رنجیدہ ہوئے تھے۔

پہلا فتنہ جو آپ کے دور میں پیدا ہوا وہ جنگ جمل ہے، دوسرا فتنہ جنگ صفین اور تیسرا جنگ نہروان ہے، چوتھا حضرت امام حسنؓ کی دست برداری کے نتیجہ میں حضرت معاویہؓ کی بادشاہت کا قیام، پانچواں فتنہ حضرت امام حسینؓ کی شہادت۔

ان فتنوں کے بعد شام کی بادشاہت کا دور قایم ہوا۔

چوتھا تغیر:

بنی عباس کی حکومت کا قیام جو چار سو برس تک قایم رہی۔

پانچواں تغیر:

چار سو سال کے بعد عباسی حکومت ختم ہوگئی اور اس طرح قریش کی حکومت کے پانچ سو سال بعد غیر قریشی (عجمی) سلطنت کا دور شروع ہوا۔

عجمیوں کی حکومت بالکل مجوسیوں کی حکومت کی طرح ہے، فرق یہ ہے کہ یہ عجمی بادشاہ کلمہ پڑھتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں۔

ہم لوگ اسی پانچوں انقلاب کے دامن میں پیدا ہوئے ہیں۔ اب نہیں جانتے کہ خدائے قدوس برتر و توانا کی مشیت اس کے بعد کیا ہے۔ (صفحہ ۳۶۳)

شیخ علیہ الرحمہ اور شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے دراصل عربی اقتدار کے قیام تک پانچ عہد شمار کیے ہیں۔

شاہ صاحبؒ عربی اقتدار کو خلافت عباسی کے خاتمہ تک شمار کرتے ہیں اور اس حساب سے یہ دور سات سو سال کا قرار پاتا ہے۔

لیکن شیخ علیہ الرحمہ بنی عباس کے پورے پانچ سو سالہ عہد کو عربی اقتدار کا عہد نہیں قرار دیتے بلکہ صرف شروع کے نصف عہد کو عربی اقتدار سمجھتے ہیں اور بعد کے آدھے عہد کو (جو عہد زوال تھا) عجمی اور ترک غلاموں کے اقتدار کا دور قرار دیتے ہیں۔ اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ معتصم باللہ کے آخر عہد میں خلافت عباس برائے نام رہ گئی تھی اور غلاموں، خواجہ سراؤں اور باندیوں کا عمل دخل حکومت میں بڑھ گیا تھا۔ طوائف الملو کی شروع ہو چکی تھی اور شکست خوردہ عیسائی اقتدار نے حملے شروع کر دیے تھے۔

ایک نکتہ شیخ علیہ الرحمہ کے اس تجزیے میں یہ ہے کہ آپ نے اس دو سو سالہ دور کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد سے شروع کیا ہے اور اس میں اشارہ پوشیدہ ہے کہ عہد رسالت ''عہد وحی'' ہے جس میں درحقیقت ہادی خداوند عالم تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات واسطہ تھی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری واسطے سے ہادی مطلق جل مجدہٗ نے خود اپنے بندوں کی رہنمائی فرمائی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے خطبہ خلافت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر کے امت کو خبردار کیا تھا کہ اب ہمیں پھونک کر قدم رکھنا ہے کیوں کہ وحی الٰہی کا سلسلہ بند ہو چکا ہے۔

ارکان تصوف

قلت نوم، قلت طعام، قلت کلام اور قلت صحبۃ الانام

شیخ علیہ الرحمہ نے تصوف کے چار بنیادی آداب بیان فرمائے۔

پہلا ادب کم سونا:

یہ ہدایت قرآن کریم کی حسب ذیل آیت سے اخذ کی گئی۔ متقی لوگوں کی صفت بیان کرتے ہوئے کہا گیا:

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَايَهْجَعُوْنَ. (ذاریات:۱۷)

''وہ متقی لوگ رات کو کم سوتے تھے اور صبح کے وقت توبہ و استغفار کرتے تھے۔''

دوسرا ادب، کم کھانا:

حدیث پاک میں کہا گیا:

اِنَّ الْمُوْمِنَ يَاْكُلُ فِى مَعًا وَّاحِدٍ وَالْكَافِرُ يَاْكُلُ فِىْ سَبْعَةِ اَمْعَاءٍ. (مشکوٰۃ:۳۶۴ بخاری)

''مومن ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔''

محدثین کے نزدیک یہ حدیث نبوی استعارہ کے طور پر کافر کی سات بری صفتوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ کافر حرص، ہوس، طمع، حسد اور طول امل کی خواہش اور جسمانی فربہی اور طبعی خباثت کے سبب کھانا زیادہ کھاتا ہے اور مومن صرف اپنی طبعی بھوک مٹاتا ہے۔

ایک حدیث میں فرمایا:

إِنَّ كَثْرَةَ الْأَكْلِ شُؤْمٌ. (مشکوٰۃ:۳۶۸ بیہقی)

"بے شک زیادہ کھانا نیستی کی بات ہے۔"

تیسرا ادب، کم بولنا:

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ راوی ہیں:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَمَتَ نَجَا. (مشکوٰۃ:۴۱۳ ترمذی)

"جس نے سکوت اختیار کیا اس نے نجات پائی۔"

امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں کہ عربی میں صمت کے مفہوم میں سکونت سے زیادہ مبالغہ ہے، صمت کہا جاتا ہے طبعی خاموشی یعنی بولنے کی طاقت نہ ہو، اور اختیاری خاموشی کو سکوت کہا جاتا ہے۔

مشکوٰۃ ہی کی ایک حدیث ہے:

اَلْعِيُّ مِنَ الْإِيْمَانِ.

"بولنے میں کمی اور رکاوٹ ایمان کا جز ہے۔"

مولانا تھانویؒ نے اس کی شرح میں فرمایا:

دل جب آخرت کے فکر میں مشغول ہوتا ہے تو اس حالت میں بولنے کے اندر کمی واقع ہونا لازمی ہے البتہ دین کی ضرورت کے لیے طلاقت لسان اور زور بیان نہ صرف محمود ہے بلکہ ضروری ہے۔ (مجالس حکیم الامت:۱۱۸)

مرتب عرض کرتا ہے کہ دین کی ضرورت ہی کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی۔

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْ أَمْرِيْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ. (طٰہٰ:۲۷)

"اے میرے پروردگار! میرا سینہ کھول دے اور تبلیغ دین کو میرے لیے آسان کردے اور میری زبان کی رکاوٹ دور کردے۔"

شاہ عبدالقادر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ شرح صدر سے مراد حوصلہ مندی ہے اور قوت برداشت ہے۔

قرآن کریم نے اچھے کلام کرنے کا حکم دیا ہے:

قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا. (بقرہ:۸۳)

"لوگوں سے اچھا کلام کرو۔"

اس میں تبلیغ ودعوت اور تعلیم اور سلام ودعا سب داخل ہیں، رہا قولی ذکر، تو وہ عین عبادت ہے۔

غیر مسلموں کو السلام علیکم کہنا:

ابن کثیرؒ نے ایک تابعی حضرت سوادؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ گذرتے ہوئے جب یہود ونصاریٰ کے پاس پہنچتے تھے تو انھیں السلام علیکم کہتے تھے۔ لوگ جب ان سے سوال کرتے تھے کہ آپ غیر مسلموں کو سلام کی ابتدا کیوں کرتے ہیں؟ تو حضرت سوادؒ جواب دیتے تھے کہ آیت مذکورہ میں سلام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تابعین میں عطا خراسانیؒ کا بھی یہی قول ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ کے بالواسطہ شاگرد علامہ ابن کثیرؒ اس بحث کے بعد لکھتے ہیں:

فَقَامَتْ هٰذِهِ الْأُمَّةُ مِنْ ذٰلِكَ بِمَا لَمْ يَقُمْ بِهٖ أُمَّةٌ مِّنَ الْأُمَمِ قَبْلَهَا وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ.

(تفسیر ابن کثیر جلد اول مصری عربی، صفحہ ۱۲۰)

"انہی اخلاق کی وجہ سے یہ امت برتری کے اس مقام پر پہنچی جس مقام پر دوسری امت نہ پہنچ سکی۔"

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں، حضور علیہ السلام نے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ أَمَرَنِيْ بِمُدَارَاةِ النَّاسِ كَمَا أَمَرَنِيْ بِإِقَامَةِ الْفَرَائِضِ. (ابن کثیر جلد اول، صفحہ ۴۲۰)

"اللہ تعالیٰ نے مجھے عام مخلوق کی خاطر مدارات کرنے کا اسی طرح حکم دیا

ہے جس طرح دینی فرائض کی ادائیگی کا حکم دیا ہے۔"

کسی سائل نے سوال کیا کہ غیر مسلموں (ہندوؤں) کو السلام کہنا جائز ہے یا نہیں؟ مشہور محدث وفقیہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے جواب میں یہ فتویٰ دیا:

ضرورت کے وقت غیر مسلموں کو السلام علیکم کہنا مباح ہے۔

(فتاوئ رشیدیہ جلد اول، صفحہ ۶۰)

عام طور پر دینی حلقوں میں یہ مسئلہ مشہور ہے کہ غیر مسلموں کو سلام کی ابتدا نہ کی جائے لیکن یہ شہرت علم دین سے تعلق نہیں رکھتی۔ اہل علم کے سرگروہ کا فتویٰ اوپر مذکور ہے۔

قرآن کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حوالے سے یہ بتایا کہ جب ان کے باپ آزر نے انھیں گھر سے نکالا تو چلتے وقت انہوں نے کہا:

سَلَامٌ عَلَیْکَ سَاَسْتَغْفِرُلَکَ رَبِّیْ اِنَّہٗ کَانَ بِیْ حَفِیًّا. (مریم:۴۷)

"اے باپ! تم پر سلامتی ہو میں ضرور تمہارے حق میں دعائے مغفرت کروں گا، بے شک میرا پروردگار مجھ پر مہربان ہے یعنی وہ میری سنے گا۔"

عربی میں اسے سلام رخصت کہا جاتا ہے، اس کا ہندی بھاشا میں بہترین ترجمہ شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ نے یہ کیا ہے

پتا جی! سکھی رہو۔

ڈپٹی نذیر احمد صاحبؒ نے محاورے کی رعایت سے یہ ترجمہ کیا:

ابراہیم نے کہا، اچھا تو میرا اسلام ہے۔ اس پر بھی میں اپنے پروردگار سے آپ کی مغفرت کی دعا کروں گا۔

ایک حدیث قدسی ہے۔

لَا تَنْظُرُوْٓا اِلٰی ذُنُوْبِ الْعِبَادِ کَاَنَّکُمْ اَرْبَابٌ.

"اے لوگو! تم میرے بندوں کے گناہوں کو اس طرح نہ دیکھو گویا تم ان کے پروردگار ہو۔"

قسطلانی شرح بخاری کے حوالے سے مفتی محمد شفیع صاحبؒ (کراچی پاکستان) نے یہ روایت نقل کی ہے اور اس حدیث پر یہ شعر لکھا ہے۔

گناہ آئینہ عفو و رحمت است اے شیخ
مبین بہ چشم حقارت گناہ گاراں را

(مجالس حکیم الامت مولانا تھانوی، صفحہ ۸۵)

"اے شیخ! میرے گناہ خدا کے عفو وکرم کا آئینہ ہیں تو گناہ گاروں کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھا کر۔"

چوتھا ادب کم میل جول رکھنا:

لوگوں کے ساتھ میل جول میں احتیاط رکھنا، اس سے بے مقصد اور بے کار میل جول مراد ہے، حدیث میں آتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَالَا یَعْنِیْہِ.

(مشکوٰۃ:۴۱۳ ترمذی)

"دین داری اور فرماں برداری کا کمال حسن یہ ہے کہ انسان بے مقصد اور بے ضرورت باتوں سے پرہیز کرے۔"

قرآن کریم میں آیا ہے۔

وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا. (فرقان:۷۲)

"وہ رحمٰن کے بندے ایسے ہوتے ہیں کہ جب لغو اور بے کار کاموں پر ان کا گذر ہوتا ہے تو وہ نہایت شرافت کے ساتھ گذر جاتے ہیں۔"

حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ لکھتے ہیں:

"یعنی گناہ میں شامل نہیں اور کھیل کی باتوں کی طرف دھیان نہیں کرتے، نہ اس میں شامل اور نہ ان سے لڑیں۔"

اب زیادہ میل جول جو تعلیم، تبلیغ اور اجتماعی عبادت کے لیے ہوتا ہے یا خوشی اور رنج کی محفلوں میں شرعی ہدایت کے تحت ہوتا ہے وہ عبادت میں داخل ہے۔

کسی کے ساتھ برائی نہ کرنا ہی بڑی نیکی ہے

ایک مجلس میں شیخ علیہ الرحمہ نے موجودہ دورِ زوال کے بارے میں فرمایا:

''دریں عہد کہ ما ئیم اگر یکے را گویند کہ بد نیست بہماں قدر او را نیک تواں گفت آں گاہ فرمود کہ اگر کسے در عیب مردماں فرونشود و کسے را بدنگوید اگر چہ او بد باشد ہم او را نیک گیرند، بدنگویند۔''

''اس عہد میں جس میں ہم ہیں اگر کسی شخص کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ برا آدمی نہیں ہے تو اسی قدر اس کو نیک کہا جائے گا، پھر فرمایا اگر کوئی شخص کسی کی عیب جوئی نہیں کرتا اور کسی کی برائیوں کی ٹٹول میں نہیں رہتا اور کسی کو برا نہیں کہتا تو چاہے وہ برا آدمی ہو مگر اس صفت کی وجہ سے اسے نیک کہا جائے گا، برا نہیں کہا جائے گا۔''

پھر آپ نے یہ شعر پڑھا۔

گر با عیبی و عیب نہ جوئی نیکی
ور بد باشی و بدنگوئی نیکی

''اگر تم میں عیب ہو مگر تم دوسروں کے عیبوں کو کھولتے نہ پھرو تو تم نیک ہی ہو اور اگر تم خود برے ہو مگر دوسروں کو برا کہتے نہیں پھرتے تو تم نیک ہی ہو۔'' (جلد۴، مجلس ۱۹، صفحہ ۲۶۶)

شیخ علیہ الرحمہ نے یہ بات آج سے سات سو برس پہلے فرمائی تھی پھر آج کے حالات میں اس تعلیم کی کتنی اہمیت ہے؟ جب کہ مسلم معاشرے میں عبادت تو کسی درجہ میں نظر آتی ہے مگر مسلم معاشرہ اسلامی اخلاق و آداب سے بالکل خالی ہو چکا ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ نے جن احادیث کے مفہوم کے موجودہ دورِ زوال کے مطابق تعبیر وتوجیہ کے اسلوب میں بیان فرمایا، وہ احادیث یہ ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں۔

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ.

(مشکوٰۃ:۱۲ صحیحین)

"مسلمان وہ شخص ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ کے شر سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں۔"

ایک روایت میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے **اَیُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ؟** "حضور! افضل اور بہتر اسلام کون سا ہے؟" کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا۔

ایک حدیث میں بدگوئی کرنے والے، بدزبانی کرنے والے، گالیاں دینے والے اور لوگوں پر طعنہ زنی کرنے والے سے ایمان کی نفی کر دی گئی۔ فرمایا:

لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا بِاللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِیْ. (مشکوٰۃ:۴۱۳ ترمذی)

دونوں حدیثوں کا مطلب یہ ہے کہ کامل مسلمان اور کامل مومن وہ ہے جو عبادات کے ساتھ اپنے آپ کو اذیت رسانی سے محفوظ رکھے۔ یعنی دونوں حدیثوں میں کمال کی نفی ہے۔

محدثین نے یہی مطلب بیان کیا ہے۔ رسالت کا دور دورِ کمال تھا۔ موجودہ دورِ دورِ زوال ہے۔ اس دور میں ان احادیث کی یہ تاویل کی جائے گی کہ مسلمان اور مومن وہی شخص ہے جو اپنے آپ کو اذیت رسانی سے محفوظ رکھے۔ اس کے حق میں یہ منفی صفت ہی اس کے مسلمان ہونے کی دلیل ہے۔

اس آخری دور کے بارے میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اِنَّكُمْ فِیْ زَمَانٍ مَّنْ تَرَكَ مِنْكُمْ عُشْرَ مَا اُمِرَ بِهٖ هَلَكَ ثُمَّ يَاْتِیْ زَمَانٌ مَنْ عَمِلَ مِنْهُمْ بِعُشْرِ مَا اُمِرَ بِهٖ نَجَا. (مشکوٰۃ:۳۱ ترمذی)

"اے میرے صحابہ! تم لوگ اس زمانہ سعادت میں ہو اگر تم میں سے کوئی شخص دین کے دسویں حصہ کو بھی چھوڑ دے گا تو وہ ہلاک ہو جائے گا، پھر ایک وہ زمانہ (دینی زوال) آئے گا کہ اگر وہ لوگ دسویں حصے پر بھی عمل پیرا ہو جائیں گے تو نجات پالیں گے۔"

ہندو پر صحبت کا اثر نہ نصیحت کا:

ایک مجلس میں ایک مرید کا نوجوان لڑکا اپنے ہندو بھائی کو ساتھ لے کر حاضر ہوا، شیخؒ نے اس مسلمان سے پوچھا:

"ایں برادر تو ہیچ میل نہ مسلمانی دار؟"

"تمہارے اس بھائی کے دل میں اسلام کی کچھ رغبت موجود ہے۔"

وہ بولا، میں آپ کی خدمت میں اسی غرض سے لے آیا ہوں کہ

"تا بہ برکت نظر مخدوم مسلمان شود۔"

"یہ آپ کی برکت نظر سے مسلمان ہو جائے۔"

شیخؒ نے فرمایا، اس وقت آپ کی آنکھوں میں آنسو تھے:

"فرمود کہ ایں قوم راچنداں بہ گفتۂ کسے دل نہ گردد، اما صحبت صالح باید امید باشد کہ بہ برکت صحبت او مسلمان شود۔"

"فرمایا اس قوم کا دل کسی کے کہنے سننے سے نہیں بدلتا۔ ہاں اگر کسی صالح آدمی کی صحبت نصیب ہو جائے تو امید ہے کہ اس کی صحبت سے یہ مسلمان ہو جائے۔"

واقعہ اسی قدر ہے، نہ معلوم کہ وہ مسلمان ہوا یا نہیں؟ اور شیخؒ کی صحبت اسے ملی یا نہیں؟

پھر شیخؒ نے حضرت بایزید بسطامیؒ اور ان کے پڑوسی کا واقعہ بیان فرمایا کہ حضرت کے پڑوس میں ایک یہودی آباد تھا، جب حضرت بایزیدؒ کا وصال ہو گیا تو اس سے کسی نے پوچھا تو نے اسلام کیوں قبول نہ کیا؟ اس نے کہا کون سا اسلام قبول کروں، اگر

بایزید والا اسلام، تو وہ اسلام میرے بس کا نہیں اور اگر تم لوگوں کا اسلام تو مجھے ایسے اسلام سے شرم آتی ہے۔

"اگر اسلام آنست کہ بایزید داشت آں اسلام از من نباید واگر اینست کہ شما دارید مرا ازیں اسلام عار می آید۔"

(جلد۴، مجلس ۴۰، صفحہ ۸۰۰)

شیخ علیہ الرحمہ کے اس ارشاد گرامی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت اولیاء اللہ کی صحبت سے ہوئی ہے۔ تقریر و وعظ کی مجلسوں اور محفلوں سے کام لینے پر اکتفاء نہیں کیا گیا۔ کیوں کہ تبلیغ و دعوت کا عملی طریقہ ہی صوفیائے کرام کا مشن رہا ہے۔

بیٹیوں کی فضیلت:

ایک مجلس میں شیخ حسنؒ کا خادم ملیح کچھ مصری شیخؒ کی نذر کرنے لایا۔ آپ نے پوچھا یہ کیا ہے، شیخ حسنؒ نے عرض کیا اس کی ایک لڑکی کا نکاح ہوا ہے یہ اس کی شیرینی لایا ہے۔ شیخؒ کے علم میں تھا کہ ملیح کی چار لڑکیاں ہیں۔ شیخؒ نے ملیح کو خطاب کر کے فرمایا۔ جس کی ایک لڑکی ہو وہ اس کے اور دوزخ کے درمیان دیوار بن جائے گی۔ پھر تمہاری تو چار لڑکیاں ہیں۔

پھر فرمایا:

اَبُو الْبَنَاتِ مَرْزُوْقٍ.

"بیٹی کے باپ کے رزق میں برکت دی جاتی ہے۔"

"پدر دختراں را وسعتے باشد در رزق۔" (جلد۴، مجلس ۱۴، صفحہ ۸۰۰)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں فرمایا:

اَنَا اَبُو الْبَنَاتِ.

"میں لڑکیوں کا باپ ہوں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی نرینہ اولاد زندہ نہیں رہی اور خدا تعالیٰ نے آپ کی

نسل آپ کے محترم نواسوں کے ذریعے چلائی اور اسے قائم رکھا۔

یہ فضیلت عرب معاشرے کے اس پس منظر میں بیان کی گئی کہ عرب کے بعض قبیلے لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے اور قرآن کریم نے ان کو اطمینان دلایا تھا:

لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَکُمْ خَشْیَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ وَاِیَّاکُمْ. (بنی اسرائیل:۳۱)

"تم لوگ اپنی اولاد کو افلاس کے خوف سے قتل نہ کیا کرو، تم کو اور ان کو ہم ہی رزق و روزی عطا کرتے ہیں۔"

بیٹیوں کے جہیز کی سفارش:

شیخ علیہ الرحمہ بیٹیوں کے معاملے میں کس قدر حساس واقع ہوئے تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک روز ایک غریب مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا، حضرت میرے گھر میں دو بیٹیاں کنواری بیٹھی ہیں، میں غریب آدمی ہوں، انھیں رخصت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

شیخؒ نے خادم سے قلم دوات منگائی اور ایک پرچہ پر یہ آیت پاک لکھی:

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا. (انعام:۱۶۰)

"جو شخص ایک نیکی کرے گا اسے دس نیکیوں کا ثواب ملے گا۔"

پھر فرمایا یہ پرچہ ملک قیر بیگ کے پاس لے جاؤ، یہ علاء الدین خلجی کے امرا میں سے تھا۔ اس غریب نے وہ پرچہ قیر بیگ کو دیا اور اس سے اپنی ضرورت بیان کی۔ قیر بیگ نے شیخ کا خط پہچان لیا (جو دستخط کے بغیر تھا) اور اس ضرورت مند کا حال بہت غور سے سنا۔

قیر بیگ اس وقت اپنی لڑکی کے عقد کی تیاریوں میں مصروف تھا اور لڑکی کا جہیز تیار ہو رہا تھا، قیر بیگ نے وہ تمام سامان جمع کر کے اس ضرورت مند کے حوالے کر دیا۔

قیر بیگ دوسرے دن خلجی کے دربار میں پہنچا، خلجی کو اپنے اس ترک امیر کی فیاضی

کا واقعہ معلوم ہو چکا تھا۔ خلجی نے پوچھا، کل کیا واقعہ پیش آیا؟ ترک امیر بڑا حیران ہوا اور اس نے شیخ کی شفارش اور آپ کے پرچہ کا واقعہ سنایا، خلجی نے پوچھا، شیخؒ نے کیا لکھا تھا؟ امیر نے وہ آیت کریمہ سنائی، خلجی نے اپنے امیر کی اس فیاضی کو بہت سراہا اور کہا کہ اس سامان کی فہرست لاؤ، امیر نے فہرست پیش کردی، ظاہر ہے کہ ایک حکومتی امیر کی لڑکی کا جہیز کتنا قیمتی ہوگا؟ ترک امیروں کی فیاضی فضول خرچی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی، خلجی نے زیورات کی فہرست اپنے خزانچی کو دے کر کہا کہ اس فہرست کے مطابق دس گنا زیادہ کر کے قیر بیگ کو دے دیا جائے۔ یعنی خلجی نے شیخؒ کے بیان کردہ وعدہ الٰہی کے مطابق قیر بیگ کی ایک نیکی کا بدلہ دس گنا کر کے واپس دے دیا۔

(فوائد الفواد: ۱۲۳)

شیخ علیہ الرحمہ نے اپنے الفاظ میں کوئی سفارش نہیں کی بلکہ خدا تعالیٰ کے وعدے کی یاد دہانی کرادی۔ شیخؒ کا یہی انداز اثر کر گیا

یکے عیاں نہ کردم ز کسے نہاں نہ کردم
غزل آں چناں سرودم کہ بیروں فتادہ رازم

حضرت فاطمہؓ کا جہیز:

لڑکی کو رخصت کرتے وقت ضروریات زندگی کا سامان دینا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

آپ نے حضرت سیدہؓ کو حسب ذیل جہیز دیا۔

لحاف ایک عدد، چمڑے کا ایک گدا جس میں کسی درخت کی چھال بھری ہوئی تھی، دو عدد چکیاں، ایک پانی بھرنے کا مشکیزہ، مٹی کے دو گھڑے۔

(سیرۃ المصطفیٰ، جلد ۲، صفحہ ۶۴۳)

سیدہؓ کا مہر چار سو مثقال تھا۔ (حاشیہ مشکوۃ: ۲۷۷)

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے عقد نکاح کے وقت حضرت علیؓ سے پوچھا۔ اے علی! تمہارے پاس مہر میں دینے کے لیے کچھ ہے؟ آپ نے عرض کچھ بھی نہیں۔

آپ نے فرمایا وہ زرہ جو تمہیں جنگ بدر میں ملی تھی وہ کہاں ہے؟

حضرت علیؓ نے عرض کیا وہ زرہ تو موجود ہے۔ آپ نے فرمایا وہی دے دینا۔

پھر حضرت علیؓ نے وہ زرہ حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھ ۴۸۰ درہم میں فروخت کی اور وہ درہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیے۔ آپ نے فرمایا اس میں سے کپڑوں اور خوش بو کا بھی انتظام کرلو۔ (ایضاً بہ حوالہ زرقانی، جلد ۲، صفحہ ۳)

حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کا مہر:

جو مسلمان برکت حاصل کرنے کی نیت سے مہر فاطمی مقرر کرتے ہیں تو وہ سمجھ لیں کہ سکہ رائج الوقت کے حساب سے آپ کا مہر ۱۳۷ روپے چاندی کے ہوتے ہیں اور چاندی کا روپیہ (جو ختم ہوگیا ہے) آج ۱۹۹۴ء میں سکہ رائج الوقت کے لحاظ سے مبلغ ۸۵ روپے کا فروخت ہو رہا ہے۔

اس حساب سے مہر فاطمی کا مالیت ۱۱۶۴۵/روپے قرار پاتی ہے (۱)۔

☆ ☆ ☆

حاشیہ:

(۱) یہ حساب حضرت مصنف علام مدظلہم نے ۱۹۹۴ء کا لکھا ہے۔ مہر فاطمی کا آسان حساب یہ ہے "چار سو مثقال نقرہ۔" چار سو مثقال، اٹھارہ سو ماشہ یعنی ایک کلو سات سو پچاس گرام (ایک سو پچاس تولے) چاندی۔ اس کے موجودہ (۱۵ مئی ۲۰۰۴ء) نرخ =/۲۳۲۵۵ روپے ہے۔

(شریفی)

جلد: ۵

۴۸ ویں مجلس:

ہاتھ چومنے کی مصلحت

اس مجلس میں درویشوں کے عمل دست بوسی کرانے پر بڑی عارفانہ مصلحت بیان فرمائی۔

''سخن دراں افتاد کہ خلق دست درویشاں مے بوسند و برکت مے طلبند بر لفظ مبارک راند کہ مشائخ و درویشاں کہ دست بوسیدن مے دہند نیت ایشاں ایں ہم مے باشد کہ مگر دست مغفوری بدست ایشاں رسد۔''

''مجلس میں یہ ذکر نکلا کہ لوگ درویشوں کے ہاتھ چومتے ہیں اور اس سے برکت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ زبان مبارک سے ارشاد ہوا کہ مشائخ اور درویش جو اپنے ہاتھ چومنے کے لیے دیتے ہیں تو اس سے ان کی نیت بھی یہ ہوتی ہے کہ شاید کسی بخشے ہوئے (جنتی) کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں آجائے۔''

کیا انداز ہے شیخ علیہ الرحمہ کی اخلاقی تربیت کا۔ خواجہ حسنؒ نے دست بوسی کا یہ پہلو پیش کیا کہ مصافحہ کرنے والے اور ہاتھ چومنے والے بزرگوں سے برکت حاصل کرنے کے لیے یہ فعل کرتے ہیں — شیخ علیہ الرحمہ بات کا رخ بدل دیتے ہیں اور فرماتے ہیں ہماری نیت تو یہ ہوتی ہے کہ کسی جنتی کا ہاتھ ہمارے ہاتھ میں آجائے اور ہمیں اس کی برکت حاصل ہو۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ۝ (النساء:۴)

ما برائے استقامت آمدیم
نہ پے کشف و کرامت آمدیم

"اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، بہ شرطے کہ وہ مومن ہو، تو ایسے ہی لوگ بہشت کی زندگی میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی۔"

تعلیماتِ شیخ

اسلامی عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق
اور
اوراد و ظائف کا مکمل شرعی دستور العمل

توحید و رسالت اور اعتماد علی اللہ

"فرمود کہ آرے اصل دریں کار اعتقاد است چناں کہ در عالم ظاہر اصل ایمان است، مرید را باید کہ در وحدانیت خدائے عزوجل و رسالت رسول علیہ السلام ایمان درست باشد و مرید را نیز می باید کہ در حق پیر اعتقاد درست باشد، چناں کہ مومن چوں ایمان او درست باشد، بہ گناہ کافر نشود و مرید نیز چوں اعتقاد او درست باشد اگر لغزشے افتد بر ارتداد او حکم نتواں کرد، امید باشد کہ بہ برکت اعتقاد با صلاح باز آید۔" (جلد۲، مجلس ۲۱، صفحہ ۴۰۴)

"شیخ علیہ الرحمہ نے فرمایا تصوف کی دنیا میں مرید کا اپنے شیخ کے ساتھ اعتقاد رکھنا اصل کام ہے۔ جس طرح عالم ظاہر میں خداوند عالم کی توحید اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر صحیح اعتقاد و یقین رکھنا دین کی اصل بنیاد ہے۔ مرید کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے پیر کے حق میں اپنے اعتقاد کو صحیح رکھے، پھر جس طرح ایک مومن کے صحیح ایمان رکھنے کے بعد وہ گناہ کرنے سے کافر نہیں ہوتا اسی طرح اگر مرید کے اعتقاد میں لغزش ہو جائے تو اسے مردود قرار نہیں دیا جاسکتا، امید ہے کہ اعتقاد صحیح کی برکت سے وہ پھر اصلاح کی طرف لوٹ آئے۔"

توحید الٰہی کی روح یہ ہے کہ اس عالم اسباب میں اللہ کے امر کو غالب سمجھے، اسباب ظاہری ہوں یا اسباب روحانی۔ یہ سب اسباب حکم الٰہی کے تابع ہیں۔

شیخ علیہ الرحمہ اپنے مرشد محبوب حضرت بابا فرید علیہ الرحمہ کی داڑھی کا ایک بال شیخ کی اجازت سے تبرک کے طور پر ساتھ لے آئے تھے۔ یہ موئے مبارک آپ کی

داڑھی سے جھڑ کر گر گیا تھا۔ شیخ علیہ الرحمہ نے اسے ایک کپڑے میں لپیٹ کر رکھ لیا اور بیماروں کو تعویذ کے طور پر اسے دیتے رہے۔ ایک روز آنکھوں میں آنسو بھر کر فرمایا:

''دریں حکایت چشم پر آب کردہ بود و می فرمود کہ تا چہ اثر ہا دیدم از آں یک تار موئے مبارک۔''

میں نے اس ایک بال کے کیا کیا اثرات دیکھے؟ کیا بتاؤں؟ میں جس ضرورت مند کو دیتا اس کی برکت سے وہ ضرورت پوری ہو جاتی۔ لیکن ایک دفعہ کیا ہوا میرے ایک دوست تاج الدین بھائی تھے، ان کا بچہ بیمار ہو گیا، میں نے وہ تعویذ تلاش کیا، جس طاق میں رکھتا تھا وہ طاق دیکھا، ادھر ادھر تلاش کیا لیکن وہ تعویذ نہ مل سکا، یہاں تک کہ ان کا بچہ انتقال کر گیا۔ اس کے بعد ایک ضرورت مند آیا، میں نے اس کے لیے وہ موئے مبارک دیکھا تو وہ ایک طاق میں رکھا ہوا مل گیا۔ شیخ فرماتے ہیں:

''چوں پسرک آں دوست رفتنی بود از اں سبب آں تعویذ غائب شدہ بود۔''

''چوں کہ ان کے بچے کا وقت آ گیا تھا اس لیے وہ تعویذ غایب ہو گیا۔''

(جلد۲، مجلس۱۸، صفحہ۳۹۸)

اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ لَوۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ.

(نوح:۴)

''بے شک اللہ کا ٹھیرایا وقت جب آ جاتا ہے تو اسے ٹالا نہیں جاتا۔''

وہ وقت مقررہ آرام کا ہو یا تکلیف کا ہو، عزت کا ہو یا ذلت کا ہو یا موت کا ہو، پھر قوموں کے لیے اور افراد کے لیے ایک ہی قانون ہے۔

بادشاہ کے پاس سفارش کا انداز، توحید کا تقاضا:

حضرات صوفیا ہر قدم پر خداوند عالم کی ذات کو حقیقی عطا کرنے والے اور حقیقی محروم کرنے والے کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔ حضرت بابا صاحبؒ نے ایک ضرورت مند کے لیے غیاث الدین بلبن کے نام جو سفارشی خط لکھا اس کی عبارت یہ ہے۔

''میں اس شخص کا حال پہلے اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھتا ہوں پھر تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں، پس اگر تم اسے کچھ دو گے تو حقیقی دینے والا اللہ ہے اور تمہارا شکریہ ادا کیا جائے گا اور اگر کچھ نہ دو گے تو حقیقی مانع (محروم کرنے والا) بھی اللہ ہے اور اس وقت تم معذور سمجھے جاؤ گے۔'' (۱۶۵)

ایک موقع پر حضرت بابا علیہ الرحمہ علالت کے سبب کم زور ہو گئے تھے اور لکڑی لے کر چل رہے تھے، کچھ دور چل کر آپ نے وہ لکڑی پھینک دی۔ لوگوں نے وجہ پوچھی، فرمایا مجھ سے کہا گیا کہ فرید! میرے غیر کا سہارا لے رہے ہو؟ پس میں نے وہ سہارا پھینک دیا۔

یہ آوازِ غیب ہے جو ایک صاحب دل کو اس کے دل سے سنائی دیتی ہے۔ صوفیا اس ضمیر اور دل کی آواز کو ندائے غیب سے تعبیر کرتے ہیں۔

حضرت بابا صاحبؒ کا ذوق توحید:

حضرت بابا فرید الدین گنج شکر علیہ الرحمہ ذوق توحید کے کمال میں جماعت صوفیا کے اندر ممتاز مقام رکھتے ہیں، حضرت کا زہد اور فقر بھی اسی ذوق کا نتیجہ تھا اور یہ مسئلہ بڑا نازک ہے کہ انسان عالم اسباب میں بندھا ہوا ہو کہ خدا کی غیبی طاقت پر مکمل اعتماد کرے۔

عالم اسباب میں زندہ رہنے کے لیے اسباب سے کام بھی لے، کیوں کہ ترک اسباب سے نفس کا حق ادا نہیں ہو سکتا اور نفس کے ذریعے ہی انسان خدا کا حق (عبادت) ادا کر سکتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لِنَفۡسِکَ عَلَیۡکَ حَقٌّ.

''تجھ پر خدا کے حق کے ساتھ اپنے نفس کا بھی حق ہے۔''

دونوں حقوق ادا کرنے کا نام ہی شریعت ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو نظر بد سے بچنے کے لیے یہ تدبیر

بتائی کہ مصر میں ایک دروازے سے سب گیارہ کے گیارہ بھائی داخل نہ ہونا، بلکہ الگ الگ دروازوں سے متفرق طور پر داخل ہونا۔ لیکن ساتھ ہی اس حقیقت کا بھی اظہار کیا کہ خدا کی مشیت ہر حال میں غالب رہتی ہے۔ تم خدا کی قدرت پر یقین و اعتماد کو کم زور نہ ہونے دینا۔

وَمَا اُغۡنِیۡ عَنۡکُمۡ مِنَ اللّٰہِ مِنۡ شَیۡءٍ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔ (یوسف:۶۷)

"میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے نہیں بچا سکتا، حکم تو اسی کا چلتا ہے۔"

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

"ٹوک کا بچاؤ بتایا، بھروسہ اللہ پر کیا، ٹوک لگنی غلط نہیں اور اس کا بچاؤ کرنا اور ہے، وہ لڑکے جس طرح کہا تھا داخل ہوئے تو اگرچہ ٹوک نہ لگی لیکن تقدیر اور طرف سے آئی، تقدیر دفع نہیں ہوتی، سو جن کو علم ہے ان کو تقدیر کا یقین اور اسباب کا بچاؤ دونوں ہو سکتے ہیں اور بے علم سے ایک ہو تو دوسرا نہ ہو۔" (حمائل:۱۴۰۰)

اہل معرفت کا قول ہے کہ انسان کو جب مخلوق سے زیادہ توقع ہو جاتی ہے اور خدا کی قوت و قدرت کی طرف سے وہ لا پرواہ ہو جاتا ہے تو خدا کی سنت یہ ہے کہ وہ اہل دنیا کے ہاتھوں سے اذیت پہنچاتے ہیں تا کہ بندے کا دل خدا کی طرف لوٹ جائے۔

امیر مینائیؒ کہتے ہیں۔

یہ رونا بے وفائی کا   یہ شکوہ کج ادائی کا
سزا ہے دل لگانے کی   مزا ہے آشنائی کا

عبادات، نماز، روزہ، خیرات:

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی علیہ الرحمہ کے حوالے سے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"شیخ بہارالدین علیہ الرحمہ مے گفت کہ ہر چہ بمن رسید از نماز رسید۔"

"مجھے جو کچھ ملا نماز سے ملا۔"

باباصاحبؒ کا آخری عمل، نماز عشاء تین بار:

حضرت بابا فرید علیہ الرحمہ کے متعلق شیخ علیہ الرحمہ نے فرمایا:

حضرت پر جب آخری بیماری کا غلبہ ہوا تو بے ہوشی طاری ہونے لگی، نماز عشاء کا وقت تھا، آپ نے نماز عشاء جماعت سے ادا کی اور پھر بے ہوش ہو گئے، جب ہوش آیا تو پوچھا، کیا میں نے نماز پڑھ لی، بتایا گیا کہ ہاں! پڑھ لی، فرمایا۔ پھر ایک دفعہ پڑھ لوں، کہ داند چہ شود" کون جانتا ہے کہ کیا ہو؟" یہ واقعہ تین دفعہ ہوا اور آپ نے تین دفعہ عشاء کی نماز پڑھی اور ہر دفعہ یہ فرمایا ایک دفعہ اور پڑھ لوں۔ کون جانتا ہے کہ کیا ہو؟ تیسری دفعہ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد بابا صاحب خدا کو پیارے ہو گئے۔

آپ کا وصال ۵ محرم الحرام کو ہوا۔ (جلد ۴، مجلس ۵۳، صفحہ ۸۶۸)

نفی ماسوا اللہ کی نماز:

یوں تو ہر نماز میں "اللہ اکبر" کی تکبیر سے ماسوا اللہ (غیر خدا) کی نفی مقصود ہے، تکبیر اولیٰ میں نمازی دونوں ہاتھ اٹھا کر ساری کائنات سے بے تعلقی کا اظہار کرتا ہے اور زبان سے اعتراف کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی سب سے بڑی ہے اور سب چھوٹے ہیں۔ لیکن شیخ علیہ الرحمہ نے خواجہ حسن رحمۃ اللہ علیہ کے خادم ملیحؒ کو بیعت کرنے کے بعد دو رکعت نفل نماز کی تلقین فرمائی۔ ملیحؒ نے کہا:

"ایں دوگانہ را نیت چہ باید کرد، گفت، برائے نفی ماسوا اللہ۔"

"ان دو نفلوں کی نیت کیا کی جائے، فرمایا، ساری کائنات کی نفی کرنے کی نیت کی جائے۔" (جلد ۱، مجلس ۲، صفحہ ۱۹۶)

صبح کی نماز کی اہمیت:

شیخ علیہ الرحمہ نے شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے حوالے سے فرمایا کہ

آپ کی خدمت میں ایک لشکری آیا اور اس نے اپنا خواب بیان کیا، آپ نے سن کر فرمایا اس کی تعبیر یہ ہے کہ تو مارا جائے گا۔ وہ لشکری جب چلا گیا تو ایک درویش آپ کی خانقاہ میں حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا کہ حضرت! میں نے ایسا ہی خواب دیکھا ہے، شیخ الاسلامؒ بڑے حیران ہوئے کہ وہ شخص تو ایک سپاہی تھا، اس کا مارا جانا ممکن تھا۔ مگر یہ صوفی تو ایک تن درست آدمی ہے اس کے مارے جانے کے تو کچھ آثار معلوم نہیں ہوتے۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ خبر آئی کہ وہ سپاہی مارا گیا اور یہ پتا چلا کہ اس صوفی کی صبح کی نماز قضا ہوگئی تھی، شیخؒ نے فرمایا، غور کرو ایک صوفی کی نماز صبح کا قضا ہو جانا اس کی موت کے برابر ہے۔ (سیر الاولیا: ۲۷۸)

ہر گنج سعادت کہ خدا داد بہ حافظ
از یمن دعا می شب و ورد سحری بود

شیخ علیہ الرحمہ نے مشائخ صوفیہ کی عبادت گذاری کا تذکرہ کرتے ہوئے شیخ ابو الخیر ابو سعیدؒ کی عبادت گذاری کا حال سنایا اور پھر کہا:

"ہر کہ بود بہ حسن عمل بمقامے رسید، اگرچہ فیض ایزدی نازل است اما جد و جہد خود باید کرد۔"

"ہر شخص حسن عمل سے کسی مقام پر پہنچا ہے، اگرچہ خدا کا فضل و کرم تو نازل ہوتا ہی ہے (اصل اس کی توفیق ہے) مگر بندے کو ہر حال میں کوشش کرنی چاہیے۔" (جلد ا، مجلس ۵، صفحہ ۲۰۴)

شیخ علیہ الرحمہ عموماً ہر مجلس میں فرائض کے علاوہ نفلی نمازوں اور نفلی روزوں کی تعلیم دیتے تھے اور اوراد و وظائف کی تلقین پر خاص توجہ فرماتے تھے۔

ذکر الٰہی، تلاوت قرآن پاک:

شیخ علیہ الرحمہ کے سامنے ان لوگوں کا ذکر آیا جو مسجد میں شب بے داری کرتے ہیں۔ خواجہ حسنؒ نے پوچھا:

"اگر در خانہ خود قیام کنند چگونہ باشد؟ فرمود کہ در خانہ خود یک

سیپارہ بخوانند بہتر کہ در مسجد ختم کنند۔"

"اگر اپنے گھر میں قیام (نوافل) کریں تو کیا ہے؟ فرمایا، گھر میں ایک سیپارہ پڑھنا مسجد میں قرآن ختم کرنے سے بہتر ہے۔"

(جلد اول، مجلس ۲۴، صفحہ ۲۶۳)

شیخ علیہ الرحمہ کی نظر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پاک پر تھی، آپ نے فرمایا:

لَا تَجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ مَقَابِرَ اِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْفِرُ مِنَ الْبَيْتِ الَّذِيْ يُقْرَأُ فِيْهِ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ. (مشکوٰۃ: ۱۸۴ا بہ حوالہ مسلم)

"اپنے گھروں کو قبرستانوں کی طرح ویران نہ رکھو، بے شک شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے، جس میں سورۂ بقرہ کی تلاوت کی جاتی ہے۔"

حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں یہ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْ لَيْسَ فِيْ جَوْفِهٖ شَيْءٌ مِّنَ الْقُرْاٰنِ كَالْبَيْتِ الْخَرِبِ. (مشکوٰۃ: ۱۸۶ا بہ حوالہ بخاری)

"حضور والا نے فرمایا، جس کے دل میں قرآن کریم کا کچھ حصہ بھی نہ ہو اس کا دل اور اس کا باطن ویران گھر کی طرح ہے، یعنی جس گھر میں کوئی آبادی نہ ہو۔"

گھر کی ظاہری آبادی انسانوں سے ہے اور حقیقی آبادی ان انسانوں سے ہے جو اپنے گھروں کو ذکر الٰہی سے آباد رکھتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے سے پہلے اپنے بچھونے پر سو مرتبہ قل ھو اللہ شریف پڑھنے کا اتنا ثواب بیان فرمایا:

اِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ يَقُوْلُ لَهُ الرَّبُّ يَا عَبْدِيْ اُدْخُلْ عَلٰى يَمِيْنِكَ الْجَنَّةَ.

"قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا، اے میرے بندے جنت میں دائیں طرف داخل ہو جا، کیوں کہ دائیں جانب سونا حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کی سنت ہے۔"

حضرت اسید ابن حضیرؓ اپنے گھر میں نوافل کے اندر تلاوت کر رہے تھے کہ آپ
کی تلاوت سننے آسمان سے رحمت کے فرشتے سکینہ ورحمت لے کر نازل ہو گئے۔

ذکر خفی بہتر ہے:

خواجہ حسنؒ نے سوال کیا، مشائخ فرماتے ہیں کہ ذکر جہری بہتر ہے۔ فرمود کہ گفتہ
اند" فرمایا، ہاں کہتے ہیں" خواجہ حسنؒ نے عرض کیا کہ اگر ذکر سری (آہستہ ذکر) کیا
جائے تو کیسا ہے؟ فرمود کہ آہستہ گفتن بہتر" آہستہ (سری) ذکر بہتر ہے" صحابۂ کرامؓ
قرآن کریم کی تلاوت اس طرح کرتے تھے کہ کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا۔ البتہ جب وہ
سجدے کی آیت پر سجدہ کرتے تھے تو لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ یہ قرآن پڑھ رہے ہیں۔
(جلد ۵، مجلس ۷، صفحہ ۹۶۴)

شیخ علیہ الرحمہ کے سامنے حسب ذیل حدیث نبوی ہے:

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک سفر جہاد میں راستہ طے
کرتے ہوئے چند صحابہؓ نے بلند آواز سے خدا کا ذکر کرنا شروع کر دیا۔ آپ نے
ہدایت فرمائی۔

اَرْبَعُوْا عَلٰی اَنْفُسِکُمْ فَاِنَّکُمْ لَا تَدْعُوْنَ اَصَمَّ وَغَائِبًا
اِنَّ الَّذِیْ تَدْعُوْنَ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ.

(تفسیر ابن کثیر، جلد ۲، صفحہ ۲۲۱)

"لوگو! اپنی آوازیں پست کرو کیوں کہ تم جس ہستی کو پکار رہے ہو وہ بہری
اور غائب نہیں ہے بلکہ تم سے قریب ہے اور سننے والی ہے۔"

دعا کرنا بندے کی طرف سے طلب وسوال بھی ہے اور خدا کا ذکر بھی ہے۔ دعا
کے لیے قرآن کریم نے ہدایت کی ہے:

اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ.

(اعراف: ۵۵)

"لوگو! اپنے پروردگار کو پکارو عاجزی کے ساتھ اور آہستہ آہستہ، بے شک
خدا تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

سری اور خفیہ ذکر الٰہی میں دکھاوے اور نمائش پسندی سے بچانا مقصود ہے، نفل
نماز کی عبادت ہو یا صدقہ وخیرات کی عبادت، ان میں بھی سر اور چھپا کر ادائیگی کرنا
افضل قرار دیا گیا ہے۔

شان عطا کو تیری عطا کی خبر نہ ہو — یوں بھیک دے کہ دست گدا کو خبر نہ ہو
چپ ہوں کہ چپ کی داد پہ ایمان ہے میرا — مانگوں دعا جو میرے خدا کو خبر نہ ہو

ذکر جہری کی فضیلت اور اس کی مصلحت:

صوفیا کے بعض خاندانوں (نقش بندی وغیرہ) کے ہاں ذکر جہری کیا جاتا ہے۔
سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ذکر جہری بدعت میں داخل ہے؟ جب احادیث کی کثرت
ذکر سری کے حق میں ہے اور فقہائے امام ابو حنیفہؒ کا مسلک یہی ہے۔

اس مسئلے کی تحقیق مولانا تھانویؒ نے مولانا گنگوہیؒ کے حوالے سے یہ کی ہے کہ
ذکر جہری کو تدبیر کے طور پر کہ اس سے خیالات میں یک سوئی پیدا ہوتی ہے اور قلبی
وسوسے دور ہو جاتے ہیں، عمل میں لانا کوئی حرج نہیں رکھتا۔ البتہ ذکر جہری کو افضل سمجھ
کر اختیار کرنا بدعت قرار پائے گا۔

مولانا تھانویؒ نے امیر شاہ خاں صاحبؒ کے حوالے سے مولانا محمد قاسم صاحب
نانوتویؒ کی یہ تحقیق نقل کی ہے کہ حدیث:

مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا ھٰذَا فَھُوَ رَدٌّ.

"جس شخص نے ہمارے امر (دین) میں کسی نئی چیز کا اضافہ کیا وہ ناقابل
قبول ہے۔"

آپ نے فرمایا:

ایک ہے دین میں احداث (احداث فی الدین) وہ بدعت ہے۔ ایک ہے دین
کے لیے احداث (احداث للدین) یہ بدعت نہیں ہے بلکہ احکام دین کو بروئے کار

لانے کے لیے زمانے کی مناسبت سے جو وسائل اور ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں وہ جائز ہیں۔ جیسے حج بیت اللہ کے سفر کے لیے ہوائی جہاز وغیرہ کا استعمال۔

(مجالس حکیم الامت: ۸۵)

شیخ علیہ الرحمہ کے گھٹنے کا درد اور سحر کا اثر:

امیر خوردؒ نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ سلطان جیؒ کے گھٹنے میں درد ہوا اور وہ سوجھ گیا، ہر طرف سے لوگ عیادت کے لیے آنے لگے، ان میں مولانا وجیہہ الدین یوسفؒ بھی تھے۔ مولانا نے مزاج پرسی کر کے شیخ سے دعائے صحت کی درخواست کی، شیخ نے دعا، فرمائی، پھر مولانا نے شیخ کے گھٹنے پر دم کیا دوسرے دن شیخ نے فرمایا: اتنے لوگ میری عیادت کے لیے آئے اور انہوں نے دعا کی، مگر کسی سے مجھے صحت نہیں ہوئی مگر مولانا کے دم کرنے سے مجھے آج سکون محسوس ہو رہا ہے اور میرا جسم ہلکا ہو گیا ہے۔ تیسرے دن شیخ نے غسل صحت فرمایا اور لوگوں نے نذریں پیش کیں اور مولانا کی خدمت میں بھی نذر پیش کی گئی۔

مولانا وجیہہ الدین یوسفؒ سلطان جیؒ کے ابتدائی مریدوں میں سے تھے اور صاحب کرامت بزرگ تھے۔ (سیر الاولیا: ۴۴۸)

شیخ علیہ الرحمہ نے اپنے شیخ حضرت بابا صاحبؒ کے موئے مبارک کا تعویذ بنا رکھا تھا اور اسے بیماروں کے لیے دیتے تھے اور بیمار اس کی برکت سے صحت مند ہو جاتے تھے۔ مگر اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ بابا صاحبؒ کے موئے مبارک کی برکت شیخ کے گھٹنے کی تکلیف میں کام نہیں آئی اور ایک مرید کے دم کرنے سے گھٹنے کی تکلیف ختم ہوئی۔

شیخ علیہ الرحمہ نے وہ واقعہ سنا کر یہ تعلیم دی کہ تکلیف و راحت حقیقت میں خدا کے حکم سے متعلق ہے۔ دوا ہو یا تعویذ اور دم درود صرف وسائل و اسباب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس واقعے سے شیخ کی اخلاقی عظمت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ آپ نے اپنے ایک

مرید کے دم کرنے کی برکت بیان کرنے میں اپنی سُبکی محسوس نہیں کی۔

شیخ علیہ الرحمہ پر کسی حاسد دشمن نے سحر کر دیا تھا اور آپ دو مہینے اس تکلیف میں مبتلا رہے۔ پھر کسی سحر جاننے والے کو بلایا گیا، اس نے خانقاہ کے آس پاس کی مٹی کئی جگہ سے اٹھا کر سونگھی اور ایک جگہ بتائی جہاں وہ چیزیں دفن کی گئی تھیں جن کے ذریعے جادو کیا گیا تھا۔ چناں چہ ایسا ہی نکلا اور شیخ صحت مند ہو گئے اور جن حاسدوں نے ایسا کیا تھا انھیں معاف کر دیا۔ (فوائد جلد ۴، مجلس ۳۸، صفحہ ۷۸۰)

تبرک کا اثر بھی مشیت الٰہی کے تحت:

بزرگوں کے آثار سے برکت حاصل ہوتی ہے، اس میں دو رائیں نہیں۔ لیکن مشیت الٰہی اصل ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنے والد شاہ عبدالرحیمؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ میرے والد کے پیر میر ابوالعلاء اکبرآبادیؒ تھے۔ ان کے صاحب زادے میر نورالعلاءؒ تھے، ایک روز شاہ عبدالرحیم صاحبؒ نے میر نورالعلاء صاحب سے پوچھا آپ کے والد صاحب کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ جس کو اپنے منہ کا چبایا ہوا پان دے دیتے تھے اس پر بے خودی طاری ہو جاتی تھی؟ میر نورالعلاءؒ نے فرمایا میں نے تو ان کے منہ کا پان کئی دفعہ کھایا، مجھ پر تو بے خودی طاری نہیں ہوئی۔

یہ برکت کی بات کوئی کلیہ نہیں ہے، شاہ عبدالرحیمؒ فرماتے ہیں کہ میں نے میر نورالعلاءؒ سے زیادہ کسی کو حق گو نہیں پایا۔ (انفاس العارفین: ۷۳)

حقوق العباد کی اہمیت:

شیخ علیہ الرحمہ نے امام اعظم ابو حنیفہؒ کی عظمت پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کے ہر رمضان میں ۶۱ بار قرآن کریم ختم کرنے اور چالیس سال عشا کے وضو سے صبح کی نماز ادا کرنے کا ذکر کیا۔ پھر حضرت امامؒ اور شبلیؒ اور جنیدؒ کی شہرت اور مقبولیت کے حقیقی سبب کے بارے میں ایک بنیادی بات فرمائی:

"چندیں علما و دانش وراں بودہ اند، ہیچ کس داند کجا شدند و کہ
بودند؟ ایں صیت کہ باقی ماند سبب حسن معاملہ است۔ شبلیؒ و جنیدؒ
تا کے بودہ اند مردم ہم چنیں دانند کہ وے پر یرورز بودہ اند، ایں
ہمہ حسن معاملہ است، واللہ اعلم بالصواب۔"

"بہت سے علما و دانش مند گزرے، کون جانتا ہے کہ کہاں گئے اور کیا تھے،
اسی طرح شبلیؒ اور جنیدؒ کو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جیسے وہ کل اور پرسوں ہی کے
لوگ ہیں۔ ان حضرات کی یہ شہرت ان کے حسن معاملہ ہی کی وجہ سے ہے
اور یہ حیات معنوی ہے اسے آسانی سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔"

(جلد ۴، مجلس ۳۳، صفحہ ۲۳۸)

شیخ علیہ الرحمہ نے "حسن معاملہ" کس صفت کو فرمایا؟

چوں کہ عام طور پر تقوی، طہارت اور عبادت کے الفاظ حقوق اللہ کی ادائیگی سے متعلق سمجھے جاتے ہیں اور ان الفاظ کے مفہوم میں حقوق العباد کی ذمہ داری کو شامل نہیں سمجھا جاتا اس لیے شیخؒ نے حسن معاملہ کی تعبیر اختیار کی جس کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ کی عبادت کے ساتھ اس کے بندوں کے حقوق کا خیال رکھنا اور اس کے بندوں سے اچھا معاملہ کرنا۔ یہ خوبی ایسی ہے جس کی وجہ سے علما اور مشائخ کو قبول عام حاصل ہوتا ہے اور شیخؒ نے ان مقبولان حق کی صف میں علمائے شریعت اور مشائخ طریقت دونوں کو شامل رکھا۔

اہل شریعت کے سرخیل امام ابو حنیفہؒ ہیں اور اہل محبت و تصوف کے ائمہ شبلیؒ اور جنیدؒ ہیں۔

نماز میں حضورِ قلب کی اہمیت:

شیخ علیہ الرحمہ نے نماز جیسی اہم عبادت میں حضورِ قلب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"اول حضور قلب آنست کہ مصلی آں چہ خواند معانی آں بر دل

بگذارند۔"

"حضورِ قلب کی ابتدائی شکل یہ ہے کہ نمازی جو پڑھے (قرآن کریم، دعائیں اور اذکار) اس کے معانی کا اس کے دل پر اثر ہو۔"

ظاہر ہے یہ اسی وقت ہوگا جب نمازی عربی زبان سے واقف ہوگا یا وہ اپنی زبان کے ترجمے سے ان کا مطلب سمجھے گا اور اس کا اثر قبول کرے گا۔

قرآن کریم نے خاص طور پر دوسری عبادات کے مقابلے میں نماز کے اندر حضور قلب، توجہ اور ارادے کی یک سوئی اور روحانی بے داری کی اہمیت بیان کی ہے۔

وَاِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ. (البقرۃ:۴۵)

"نماز بڑی گراں گزرتی ہے مگر ان پر ہلکی ہوتی ہے جو عاجزی اور پگھلے ہوئے دلوں کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔"

آگے کہا:

اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُلَاقُوْ رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

"یہ وہ لوگ ہیں جن کو اپنے رب سے ملنے اور اس کی حضوری میں پیش ہونے کا خیال لگا رہتا ہے اور یہ یقین رہتا ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں۔"

حضورِ قلب تصوف واحسان کی روح ہے:

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان (اخلاص) کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ.

"تو خدا کی عبادت اس طرح کر کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔"

یہ حضور قلب اور روحانی قوت کا نقطہ عروج ہے کہ موجودہ مادی زندگی میں انسان اپنی روحانی آنکھوں (بصیرۃ) سے خدا کا دیدار کرے۔

دل، ارادہ اور خیال کو حاضر رکھ کر خد کی عبادت کرنا احسان و اخلاص ہے اور دل کو حاضر رکھنا اور یہ سمجھتے ہوئے خدا کے حکم کی تعمیل کرنا کہ خدا تعالیٰ میرے سامنے ہے بڑا مشکل کام ہے۔ ایک دل ہے اور ہزاروں جھگڑے اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ایک انار اور صد بیمار والا معاملہ ہے۔ کس کس جھگڑے سے دامن دل کو بچا کر اسے خدا کی طرف متوجہ کیا جائے؟ لیکن بہر حال خدا کی عبادت میں قبولیت کا حسن اسی کیفیت سے پیدا ہوتا ہے، مثلاً صدقہ و خیرات کے بارے میں حدیث قدسی کی یہ تعبیر و تشبیہ کتنی مؤثر ہے کہ خدا تعالیٰ قیامت کے دن امیروں سے پوچھے گا کہ میں تمہارے پاس آیا اس حال میں کہ بھوکا تھا مگر تم نے مجھے کھانا نہ دیا وغیرہ وغیرہ۔ بندہ کہے گا خداوند! تو تو اس سے پاک ہے کہ تجھے بھوک پیاس لگے، خدا تعالیٰ فرمائے گا کہ جب تیرے دروازے پر ایک بھوکا فقیر آیا اور تو نے اس دھتکار دیا، اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو آج میں اس کا اجر تجھے عطا کرتا۔

غالب نے اس تصور کی ترجمانی کی ہے:

بدل کر غریبوں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

حج بیت اللہ کی عبادت میں دل کے حاضر ہونے اور معبود برحق کے بندے کے سامنے ہونے کا تصور کتنا غالب ہے؟

لبیک لبیک پکارنا یعنی میں حاضر ہوں میں حاضر ہوں۔ کعبۃ اللہ کے لیے خدا کے گھر کی تعبیر جو لامکان ہے اس کی طرف مکان کی نسبت اسی غرض کے لیے ہے۔

انسان کے اندر دو ہی قوتیں ہیں۔ ایک روحانی قوت اور دوسری جسمانی اور مادی قوت، روحانی قوت کی مختلف کیفیات کو عاجزی، خشوع و خضوع اور انابت الی اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور مادی خواہشات غلبے کو غفلت، قساوت اور رَین (زنگ) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شیخ نے حضور قلب اور نماز میں استغراق و محویت پر دو حکایتیں بیان فرمائیں۔

ایک حکایت حسن افغانؒ کی جو شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے بڑے مایہ ناز مرید

تھے۔ شیخ فرماتے تھے کہ جب خدا مجھ سے پوچھے گا کہ بہاء الدینؒ کیا لائے ہو؟ تو میں حسن افغانؒ کو پیش کروں گا۔

حسنؒ بالکل ان پڑھ تھے۔ یہ ایک روز کسی مسجد میں نماز ادا کرنے چلے گئے جب نماز سے فارغ ہوئے اور تمام نمازی چلے گئے تو انہوں نے امام صاحب سے کہا:

حضرت! پہلے تو آپ ملتان سے دلی گئے، وہاں آپ نے کچھ غلام خریدے، پھر آپ ملتان واپس آگئے اور یہاں سے خراسان گئے اور پھر غلاموں کو فروخت کر کے ملتان واپس آگئے آخر یہ کیسی نماز ہے؟ میں تمہارے پیچھے پھرتا رہا۔ یعنی امام صاحب نماز کے اندر جن خیالات میں رہے وہ خیالات حسن افغانؒ پر منکشف ہو گئے۔

حسن افغانؒ کی قوت کشف کا یہ حال تھا کہ وہ ایک مسجد کی طرف سے گزرے جو تعمیر کی جا رہی تھی اور قبلے کی سمت متعین کی جا رہی تھی، ایک مولانا صاحب نے کہا کہ قبلے کی صحیح سمت یہ ہے، حسن افغانؒ نے کہا نہیں صحیح سمت یہ ہے۔ مولانا صاحب اپنی بات پر جھگڑنے لگے، شیخ حسنؒ نے کہا دیکھو، غور سے دیکھو، قبلہ یہ ہے۔ ان دیکھنے والوں کو اس طرف بیت اللہ شریف نظر آیا۔

حسن افغانؒ کے سامنے لوگ مختلف فارسی عربی تحریروں میں کسی جگہ قرآن کریم کی آیت بھی لکھ دیتے تھے اور پوچھتے تھے۔ بتاؤ! اس میں قرآن کی آیت کون سی ہے؟ حسنؒ بتا دیا کرتے تھے کہ آیت قرآن یہ ہے، لوگ پوچھتے کہ تم کس طرح پہچانتے ہو؟ یہ کہتے کہ قرآن کی آیت میں مجھے نور نظر آتا ہے۔

دوسری حکایت خواجہ کریمؒ کی بیان کی۔

خواجہ کریمؒ دلی دربار میں میر منشی تھے، پھر انہوں نے نوکری چھوڑ دی اور یاد الٰہی میں مشغول رہنے لگے۔

خواجہ کریمؒ ایک روز دلی کے کمال دروازہ (اس وقت اس نام کا کوئی دروازہ ہوگا) پر تھے، یہ التمش کے دور کی دلی کا واقعہ ہے جب دلی مہرولی کی طرف آباد تھی۔ خواجہ کریمؒ اس دروازے کے باہر مغرب کی نماز ادا کر رہے تھے، اس وقت دلی پر میواتیوں کے حملے کا خطرہ لگا رہتا تھا اور شام ہوتے ہی دلی کے دروازے بند کر دیے جاتے تھے۔

خواجہ کریمؒ کے دوستوں نے انھیں آواز دینی شروع کی کہ جلد اندر آجاؤ، حملے کا خطرہ ہے، لیکن خواجہ کریمؒ نے ایک نہ سنی اور اپنی نماز پوری کر کے اندر داخل ہو گئے۔

دوستوں نے کہا تم کو آواز دی گئی مگر تم نے شور وغل کی آواز تک نہیں سنی؟ یہ بولے:

"عجب از کسے است کہ او در نماز باشد و غلبہ کسے بشنود۔"

"اس شخص پر تعجب ہے کہ جو نماز کی حالت میں کسی کا شور وغل سنے۔"

پھر شیخ سلطان جیؒ نے فرمایا:

"خواجہ کریم کی ایک نرالی ادا یہ تھی کہ وہ رُپے پیسے کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔" (جلد اول، مجلس ۸، صفحہ ۲۱۲)

شیخ علیہ الرحمہ نے آخر میں ایک شعر پڑھا اور بتایا کہ خواہشات نفسانی سے دور ہونے اور قلب کو خدا کی طرف متوجہ کرنے کا لمحہ بھی اگر کسی کو میسر آجائے تو وہ بھی بڑے بات ہے۔

یک لحظہ زشہوتے کہ داری بر خیز

تابنشیند ہزار شاہد پشیست!

"ایک لمحہ اگر تو خواہش سے علاحدہ ہو جائے تو تیرے سامنے ہزار معشوق آجائیں۔"

حضرت مخدوم نصیرالدین چراغ دہلویؒ کا آسان نسخہ:

حضرت چراغ دہلویؒ نے نماز میں حضور قلب کے مسئلے کا ایک نہایت مناسب حل نکالا ہے۔ آپ سے کسی نے سوال کیا کہ نماز میں حضور قلب کیسے قایم رہ سکتا ہے جب کہ ہر شخص زندگی کے ہزاروں جھمیلوں میں الجھا رہتا ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ نے اس کا ایک نہایت آسان نسخہ تجویز فرمایا اور کہا نماز کی ابتدا اور نماز کی انتہا میں اگر دل حاضر ہو (خواہ درمیان میں غفلت طاری ہو جائے) تو خدا تعالیٰ کی طرف سے پوری نماز حضور قلب میں شمار ہوگی اور اس کا اجر بھی پورا ملے گا۔

ضرورت سے زیادہ دنیا ہے

شیخ علیہ الرحمہ اس دنیا کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں جسے حدیث نبوی میں ملعون ومردود کہا گیا ہے۔

اَلَا اِنَّ الدُّنْیَا مَلْعُوْنَۃٌ وَمَلْعُوْنٌ مَافِیْھَا اِلَّا ذِکْرُ اللّٰہِ وَمَا وَالَاہُ وَعَالِمٌ اَوْ مُتَعَلِّمٌ۔

"خبردار ہو! دنیا ملعون ہے اور جو کچھ اس دنیا میں ہے وہ بھی ملعون ہے سوائے ذکر الٰہی کے اور اس چیز کے جسے خدا تعالیٰ پسند کرتا ہے اور عالم کے یا متعلم کے۔" (مشکوٰۃ: ۴۴۱، بہ حوالہ ابن ماجہ)

شیخ فرماتے ہیں چار صورتیں ہیں:

۱۔ ظاہر اور باطن دونوں پہلوؤں سے دنیا ہے اور وہ یہ ہے۔

"ہر چہ زائد از کفاف است دنیا است۔"

"ہر وہ چیز جو ضرورت سے زائد ہو وہ دنیا ہے یعنی خالص دنیا ہے۔"

۲۔ ظاہر اور باطن دونوں پہلوؤں سے دنیا نہیں ہے یعنی خالص دین ہے اور وہ یہ ہے:

"آں طاعت با اخلاص است۔"

"وہ اطاعت جو اخلاص کے ساتھ ہو۔"

۳۔ ظاہر میں دنیا ہے مگر باطن اور حقیقت میں دنیا نہیں ہے۔ وہ یہ ہے:

"آں اورے حق حرم خود است یعنی با اہل بیت خود فراہم آید بہ نیت آں کہ حق او بگزارد۔"

"یعنی اپنی زوجہ کا حق زوجیت (حق جنسیت) ادا کرنا اس نیت سے کہ

اس کا حق ادا ہو یعنی صرف نفس کی تسکین مقصد نہ ہو۔"

۴۔ ظاہر میں دنیا نہیں دین نظر آتی ہے مگر حقیقت میں دنیا ہے۔

"آں طاعتے است کہ بہ ریا کنند برائے جذبِ منفعت۔"

"یعنی ریاکاری اور دکھاوے کی عبادت جو کسی دنیوی منفعت کے لیے کی جائے۔"

کس قدر حکیمانہ تجزیہ ہے اس دنیا کا......

مولانا رومیؒ نے دنیا کی تعریف میں کہا ہے۔

"چیست دنیا؟ از خدا غافل بودن نے قماش و نقرہ و فرزند وزن۔"

"خدا سے غافل کرنے والی چیز کا نام دنیا ہے۔ بیوی، بچوں اور سونے چاندی کا نام دنیا نہیں ہے۔"

لیکن شیخ علیہ الرحمہ نے تصوف وطریقت کی اصل ترجمانی کی ہے اور احادیث نبوی میں زائد از ضرورت کی جو مذمت بیان کی گئی ہے اس کے مطابق دنیا اور دین کا تجزیہ فرماتے ہیں۔

حدیث ابوذر غفاریؓ:

صحابۂ کرامؓ میں حضرت ابوذر غفاریؓ پر زہد اور دنیا سے بے رغبتی کا اس قدر غلبہ تھا کہ آپ ضرورت سے زیادہ رُپیہ پیسہ جمع کرنے والے کو عذاب الیم کی سزا کا مستحق قرار دیتے تھے۔ اور سورۃ توبہ آیت (۳۴) وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ۔ الخ کا یہی مطلب بیان کرتے تھے اور حضرت ابوذرؓ کو اپنی رائے پر اس قدر اصرار اور تشدد تھا کہ آپ صحابۂ کرامؓ سے لڑا کرتے تھے کہ تم لوگ دولت جمع کرتے ہو۔ حالاں کہ قرآن یہ کہہ رہا ہے۔ چناں چہ صحابۂ کرامؓ کی شکایت پر حضرت عثمان غنیؓ نے آپ کو مدینہ منورہ کی بیرونی بستی ربذہ میں رہنے کا حکم دے دیا تھا۔

عام صحابۂ کرامؓ زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد مال جمع کرنے کی اجازت کے قائل تھے

اور اسلام کا قانون یہی ہے لیکن ابوذر غفاریؓ اسلام کی اخلاقی ہدایت کو قانون کی طرح سمجھتے تھے اور اس میں تشدد اختیار کرتے تھے اور فرماتے تھے مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا:

مَا يَسُرُّنِيْ اَنَّ عِنْدِيْ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا يَمُرُّ عَلٰى ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ وَعِنْدِيْ مِنْهُ شَيْئًا اِلَّا دِيْنَارًا اَرْصِدُهٗ لِدَيْنٍ.

(ابن کثیر جلد اول، صفحہ ۳۵۲ بہ حوالہ بخاری)

"مجھے یہ بات پسند نہیں کہ میرے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو اور اس پر تین دن گزر جائیں۔ ہاں! صرف ایک دینار بچ رہے جو مجھے قرض میں ادا کرنا ہو۔"

محدث ابن کثیر کہتے ہیں کہ ابوذر غفاریؓ نے حضور علیہ السلام کی اسی حدیث کو اپنا مسلک قرار دے لیا تھا اور اسی کے مطابق وہ آیت مذکور کی تشریح کرتے تھے۔

دوسری حدیث حضرت ابوہریرہؓ کی یہ ہے، آپ نے دعا فرمائی:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ اٰلِ مُحَمَّدٍ قُوْتًا .... كَفَافًا.

(مشکوٰۃ: ۴۴۰ متفق علیہ)

"خداوندا! آلِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بہ قدر ضرورت روزی عطا فرما۔"

حدیث میں فرمایا:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ اَسْلَمَ وَرُزِقَ كَفَافًا وَقَنَّعَهُ اللّٰهُ بِمَا اٰتَاهُ.

(مسلم: ۴۴۰)

"وہ شخص کامیاب ہوا جس نے اسلام قبول کیا اور وہ بہ قدر ضرورت روزی سے نوازا گیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اس مال و روزی پر قناعت عطا فرمائی۔"

ایک حدیث میں فرمایا:

اَغْبَطُ اَوْلِيَآئِيْ عِنْدِيْ لَمُؤْمِنٌ خَفِيْفُ الْحَاذِ......
وَكَانَ رِزْقُهٗ كَفَافًا فَصَبَرَ عَلٰى ذٰلِكَ ثُمَّ نَقَدَ بِيَدِهٖ

فَقَالَ عُجِّلَتْ مَنِيَّتُهٗ، قُلْتُ بَوَاكِيهِ قَلَّ تُرَاثُهٗ.

(مشکوٰۃ:۴۴۲ ترمذی)

''میرے نزدیک میرے وہ دوست قابل رشک ہیں جو ہلکی پھلکی زندگی رکھتے ہیں اوران کا رزق بہ قدر ضرورت ہے پھر وہ اس پر صبر کرتے ہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چٹکی بجائی اور کہا موت جلدی آرہی ہے، اس کی موت پر رونے والے کم ہیں، اس کی میراث بھی کم ہے۔''

صوفیائے کبار ان ہدایات کے علاوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی اور حضرات شیخین ابو بکرؓ و عمرؓ اور حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کے ذاتی سادہ کردار اور شاہی میں فقیری اور درویشی کے انداز کو اپنے لیے نمونہ قرار دیتے تھے اور اسی اخلاقی کردار کی تلقین کرتے تھے۔

ازدواجی ضرورت دین ہے:

شیخ علیہ الرحمہ نے ازدواجی تعلق کو حقیقت کے لحاظ سے دین قرار دیا جب کہ اس میں نیت بھی درست ہو۔

حدیث پاک میں آتا ہے:

اِذَا تَزَوَّجَ الْعَبْدُ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ نِصْفَ الدِّيْنِ فَلْيَتَّقِ اللّٰهَ فِي النِّصْفِ الْبَاقِيْ. (مشکوٰۃ:۲۶۸)

''جب انسان نکاح کرتا ہے تو اس کا آدھا دین مکمل ہو جاتا ہے، اب چاہیے کہ باقی آدھے دین کی حفاظت کے لیے خدا سے ڈرتا رہے۔''

خالص دین مخلصانہ عبادت ہے:

حدیث میں آتا ہے:

مَنْ كَانَتْ نِيَّتُهٗ طَلَبُ الْاٰخِرَةِ جَعَلَ اللّٰهُ غِنَاهُ فِيْ قَلْبِهٖ وَجَمَعَ لَهٗ شَمْلَهٗ وَاَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ.

(مشکوٰۃ:۴۵۴ ترمذی)

''جس شخص کی نیت عبادت الٰہی میں آخرت کی فلاح و بہبود ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کے دل میں استغناء پیدا کر دیتا ہے اور اس کی متفرق ضرورتوں کو سمیٹ دیتا ہے اور دنیا اس کے پاس ذلیل و حقیر ہو کر آتی ہے۔''

عیسائی رہبانیت:

ترک دنیا کا ایک مفہوم وہ ہے جسے قرآن کریم نے مسیحی راہبوں کے حوالے سے رہبانیت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ (الحدید:۲۸)

مسیحی راہب دنیا کی زندگی سے بالکل کنارہ کر کے ویرانوں میں خانقاہیں بنا کر رہتے تھے۔ یہ ترک دنیا اسلامی سلوک میں جائز نہیں، بلکہ دنیا کے ہنگاموں میں رہ کر روحانیت کی تلاش اور حقیقت ازل کا قرب حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا ہی شریعت اور طریقت کا حاصل ہے۔ حدیث میں:

اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ.

''دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔''

کا استعارہ اس تصور کی بہترین تشریح کرتا ہے، حافظ کہتا ہے

قصر فردوس بپاداش عمل می بخشند ... ما کہ رندیم و گدا دیر مغاں مارا بس

نقد بازار جہاں بنگر و آثار جہاں ... گرشما رانہ بس ایں سود و زیاں مارا بس

اقبالؒ نے تخلیق آدم کے حوالے سے دنیا کی اہمیت اس طرح بیان کی:

جہاں او آفرید، ایں خوب تر ساخت ... مگر با ایزد انباز است آدم

بہار برگ پراگندہ را بہم بربست ... نگاہ ماست کہ برلالہ رنگ و آب افزود

کھانے میں نمک سے ابتدا:

شیخ علیہ الرحمہ کے سامنے کھانا لایا گیا، کھانے کے ساتھ جب نمک رکھا گیا تو فرمایا:

''بدایت بہ ملح می باید کرد۔''

"کھانے کی ابتدا نمک سے کرنی چاہیے۔"

پھر اس کی ترکیب استعمال بیان کی کہ انگلی کو لعاب سے تر کر کے نمک نہ کھایا جائے بلکہ چٹکی سے نمک اٹھانا چاہیے۔

خواجہ حسنؒ نے اس مفید نصیحت کے شکریے میں کہا الحمدللہ! حق نمکے تجدید شد! "خدا کا شکر ہے حق نمک تازہ ہوگیا" شیخ نے فرمایا، خوب کہا،

مولانا کاشانیؒ تشریف فرما تھے وہ بولے، حسنؒ نے بری ملیح (نمکین) بات کہی، شیخ نے تبسم فرمایا اور کہا، او ملوح است دریں کار "حسنؒ کی باتوں میں بڑی ملاحت ہوتی ہے۔"

اس پر لطف گفتگو کا شیخ علیہ الرحمہ کی جس ہدایت سے آغاز ہوا وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حسب ذیل ارشاد گرامی ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

سَیِّدُ اُدَامِکُمُ الْمِلْحُ. (مشکوٰۃ:۳۶۸ ابن ماجہ)

"سالن کا سردار نمک ہے۔"

علامہ علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ نمک ہی سے روٹی اور سالن میں ذائقہ پیدا ہوتا ہے، حدیث پاک کا یہی مطلب ہے۔

ہمارے استاذ حدیث حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہٗ صبح کا ناشتہ بھی نمکین چیز سے شروع کرتے تھے اور فرماتے تھے نمکین چیز سے کھانے کی ابتدا جگر کو فائدہ پہنچاتی ہے۔

مولانا مدنیؒ کا معمول یہ تھا کہ نمک اور پودینہ دونوں چورن کی شکل میں خشک پسے ہوئے آپ کے سامنے ہوتے تھے اور آپ ناشتہ میں پہلے باسی روٹی کے ٹکڑے سے یہ نمکین سفوف تناول فرماتے تھے، اس کے بعد چائے وغیرہ نوش کرتے تھے۔

حضور علیہ السلام کی پسندیدہ چیز مٹھاس تھی:

اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مرغوب چیز مٹھاس کے بارے میں حدیث پر غور

کرو۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں۔

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّ الْحَلْوَآءَ وَالْعَسَلَ. (مشکوٰۃ:۳۶۴ بخاری)

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مٹھاس اور شہد مرغوب تھا۔"

حضرت انسؓ کا بیان ہے۔

"میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دو پیالے شربت کے پلائے جس میں شہد، انگوروں کا شیرہ، دودھ اور پانی شامل تھا۔" (مشکوٰۃ:۳۷۲ مسلم)

حضرت عائشہؓ بھی فرماتی ہیں کہ حضور علیہ السلام کو شربتوں میں میٹھا اور ٹھنڈا شربت بہت مرغوب تھا۔ (ترمذی:۳۷۱)

احناف کے اصول کے مطابق قول رسول کو فعل رسول پر ترجیح حاصل ہوتی ہے، جب دونوں میں بہ ظاہر اختلاف معلوم ہوتا ہے اس لیے اس اصول پر صوفیا اور علما نمک سے ابتدا پسند کرتے تھے کیوں کہ قول کی حیثیت ایک عام ہدایت کی ہے اور افعال میں مختلف مصلحتوں کا امکان ہوتا ہے۔

ماں کی خوش نودی اور ماں کا توسل:

شیخ علیہ الرحمہ نے اپنے ہم عصر بزرگ مولانا نظام الدین ابوالمویدؒ کے حوالے سے یہ بتایا کہ جس طرح امت کے لیے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش نودی اور اس خوش نودی و رضا سے وصال کے بعد توسل بڑا سہارا ہے، اور اولیا و صوفیا کی خوش نودی ان کے مریدین کے کام آتی ہے اسی طرح ماں باپ کی خوش نودی ان کی وفات کے بعد اولاد کے کام آتی ہے اور جب اولاد ماں باپ کے وسیلے سے دعا کرتی ہے تو خدا تعالیٰ اسے قبول فرلیتا ہے۔

لیکن یہ جب ہی ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو معلوم ہو کہ اس اولاد سے اس کے ماں باپ رضا مند رہے ہیں اور ان کی روحیں اپنی لائق اولاد کے لیے اس عالم میں بھی دعا کررہی ہیں۔

مولانا نظام الدین شیخؒ کے زمانہ میں دلی کے اندر وعظ فرمایا کرتے تھے اور شیخؒ ان کے وعظ میں شرکت کرتے تھے۔

شیخؒ نے فرمایا: ایک دفعہ دلی میں قحط کے آثار شروع ہوئے اور دلی کے مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ وہ شیخ نظام الدینؒ سے دعا کی درخواست کریں۔ شیخ نظام الدینؒ سے دعا کی درخواست کی گئی، شیخؒ منبر وعظ پر تشریف لیے گئے اور وعظ شروع کر دیا اور وعظ بیان کرتے کرتے اپنی آستین میں ہاتھ ڈالا اور کپڑے کا ایک ٹکڑا اپنی آستین میں سے نکالا اور خاموشی سے کچھ کہا بس آسمان سے ہلکی بارش شروع ہوگئی، شیخؒ وعظ فرمانے میں مشغول ہوگئے بارش کی بوندیں رک گئیں، شیخؒ نے پھر وہی کپڑا اپنی آستین میں سے نکالا اور اسی طرح آسمان کی طرف منہ کر کے کچھ کہا، بارش پھر برسنے لگی اور خوب تیز برسی۔ شیخؒ گھر آگئے۔ لوگوں نے پوچھا وہ کپڑا کیا تھا جو آپ نے اپنی آستین میں سے نکالا تھا؟ فرمایا:

''دامن والدہ من بود۔''

''وہ کپڑا میری ماں کا دامن تھا۔'' (جلد۴، مجلس ۳۱، صفحہ ۱۰۶)

مولانا نظام الدین ابوالمویدؒ نے اپنی ماں کا دامن خدا کے سامنے پیش کر کے ان کی عظمت کے وسیلے سے بارش کی دعا کی اور خدا تعالیٰ نے اسے قبول فرمایا۔ شیخ محبوب الٰہیؒ نے ایک موقعے پر فرمایا:

''درویشاں کہ دعاے کنند بحرمت نیک زناں و نیک مرداں، اول نیک زناں را یاد کنند باعتبار آں کہ نیک زناں غریب باشند۔'' (جلد۱، مجلس ۲۰، صفحہ ۲۵۶)

''اہل اللہ نیک عورتوں اور نیک مردوں کی حرمت کے وسیلے سے دعا کرتے ہیں اور اس میں نیک عورتوں کا ذکر مردوں سے پہلے کرتے ہیں کیوں کہ نیک مردوں کے مقابلے میں نیک عورتیں گم نام اور پوشیدہ ہونے کی وجہ سے خدا کے ہاں زیادہ مقبول ہوتی ہیں۔''

علمائے اہل سنت کے نزدیک خدا کے مقبول بندوں کے وسیلے سے دعا کرنا جائز

ہے۔

مولانا محمد اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان میں لکھا ہے:

کچھ لوگ یوں پڑھتے ہیں — یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ! ''اے شیخ عبدالقادر کچھ دو تم اللہ کے واسطے'' یہ لفظ نہ کہنا چاہیے۔ ہاں! اگر یوں کہے کہ ''یا اللہ! کچھ دے شیخ عبد القادرؒ کے واسطے'' تو بجا ہے۔ غرض یہ کہ ایسا لفظ منہ سے نہ نکالے جس سے بوئے شرک یا بے ادبی کی آئے کہ اس کی بڑی شان ہے اور وہ بڑا بے پرواہ بادشاہ ہے۔

(ص ۶۳)

مولانا شہیدؒ کا حوالہ اس لیے دیا گیا کہ توسل سے اتفاق نہ کرنے والے حضرات کے نزدیک بھی حضرت شاہ شہیدؒ کا قول معتبر و مستند ہے۔ مگر پھر بھی یہ حضرات اس سے انکار کرتے ہیں۔

ترک دنیا حضرت سلطان جیؒ کے ہاں:

ترک دنیا کا صحیح نقشہ حضرت المشائخؒ کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ حضرت چراغ دہلویؒ فرماتے تھے کہ سلطان جیؒ کی خانقاہ میں لوگوں کے لیے کھانے پینے کا وسیع انتظام (لنگر) اور ضرورت مندوں کے لیے داد و دہش کی فراوانی کا یہ حال تھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دولت کا دریا بہہ رہا ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ کی خدمت میں نذرانوں کی شکل میں اور شکرانے کی صورت میں آنے والی دولت کا یہ حال تھا کہ آپ نے ایک دفعہ اپنے شیخ بابا صاحبؒ کے ہاں سالانہ تقریب میں ایک دن میں کئی لاکھ روپے جمع کیے۔

شکرانہ اس رقم کو کہا جاتا تھا جو شیخ اور آپ کے خلفا تعویذ لینے والوں سے طلب کرتے تھے اور وہ سب محتاجوں کے لیے ہوتا تھا۔

یہ احتیاط تھی کیوں کہ شریعت میں تعویذ کی اجرت لینے میں اختلاف ہے۔ ایک طرف دولت کا یہ حال، دوسری طرف اپنی ذاتی اور اپنے مریدوں کی ذاتی زندگی میں نہایت سادگی اور فقیرانہ زندگی کا سخت اہتمام۔

روپے پیسے کی تقسیم کا ایک یہ طریقہ مقرر تھا کہ ہر جمعرات کو عشا کی نماز کے بعد خانقاہ میں رکھا ہوا تمام مال و اسباب لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا اور اسے تجرید (جھاڑو دینا) کہا جاتا تھا۔

اس وقت شہر سے آنے والوں میں سے ہر ایک کو دس دس، بیس بیس آدمیوں پر تقسیم کرنے کے لیے سامان دیا جاتا تھا۔ اس تقسیم سے جو لوگ رہ جاتے انھیں جمعہ کو صبح کی نماز کے بعد تقسیم کیا جاتا اور لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے کہ رات کو تو تمام خانقاہ خالی ہوگئی تھی اب یہ سامان کہاں سے آگیا۔

دولت کی فراوانی اور شیخؒ کے جود و سخا کو دیکھ کر آپ کے حاسد و مخالف یہ کہتے تھے کہ سلطان المشائخ کی طرف لوگوں کا رجوع اسی داد و دہش کی وجہ سے ہے، اس میں آپ کی روحانیت کا کوئی دخل نہیں۔ لیکن وہ لوگ دوسروں پر ہونے والی اس سخاوت کو دیکھتے تھے اور اپنی ذات کے ساتھ کی جانے والی نفس کشی اور خواہشات کشی کو نہیں دیکھتے تھے۔

شیخؒ کے ایک بوڑھے مرید کی کسی نے یہ شکایت کی کہ وہ اپنے کمبل کی چار تہیں کر کے اس پر بیٹھتے ہیں تو شیخؒ نے اسے شاہانہ تکلف قرار دے کر ان سے کئی سال تک خفگی رکھی۔

مال و دولت کو ہاتھ لگانا اور پھر فقیرانہ بود و باش اختیار کرنا آسان ہے اور مال و دولت کی فراوانی میں رہنا اور پھر اپنے لیے فقر و فاقہ کی پابندی کرنا بہت مشکل ہے۔

اہل دنیا سے کنارہ کشی:

ترک دنیا اس معنی میں کہ صوفی اہل دنیا سے کنارہ کشی کرے اور جنگلوں اور پہاڑوں کی تنہائی میں خدا کی عبادت کرے۔ یہ ترک دنیا صوفیائے اسلام کے نزدیک درست نہیں ہے۔

یہ ترک دنیا رہبانیت ہے اور قرآن کریم نے اس رہبانیت کو عیسائیوں کی ایجاد کردہ بدعت قرار دیا ہے۔

وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ۔ (حدید:۲۷)

"اور ان مسیحی راہبوں نے رہبانیت (ترک دنیا) کا نیا طریقہ نکالا جو ہم نے ان پر مقرر نہیں کیا تھا۔"

حدیث پاک میں ہے:

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ۔

"اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔"

شیخ علیہ الرحمہ نے فرمایا کیلوکھڑی کے قیام میں جب میرے پاس روسا اور امرا کا ہجوم ہونے لگا تو میں نے وہاں سے قیام چھوڑ کر کسی دوسری جگہ قیام کا ارادہ کیا، اسی دن عصر کی نماز میں ایک نہایت خوب صورت مگر دبلا پتلا نوجوان آیا جو خدا جانے مردان غیب (فرشتگان الٰہی) میں سے تھا یا کوئی اور تھا، اس نے میرے پاس آکر پہلی بات یہ کہی

آں روز کہ مہ شدی نمی دانستی — کانگشت نمائے عالمی خواہد شد
امروز کہ زلفت دل خلقے بربود — در گوشہ نشست نمی دارد سود

"جس روز تم چاند بن کر نمودار ہوئے تھے اس وقت تمہیں اس کی خبر نہ تھی کہ تمہاری طرف انگلیاں اٹھیں گی اب جب کہ تمہاری زلف نے دنیا والوں کے دل اسیر کر لیے ہیں تو اب گوشے میں بیٹھنے سے کوئی فایدہ نہیں۔"

"ایں چہ قوت باشد و چہ حوصلہ کہ از خلق گوشہ گیرند و بحق مشغول شوند یعنی قوت و حوصلہ آں باشد کہ باوجود خلق بحق مشغول باشند۔"

"یہ کیا قوت کی بات ہے اور کیا ہمت و حوصلہ ہے کہ لوگوں سے الگ ہو کر یاد الٰہی میں مشغول ہو جائیں، قوت و ہمت یہ ہے کہ مخلوق کے ساتھ رہتے ہوئے یاد حق میں مشغول رہا جائے۔"

شیخؒ فرماتے ہیں، میں نے دوسری جگہ منتقل ہونے کا خیال ترک کر دیا۔

(جلد ۴، مجلس ۱۹، صفحہ ۶۷۱)

اس مرد غیب نے شیخ علیہ الرحمہ کو جو نصیحت کی وہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حسب ذیل حدیث کے مطابق تھی۔

حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

اَلْمُسْلِمُ يُخَالِطُ النَّاسَ وَيَصْبِرُ عَلٰى اَذَاهُمْ اَفْضَلُ مِنَ الَّذِىْ لَا يُخَالِطُهُمْ وَلَا يَصْبِرُ عَلٰى اَذَاهُمْ.

(مشکوٰۃ:۴۳۲ ترمذی)

”جو مسلمان لوگوں کے ساتھ گھلا ملا رہتا ہے اور ان سے پہنچنے والی تکلیفوں پر صبر کرتا ہے وہ اس مسلمان سے بہتر ہے جو لوگوں کے ساتھ گھل مل کر نہیں رہتا اور ان کی تکلیفوں پر صبر نہیں کرتا۔“

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت و بشارت ایک مسلمان کے دینی مشن (دعوت الی اللہ) کے مطابق ہے، اللہ کے دین توحید کی دعوت وہی دے سکتا ہے جو خدا کی مخلوق میں رہتا ہو، معاشرے میں اپنے اخلاق کی وجہ سے مانوس ہو۔ یہی خیر امت کا مشن قرآن کریم نے بیان کیا ہے اور ایک نہایت اہم ارشاد عالی ایک مومن کی اصلی شان کے بارے میں یہ ہے۔

اَلْمُؤْمِنُ مَاْلَفٌ، لَا خَيْرَ فِيْمَنْ لَا يَاْلَفُ وَلَا يُؤْلَفُ.

(مشکوٰۃ:۴۲۵ بہ حوالہ احمد)

”حقیقی مومن اور کامل مومن وہ ہے جو الفت و محبت کا خزانہ ہے، اس شخص میں کوئی خیر و بھلائی نہیں جو کسی سے محبت نہ کرے اور نہ اس سے کوئی دوسرا محبت کرے۔“

تصوف و احسان کی اس سے بہتر تشریح کیا ہو سکتی ہے؟

بزرگوں کے معمولات بدعت نہیں:

شیخ علیہ الرحمہ کے افادات کا بڑا حصہ نفل نمازوں اور مختلف اوراد و وظائف پر مشتمل ہے اور ان معمولات کے فوائد بھی شیخ نے بڑے اعتماد کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔

اس سلسلے میں بعض حلقوں کے اندر سنت اور بدعت کی بحث کی جاتی ہے اس کا جواب، ہم مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ کے حسب ذیل ملفوظات کے حوالے سے نقل کرتے ہیں۔ اتباع سنت پر زور دینے والے حلقے میں مولانا تھانویؒ کا ایک خاص مقام ہے۔ فرماتے:

متاخرین صوفیا کے بعض اعمال و وظائف جو سلف صالحین میں معروف نہ تھے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ (دار العلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مدنیؒ کے خلیفہ ارشد اور مولانا تھانویؒ کے خاص استاذ) نے ان کے متعلق فرمایا کہ یہ بدعت کی تعریف میں نہیں آتے، اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی نسخے میں طبیب نے شربت بزوری لکھا اور یہ شربت اس وقت عام طور پر بازار میں ملتا تھا، نسخہ استعمال کرنے والوں کو کوئی تکلیف نہ تھی۔ پھر ایک ایسا وقت آ گیا کہ یہ شربت بازار میں مفقود و ناپید ہو گیا تو اب کسی نے شربت بزوری کا نسخہ لکھا، مریض کو اس کے تمام مفردات جمع کر کے شربت بنانے کا کام کرنا پڑا۔ اب کوئی شخص یہ کہے کہ حکیم صاحب کے نسخے میں تو صرف ایک لفظ شربت بزوری لکھا تھا یہ سارا جھگڑا جو تم نے کھڑا کیا، نسخے میں زیادتی اور بدعت ہے تو جیسا اس کا کہنا معقول نہیں اسی طرح صوفیہ کے مجوزہ خاص خاص اعمال اور مراقبات جو بعض باطنی امراض کا علاج ہوتے ہیں ان کا بھی یہی حال ہے۔ (مجالس حکیم الامت: ۲۷۸ مرتبہ مفتی محمد شفیع صاحبؒ، کراچی)

عبادت الٰہی دائمی فریضہ ہے جو ساقط نہیں ہوتا:

شیخ علیہ الرحمہ نے مختلف عنوانات عبادت کے بارے میں جو تاکیدی ہدایات دی ہیں ان کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ بعض صوفیا کے خیال میں وصول الی اللہ کی منزل پر پہنچنے کے بعد عبادت کا فریضہ ساقط ہو جاتا ہے۔ شیخ علیہ الرحمہ اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔

مولانا امین احسن صاحب اصلاحیؒ نے اپنی کتاب تزکیہ نفس میں شاہ ولی اللہ کی فیوض الحرمین کے حوالے سے صوفیہ کے اس قول کی تردید کی ہے کہ اولیائے کاملین

سے شرعی تکالیف ساقط ہوجاتی ہیں۔

تردید اور تنقید میں شاہ ولی اللہؒ کا حوالہ دے کر مصنف نے نہایت غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ کیوں کہ شاہ صاحبؒ نے اس قول کو جس تاویل و توجیہ کے ساتھ پیش کیا ہے وہ قطعی طور پر کتاب و سنت کے خلاف نہیں۔

صوفیہ میں ایک طبقہ ابتدا ہی سے ایسا ضرور رہا ہے جو اس قول کو اس مفہوم میں لیتا ہے کہ واصل بحق ہونے کے بعد ایک صوفی کو نہ نماز پڑھنے کی ضرورت ہے نہ روزہ رکھنے کی، لیکن اکابر صوفیہ نے ہمیشہ اس کی مذمت کی اور اسے ملحدانہ نظریہ قرار دیا۔ بعض اکابر صوفیہ کے ہاں یہ الفاظ ملتے ہیں، لیکن ان کا مطلب وہ نہیں ہے جو بعض گم راہ لوگ اختیار کرتے ہیں۔

مصنف محترم نے اس ملحدانہ نظریے کی تردید کرتے ہوئے ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ شاہ ولی اللہؒ جیسے مصلحین تصوف کا مسلک بھی مشتبہ نظر آنے لگتا ہے۔

فیوض الحرمین میں تحقیق شریف کے نام سے شاہ صاحبؒ نے جو کچھ لکھا ہے وہ حسب ذیل ہے:

عبارت کا ترجمہ یہ ہے۔

اولیائے کرام کے دل میں اکثر یہ خیال آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے تکلیف شرعی کو ساقط کر دیا ہے اور انھیں اختیار دیا ہے کہ وہ اطاعت کریں یا نہ کریں۔ میرے والد نے اپنے بارے میں مجھے یہ بتایا کہ ان کے دل میں بھی یہ خیال القا ہوا مگر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ انھیں شرعی عبادات پر قائم رکھے، انہوں نے اس خیال کو صرف ایک روحانی کیفیت کے درجے میں رکھا، کیوں کہ ان کا مسلک یہ تھا کہ مخلوق جب تک عاقل بالغ رہتی ہے اس وقت تک شرعی احکام کی تعمیل سے سبک دوش نہیں رہتی۔ پس میں نے یہ اندازہ لگایا کہ میرے والد صاحب اس باطنی خیال (الہام) کو بھی صحیح سمجھتے ہیں اور وہ مذہب حق پر بھی قایم ہیں اور اس سے ان پر حیرت طاری ہے۔

مجھے میرے محترم چچا (شاہ ابوالرضا صاحبؒ) کے بارے میں یہ بتایا گیا کہ وہ بھی اپنے بارے میں یہ فرماتے ہیں کہ ان کے دل میں بھی سقوط تکالیف کا خیال ڈالا

گیا اور ان سے کہا گیا کہ اگر تم جہنم کے خوف سے عبادت کرتے ہو تو میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں نے تمھیں جہنم سے آزاد کیا۔ اور اگر جنت کے شوق میں عبادت کرتے ہو تو میں (خدا تعالیٰ) تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں جنت میں داخل کروں گا اور اگر تم میری خوش نودی حاصل کرنے کے لیے عبادت کرتے ہو تو میں تم سے راضی ہوں اور کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔ میرے چچا نے جواب دیا کہ اے میرے پروردگار! میں تیری عبادت بغیر کسی شوق و خوف کے کرتا ہوں۔

میرے چچا کا بھی یہ خیال تھا کہ اولیائے کاملین سے سقوط تکالیف ہوجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان پر بغیر اختیار کے روحانی کیفیات طاری کرتے ہے اور یہ خیال اکثر اولیا سے منقول ہے لیکن اس خیال کی حقیقت میرے نزدیک یہ ہے کہ انسان جب ایمان بالغیب سے ایمان بالمشاہدہ کی منزل میں آتا ہے تو وہ اپنے اندر عبادت اور روحانی کیفیت کو فطری خواہشات جیسے بھوک، پیاس کی طرح محسوس کرتا ہے، جن کے چھوڑنے پر وہ قادر نہیں ہوتا اور تکلیف و مشقت کا تصور باقی نہیں رہتا کیوں کہ وہ عبادت اس کے لیے فطرت اور جبلت کے درجے میں آجاتی ہے۔ یہ باطنی خیال و احساس کبھی اس کے دل میں واضح اور صاف صاف آتا ہے اور کبھی اس کے دل میں اجمالی طور پر اشارے کے درجے میں پیدا ہوتا ہے۔

یہ ہے حقیقت تکالیف کے ساقط ہونے کی۔

شاہ صاحبؒ نے تکلیف کے معنی لغوی اختیار کیے ہیں اور اسی کے مطابق صوفیا کے قول کی تشریح کی ہے لیکن بعض غیر ذمہ دار صوفی تکلیف سے شرعی مفہوم یعنی ذمہ داری مراد لیتے ہیں اور غیر شرعی تصور قایم کرتے ہیں۔

واضح رہے کہ شاہ صاحبؒ نے الہام کے لفظ کو لغوی معنی میں استعمال کیا ہے، یعنی دل میں مخفی اشارہ، جسے میں نے خیال سے تعبیر کیا ہے۔ الہام کا اصطلاحی مفہوم یعنی خدا کی طرف سے القا یہاں مراد نہیں ہے۔ شاہ صاحبؒ کے اسلوب کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں کو غلط فہمی ہوجاتی ہے۔

نوا ملیس سے شاہ صاحبؒ کی مراد قلبی واردات اور تجلیات صفات رہی ہیں۔

شاہ صاحبؒ کی اس اصطلاح کو سمجھنا ہو تو تفہیمات جلد دوم صفحہ ۱۹۲۱ کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہاں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ خیال ایک فطری احساس ہے کہ انسان جب سفر کی منزل پر پہنچ جاتا ہے تو اس کی حرکت سفر ختم ہو جاتی ہے لیکن چوں کہ معاملہ سفر آخرت یا طلب حق کا ہے جس میں اس دنیائے خاکی کے اندر وصول حق کامل پر مرنے کے بعد عالم حقیقت ہی میں ہوگا اس لیے اس راہ کے مسافروں کی حرکت سفر زندگی کے آخری لمحے تک جاری رہے گی۔

اکل حرام کے ساتھ عبادت کا غلبہ کیوں؟

ایک شیطانی فتنہ پر شیخ علیہ الرحمہ کی گرفت:

حضرت شیخ علیہ الرحمہ اکل حلال اور اکل حرام کے درمیان ایک حکایت کے حوالے سے بڑا عجیب وغریب فرق بیان کرتے ہیں۔

حدیث پاک میں اکل حرام کے اثرات کے بارے میں کہا گیا ہے:

۱۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ روایت کرتے ہیں:

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ جَسَدٌ غُذِيَ بِالْحَرَامِ.

(مشکوٰۃ ۲۴۳ بہ حوالہ بیہقی)

"حضور علیہ السلام نے فرمایا وہ جسم جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کو حرام غذا کھلائی گئی ہو۔"

۲۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں:

مَنِ اشْتَرٰى ثَوْبًا بِعَشَرَةِ دَرَاهِمَ وَفِيْهِ دِرْهَمٌ حَرَامٌ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ لَهٗ صَلٰوةً مَادَامَ عَلَيْهِ ثُمَّ اَدْخَلَ اُصْبُعَيْهِ فِيْ اُذُنَيْهِ وَقَالَ صُمَّتَا اِنْ لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ. (بہ حوالہ احمد)

"حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا جس شخص نے دس درہم کا ایک کپڑا خریدا جن میں ایک درہم حرام کا تھا تو جب تک یہ کپڑا اس کے جسم پر رہے

گا اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہیں کرے گا۔ حضرت ابن عمرؓ نے پھر اپنے کانوں میں انگلیاں ڈالیں اور فرمایا میرے یہ دونوں کان بہرے ہو جائیں اگر میں نے یہ ارشاد حضور علیہ السلام سے نہ سنا ہو۔"

علمائے کرام نے لکھا ہے کہ ایسی نماز جو حرام سے حاصل کیے ہوئے کپڑوں میں ادا کی جائے وہ قانونی اعتبار سے تو ادا ہو جائے گی لیکن عنداللہ قبول نہیں ہوگی یعنی اس کا ثواب نہیں ملے گا۔ کیوں کہ فقہ میں حلال کپڑوں کی شرط نہیں ہے پاک کپڑوں کی شرط ہے۔

ان ارشادات نبوی سے معلوم ہوا کہ کسب حرام اور وہ پیسے جو شرعاً ناجائز ہیں یا جو کمائی جھوٹ اور دھوکہ دینے کی وجہ سے ناجائز ہو جاتی ہے، اس سے پرورش پانے والا جسم گندا اور تاریک ہے۔ وہ جنت جیسے پاکیزہ اور نورانی مقام میں داخل ہونے کے قابل نہیں ہے، اس جسم سے ادا کی جانے والی عبادت اخلاص اور رضائے الٰہی کے جذبے سے معمور نہیں ہو سکتی۔ پاکیزہ جسم میں پاکیزہ جذبات پیدا ہوتے ہیں، گندے جسم میں گندے خیالات جنم لیتے ہیں۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا:

اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ. (متفق علیہ مشکوٰۃ: ۲۴)

"خبردار ہو! جسم کے اندر گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ ٹھیک رہتا ہے تو سارا جسم ٹھیک رہتا ہے اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے، خبردار! وہ قلب ہے۔"

یہ حدیث ایک تمثیل ہے، شریعت کی اصطلاح میں قلب (دل) اور صدر (سینہ) سے باطنی قوت مراد ہے، دو قوتوں کا نام انسان ہے ایک جسمانی قوت، دوسری باطنی قوت۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مثال دے کر بتا رہے ہیں کہ اگر گوشت والا دل بیمار ہو جائے تو سارا جسم بیمار ہو جاتا ہے اسی طرح اگر انسان کی اندرونی قوت، اس کا ارادہ

اس کے جذبات بگڑ جاتے ہیں تو سارے جسم کے افعال بگڑ جاتے ہیں۔
باطنی خیالات کی پاکیزگی ایک پاکیزہ جسم سے تعلق رکھتی ہے اور پاکیزہ جسم پاکیزہ غذاؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک ناجائز کمائی کھانے والا انسان ایک بڑا عبادت گذار کیسے ہوسکتا ہے؟
ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شرابی، جواری، ڈھنڈاری روزہ نماز کی معمول کے مطابق عبادت گذاری کرتا ہے حالاں کہ اس کے پیٹ میں لقمہ حرام جارہا ہے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن ایسا شخص عبادت گذاری میں ولی نظر آئے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ قرآن کہتا ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔

(عنکبوت:۴۵)

''نماز بے شرمی کے کاموں اور گناہوں سے روکتی ہے۔''
اور ایک شخص لقمہ حرام میں مبتلا ہے اور پھر اس کے ساتھ ہی ایک بڑا عبادت گذار بھی ہے۔ یہ کیسے ہوا؟
شیخ فرماتے ہیں کہ ایک نوجوان شخص حضرت ابراہیم ابن ادھم بلخیؒ کا مرید ہوا اور پھر عبادت گذاری میں اس نے نہایت بلند مقام حاصل کرلیا۔ حضرت ابراہیمؒ کو اس کی عبادت گذاری پر بڑا رشک ہوا اور وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگے کہ میں تارک دنیا ہوکر عبادت کے اس بلند مقام پر نہ پہنچ سکا۔

''بعد ازاں بنور ضمیر روشن خود معلوم کرد کہ آں ہمہ شیطانی است آں جواں ہمہ لقمہ ناوجہ می خورد و شیطان او را بداں طاعت مے داشت۔''

''یعنی حضرت ابراہیمؒ کو اپنے روشن ضمیر کے ذریعے معلوم ہوا کہ یہ سب شیطان کی کارستانی ہے، وہ نوجوان ناجائز کمائی کھاتا ہے اور شیطان نے اس برائی کی طرف سے غافل رکھنے کے لیے اسے نماز، روزہ اور ذکر الٰہی کی طرف لگادیا ہے تاکہ وہ اس فعل حرام کی طرف متوجہ نہ ہو اور اپنے آپ

کو بہت بڑا عبادت گذار سمجھے۔''
حضرت ابراہیمؒ نے اس کا عملی علاج تجویز کیا اور اسے ہدایت کی کہ تم آج سے میرے ساتھ کھانا کھایا کرو، اسے اس فعل پر زبانی تنبیہ نہیں کی۔ ابراہیم ابن ادھمؒ لکڑیاں فروخت کرکے گذر بسر کرتے تھے، اس نوجوان نے اپنے پیر کے ساتھ کھانا شروع کردیا۔

''آں غلبہ طاعت بے اصل او فرو نشست، باندک عبادت باز آمد، چناں کہ نماز فرض بہ حیلہ گزاردن گرفت تا کار آں جواں ساختہ شد و بصدق آمد۔'' (جلد اول مجلس ۳۴، صفحہ ۳۱۴)

''اب اس نوجوان کے بے اصل عبادت کا غلبہ ختم ہوگیا، فرض نمازوں میں بھی سستی پیدا ہونے لگی، پھر وہ اصلی حالت پر لوٹ آیا اور اس کے اندر سچائی پیدا ہوگئی۔''

پھر شیخ علیہ الرحمہ نے شیخ کامل کی تربیت کی اہمیت کے بارے میں فرمایا:

''ایں سر کہ سر ہمہ سعادت ہاست بیروں داد گفت، شیخ برائے ایں کار مے باید، بعد ازاں ہمہ ایں معنی ایں فائدہ فرمود کہ طاعت اندک باشد گو صدق بسیار مے باید۔''

''یہ بنیادی بات تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے کہ شیخ طریقت کی تربیت کا مقصد یہ ہے کہ وہ نفس کی کمزوریوں پر نظر رکھتا ہے اور نفسانیت کے شیطانی مکروفریب کی باریکیاں سمجھتا ہے اور طالب و مرید کو ان سے بچاتا ہے اور اسے مقام اخلاص پر پہنچا دیتا ہے، پھر فرمایا اطاعت و عبادت تھوڑی ہو مگر اخلاص کے ساتھ ہو۔''

شیخ علیہ الرحمہ کی بیان کردہ حکایت میں چند باتیں قابل تشریح ہیں۔
(ا) قرآن کریم میں شیطان (سرکش ہستی) کا اطلاق شر و فساد برپا کرنے والے گم راہ جنات اور مفسد انسان دونوں پر کیا گیا ہے، گم راہ جنات برے وسوسے اور گندے خیالات دل میں ڈال کر حق سے گم راہ کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ نے انھیں

وسوسہ اندازی کی قوت دی ہے اور یہ خدا تعالیٰ کے نظام آزمائش کی مصلحت ہے۔ جس پر زبان کھولنا خدا تعالیٰ کی شان کبریائی میں سوئے ادب ہے۔

گم راہ انسان غلط رہنمائی اور گم راہ کن مشوروں کے ذریعے انسان کو صحیح راہ سے بچلاتے ہیں۔

(۲) شریعت ایک مرتب اور مربوط قانون حیات ہے۔ جس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد بڑی ترتیب سے نافذ کیے گئے ہیں۔

اگر ایک شخص اپنی پسند اور اپنے ذوق سے اس ترتیب کے خلاف چلتا ہے تو وہ شریعت کا مجرم ہے۔

مثال کے طور پر یہ سمجھیے کہ ہر مسلمان پر خدا کی عبادت کے لیے پانچ وقت کی نماز فرض ہے اور اس کے اوقات متعین ہیں اور اسی کے ساتھ اہل وعیال کی پرورش کے لیے معاشی جدوجہد، تجارت، حرفت اور زراعت کی ذمہ داری اس کے اوپر عاید کی گئی ہے۔

اب اگر ایک شخص محنت مزدوری کے اوقات میں نوافل گذاری شروع کردے اور کسب حلال کے لیے ہاتھ پیر ہلانے کے بجائے ذکر الٰہی میں مشغول رہے تو شریعت اسے گناہ گار قرار دے گی۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

گفت پیغمبر کہ بر رزق اے فتا — در فروبست ست وبر در قفلہا

عالم اسباب ورزقے بے سبب — می نیا بد پس مہم باشد طلب

"پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ رزق وروزی تالوں کے اندر بند ہے، اور یہ عالم اسباب ہے یہ بے سبب و بے محنت کے کامیابی سے ہم کنار نہیں کرتا۔"

حضرت عمر فاروقؓ نے ایک نوجوان کو شب بے داری کے لیے کثرت سے مسجد نبوی میں آتے جاتے دیکھا۔ آپ نے ایک روز اسے ٹوک دیا اور فرمایا تم اتنی شب بے داری کے ساتھ ماں باپ اور بیوی بچوں کی کفالت کے لیے محنت مزدوری کس طرح کرتے ہو؟

اس نوجوان نے کہا، امیر المومنین! مجھ پر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد خوف آخرت کا غلبہ ہوگیا ہے۔ قرآن کریم نے دو چیزوں کو عذاب الٰہی سے ڈھال قرار دیا ہے۔ ایک رسول پاک علیہ السلام کی ہستی کو اور دوسرے توبہ واستغفار کو (سورۂ انفال) حضور صلی اللہ علیہ وسلم وصال فرما گئے۔ اب ایک توبہ واستغفار رہ گیا ہے جس میں میں نے اپنے آپ کو مشغول کردیا ہے۔

روایت اسی قدر ہے لیکن امیر المومنین عمرؓ نے اس نوجوان کی خلش اور اس کے اضطراب کو دور کرنے کے لیے ضرور کسب حلال کی روحانی اور اخروی برکتوں کی طرف متوجہ کیا ہوگا۔ صرف ایک ہی ارشاد گرامی رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا اس بارے میں کافی ہے۔ فرمایا:

نِعْمَ الْعَوْنُ عَلَى التَّقْوٰى الْمَالُ۔ (کنز العمال)

"پرہیزگاری کا بہترین معاون ومددگار مال ودولت ہے۔"

۳۔ شیاطین الانس اور شیاطین الجن دونوں شریعت سے ہٹانے کے لیے فریب اور مکاری کا یہ راستہ اختیار کرتے ہیں کہ اہم فریضے سے غافل کرنے کے لیے غیر ضروری اور بے موقع نیکیوں کی ترغیب دیتے ہیں۔

بے موقع اور غیر ضروری نیکیوں کو فضائل ومحاسن سے مزین کر کے اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ انسان موقع ومحل کے لحاظ سے اصل ذمہ داریوں سے غافل ہوجاتا ہے۔

علمائے کرام نے وضاحت کی ہے کہ عام مسلمانوں کے سامنے جن کے اندر غریبوں کی تعداد زیادہ ہو حج بیت اللہ کے فضائل پر تقریریں نہ کی جائیں کیوں کہ اس سے غریبوں کے اندر حج کا شوق پیدا ہوگا اور وہ ضروری ذمہ داریوں کو نظر انداز کر کے حج کے لیے جانے کی کوشش کریں گے۔ (معلم الحجاج مفتی سعید احمدؒ مظاہر العلوم سہارن پور)

حضرت ابراہیم ابن ادہمؒ کا خاص سلوک:

مشائخ تصوف میں سلوک (روحانی ترقی کی کوشش) کے مختلف انداز رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم ابن ادہم بلخیؒ تاج وتخت چھوڑ کر تصوف کی راہ پر گامزن ہوئے

تھے اس لیے آپ کا سلوک اکل حلال پر زور دیتا تھا اور اسی اکل حلال سے آپ مرید کے اندر روحانی انوار پیدا کر دیا کرتے تھے۔ شیخ علیہ الرحمہ نے ایک مجلس میں فرمایا:

لوگوں نے حضرت ابراہیم ابن ادہمؒ سے سوال کیا کہ اسم اعظم کیا ہے؟

جواب دیا:

''معدہ را از لقمہ حرام پاک دار و دل را از محبت دنیا خالی کن بعد ازاں بہر اسمے کہ خدائے را نجوانی آں اسم اعظم است۔''

''اسم اعظم یہ ہے کہ معدے کو لقمہ حرام سے پاک رکھا جائے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب دل دنیا کی محبت سے خالی ہو، پھر جس نام سے بھی اسے پکارا جائے وہی نام اسم اعظم (خدا کا بڑا نام) ہے۔''

(جلد ۵، مجلس ۵، صفحہ ۵۲)

شیطان کی مخفی کارستانی:

شیطان لعین نے خدا تعالیٰ کو چیلنج کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ میں تیرے گم راہ بندوں کو حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے تیری بناوٹ (خلق اللہ) میں ردوبدل کریں گے۔ (سورۂ نساء: ۱۱۹)

یعنی تیرے دین کا چہرہ موہرہ بگاڑ دیں گے۔ شیطان کی اس اغوا کاری اور وسوسہ اندازی کا تعلق دین دار (علما و صوفیا) کے طبقے سے ہے اور اس میں احداث فی الدین اور غلو فی الدین کی تمام شکلیں موجود ہیں۔

شیخ علی الرحمہ نے جس صورت کی مثال دی ہے وہ غلو فی العبادۃ (عبادت میں غلو اور تجاوز حد) کی صورت ہے۔

آج کل یہ صورت عام ہے، امرائے قوم نفلی عمروں اور نفل حج پر لاکھوں روپے صرف کرتے ہیں حالاں کہ ان پر ملت اسلامیہ ہند کی تعلیمی، معاشی سماجی پستی کو دور کرنے کی ذمہ داریاں عاید ہیں جن کا درجہ فرض سے کم نہیں۔ ہم نے شیخ علیہ الرحمہ کے حج بیت اللہ نہ کرنے کی بحث میں اس پر روشنی ڈالی ہے وہاں دیکھیے۔

سلطان جیؒ اپنی والدہ کے مزار پر

روحانی استفادہ اور استعانت بالغیر کی وضاحت

سلطان المشائخ علیہ الرحمہ کا بھی ایک واقعہ ایسا منقول ہے کہ آپ ایک خاص پریشانی کے موقعے پر اپنی ماں کے مزار پر تشریف لے گئے اور فاتحہ پڑھ کر ان کی روحانیت سے حوصلہ اور ہمت طلب کی۔

واقعہ یہ پیش آیا کہ قطب الدین مبارک شاہ (علاء الدین خلجی کا جانشیں) کی ہدایت کے مطابق شہر کے علما اور صوفیا نئے چاند کی مبارک باد پیش کرنے کی غرض سے شاہی دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ شیخ علیہ الرحمہ اپنی نمائندگی کے لیے اپنے خادم اقبال کو بھیج دیا کرتا تھے۔ لوگوں نے بادشاہ کو اس طرف متوجہ کیا کہ بڑے بڑے مشائخ تو خود حاضر ہوتے ہیں مگر خواجہ نظام الدینؒ اپنے خادم کو بھیج دیتے ہیں۔ بادشاہ نے اسے محسوس کیا اور حکم جاری کیا کہ آیندہ چاندرات کو خواجہ نظام الدینؒ کو حاضر ہونے کا حکم بھیج دیا جائے اور اگر وہ نہ آئیں تو انھیں گرفتار کر کے لایا جائے۔ اس وقت آپ اپنی ماں کے مزار پر تشریف لے گئے، پھر قدرت نے اس مغرور بادشاہ کو اس کے منظور نظر خسرو خاں کے ہاتھوں قتل کرا دیا اور وہ تخت پر بیٹھ گیا اور سلطان جیؒ کے ساتھ گستاخی کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ (فوائد: ۱۳۵)

حضرت شیخ علیہ الرحمہ کا یہ فعل روحانی توجہ اور قوت کشف سے تعلق رکھتا ہے۔ شیخ نے اپنی والدہ کی روحانی قوت سے استفادہ کیا، آپ کی والدہ بڑی مقبول حق ہستی تھیں، دو روحانی ہستیوں کے درمیان اس قسم کے روحانی استفادے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

استعانت غیر اللہ کا مسئلہ مسلمانوں کے دو فرقوں کے درمیان بڑا نزاعی مسئلہ بن گیا ہے لیکن حقیقت میں یہ لفظی نزاع ہے۔

جماعت دیوبند کے شیخ حضرت مولانا محمود حسنؒ (شیخ الہند) نے سورۂ فاتحہ کی آیت اِیَّاکَ نَعْبُدُ کی تفسیر میں جو حاشیہ تحریر کیا ہے وہ دونوں فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہے۔حاشیہ یہ ہے:

''اس آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ اس کی ذات پاک کے سوا کسی سے حقیقت میں مدد مانگنی بالکل ناجائز ہے۔ہاں! اگر مقبول بندے کو محض واسطہ رحمت الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری اس سے کی جائے تو یہ جائز ہے کہ یہ استعانت درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔''

حضرت شیخ الہندؒ نے شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلویؒ کے ترجمے (موضح قرآن) کی تسہیل کی ہے اور اس کا نام موضح فرقان رکھا ہے۔ڈھائی پاروں کا تفسیری حاشیہ بھی شیخ الہندؒ کا تحریر کردہ ہے۔

یہ ترجمہ سعودی حکومت نے لاکھوں کی تعداد میں چھاپ کر ہدیے کے طور پر تقسیم کیا ہے۔لیکن اب سلفی علما نے اس پر چند اعتراضات کر کے اسے ناپسندیدہ قرار دینے کی اپیل کی ہے۔

ان اعتراضات میں سے ایک اعتراض اوپر والی عبارت پر بھی کیا گیا ہے اور اسے شرک قرار دیا گیا ہے۔حالاں کہ شیخ الہندؒ نے حقیقت اور مجاز اور مستقل اور غیر مستقل کا فرق کر کے مسئلے کو صاف کر دیا ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں امت کے غربا کے توسل سے دعا کرنا ثابت ہے۔

حضور علیہ السلام کا غربا سے توسل:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں روایت آئی ہے:

اِنَّهٗ کَانَ یَسْتَفْتِحُ بِصَعَالِیْکِ الْمُهَاجِرِیْنَ.

(عن امیہ ابن خالد بہ حوالہ شرح السنہ مشکوٰۃ: ۴۴۷)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فقرائے مہاجرین کے توسل سے فتح کی دعا فرماتے تھے:

قَالَ ابْنُ الْمَلِکِ بِاَنْ یَقُوْلُ، اَللّٰهُمَّ انْصُرْنَا عَلَی الْاَعْدَآءِ بِحَقِّ عِبَادِکَ الْفُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِیْنَ.

''ابن ملک کہتے ہیں کہ آپ ان الفاظ میں دعا کرتے تھے، الٰہی! دشمنوں کے مقابلے میں اپنے بندوں فقرائے مہاجرین کے وسیلے سے ہماری مدد فرما۔'' (حاشیہ بہ حوالہ مرقاۃ)

ایک حدیث میں ہے:

اَبْغُوْنِیْ فِیْ ضُعَفَائِکُمْ فَاِنَّمَا تُرْزَقُوْنَ اَوْ تُنْصَرُوْنَ بِضُعَفَائِکُمْ. (ایضاً بہ حوالہ ابوداؤد)

''لوگو! میری خوشنودی تلاش کرو اپنے کم زور بھائیوں کی دل داری (فِیْ حِفْظِ قُلُوْبِهِمْ) کر کے، بے شک تمہیں اپنے کم زوروں کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے یا ان کی وجہ سے تمہاری مدد کی جاتی ہے۔''

صلہ رحمی کا حق:

شیخ نظام الدینؒ کے بارے میں شیخ علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ وہ رشتہ داروں کے شرعی حق کا بڑا خیال رکھتے تھے، ان کے ایک قریبی رشتے کے بھائی تھے اور وہ بڑے مسخرے تھے، ہر وقت لوگوں سے مذاق کرنے کی عادت تھی، شیخ نظام الدینؒ ان سے ملنے جاتے تھے یہ شیخ کے ساتھ اپنی عادت کے مطابق ہنسی مذاق کرتے تھے ایک روز شیخ ان سے ملنے گئے، انہوں نے مذاق شروع کر دیا۔شیخ بولے:

''مرا بگزارید تا ساعتے پہلوے شما بنشینیم یا آوارہ و بدراہ و روسیاہ بروم، این سخن باچناں شکستگی گفت کہ ایشاں درگریہ شدند۔''

''مجھے چھوڑ دو، میرے ساتھ مذاق نہ کرو تاکہ میں کچھ دیر تمہارے پاس بیٹھا رہوں یا پھر میں ناکام و نامراد چلا جاؤں، یہ بات شیخ نے اتنی عاجزی کے ساتھ فرمائی کہ ان کے وہ مسخرے بھائی رونے لگے۔''

اس حکایت کا مطلب یہ ہے کہ خونی اور نسبی رشتے داروں کے ساتھ اگر مالی

خدمت کا سلوک نہ ہو سکے تو ان سے ملنے جلنے کا سلسلہ جاری رکھا جائے اس طرح بھی ان کا حق ادا ہوتا ہے۔

اسی قسم کی واقعہ شاہ محمد اسحاق صاحب محدث دہلویؒ جانشین و نبیرہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا بھی ہے۔ شاہ صاحبؒ انتہائی سنجیدہ مزاج تھے آپ ہر ہفتے اپنے ایک رشتے دار (جو کارخانہ دار تھے) سے ملنے جایا کرتے تھے یہ صاحب دلی کے ایک پر مذاق آدمی تھے، شاہ صاحبؒ سے بازاری قسم کا مذاق کرتے تھے، آپ اسے برداشت کرتے اور کچھ دیر بیٹھ کر چلے آتے تھے۔ لوگوں نے آپ پر اعتراض کیا، آپ نے فرمایا میں صلہ رحمی کا حق اسی طرح ادا کرتا ہوں کہ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ جاتا ہوں، اور کسی قابل نہیں ہوں۔

بزرگوں کے تبرکات کی بحث:

حجۃ الوداع کے موقعہ پر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر مبارک حلق کرایا (منڈوایا) تو آدھے سر کے بال حضرت ابوطلحہؓ کو عطا فرمائے اور آدھے سر کے بال تمام صحابہ میں تقسیم کرائے۔

محمد ابن سیرینؒ بڑے تابعی ہیں، ان کے پاس حضور علیہ السلام کے موئے مبارک تھے وہ ان کی سند بیان فرمایا کرتے تھے۔

حضرت سیرینؒ مشہور صحابی حضرت انسؓ کے غلام تھے۔ حضرت انسؓ حضرت ابوطلحہؓ کے گیلٹر بیٹے تھے، اس تعلق سے محمد ابن سیرینؒ کو موئے مبارک پہنچے تھے۔ محمد ابن سیرینؒ کے شاگرد نے جب اپنے استاذ سے موئے مبارک اور اس کی سند کا بیان سنا تو اپنی آرزو ظاہر کرتے ہوئے فرمایا:

لَاَنْ تَكُوْنَ عِنْدِیْ شَعْرَةٌ مِنْهُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا۔

امام بخاریؒ نے اس اثر سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انسان کے بال بالذات اور فی نفسہٖ پاک ہیں اگر یہ ناپاک ہوتے تو ان سے برکت حاصل کرنے کا

کیا مطلب؟

حضرت امام نے اسے حضور علیہ السلام کی خصوصیت تسلیم نہیں کیا کیوں کہ اس پر کوئی دلیل نہیں۔ علما نے اس سے استدلال کرتے ہوئے لکھا کہ بزرگوں کے تبرکات سے برکت حاصل کرنا جائز ہے۔ بدعت نہیں ہے۔

امام احمد ابن حنبلؒ کی آستین میں حضور علیہ السلام کا موئے مبارک سلا ہوا تھا کوڑے کھاتے وقت وہ اپنی جان سے زیادہ موئے مبارک کا خیال رکھتے تھے۔

ترکی میں حضور علیہ السلام کا مستند خرقہ پاک موجود ہے۔ جنگ بلقان کے زمانے میں ترکوں کی طرف سے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے کچھ تبرکات بھیجے گئے تھے ان میں سے ایک تبرک دارالعلوم دیوبند کے لیے بھی بھیجا گیا تھا اور وہ ایک بارک کپڑا ہے۔ جس میں وہ خرقہ مبارک لپٹا ہوا رکھا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ اس کپڑے کو آنکھوں سے لگا کر رویا کرتے تھے اور اسے چوما کرتے تھے۔

(فضل الباری شرح بخاری جلد دوم صفحہ ۲۸۱ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ)

البتہ جہاں تک رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار و تبرکات کا معاملہ ہے اس میں بے حد احتیاط کی ضرورت ہے آپ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔

(حدیث)

"جو شخص جان بوجھ کر میری طرف کسی غلط بات کو منسوب کرے اسے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالینا چاہیے۔"

اس حدیث کی وعید کا اطلاق حضور علیہ السلام کے اقوال پر بھی ہوتا ہے اور اعمال پر بھی اور آثار پر بھی۔ اس لیے آپ کی ذات پاک سے منسوب کسی چیز کی سند جب تک موجود نہ ہو اسے آپ کی طرف نسبت کرنا جائز نہیں سمجھا گیا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی احتیاط:

امام شاہ ولی اللہؒ اور ان کے جانشین خاص طور پر آپ کے پوتے مولانا محمد

اسماعیل شہید صاحبؒ ان مصلحین امت میں سے ہیں جن کی نظر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس احتیاطی طرز عمل پر رہی چناں چہ شاہ صاحبؒ نے انفاس العارفین میں اپنے والد شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ انھیں خواب کی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دو موئے مبارک عطا فرمائے اور بے دار ہو کر آپ نے وہ موئے مبارک اپنے تکیہ کے نیچے پائے۔ ان دونوں متبرک باتوں کو شاہ عبدالرحیم صاحبؒ نے آخر عمر میں دوسرے تبرکات کے ساتھ اپنے متعلقین میں تقسیم کر دیا اور ایک موئے مبارک شاہ ولی اللہؒ کو عطا فرمایا۔ (انفاس العارفین ترجمہ اردو: ۱۰۵)

دوسرے کے بارے میں شاہ صاحبؒ خاموش ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ شاہ صاحبؒ کے دوسرے بھائی شاہ اہل اللہ کو عطا کیا ہو، تبرک کی حیثیت سے یہ موئے مطہر کتنی اہمیت سے آپ کے خاندان میں آیا۔ مگر اس کے بعد پھر کہیں اس موئے مبارک کا تذکرہ نہیں ملتا اور نہ شاہ اہل اللہ صاحبؒ کے تذکرے میں اس کا ذکر آتا ہے، اس کا مطلب واضح ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے عقیدت کے عوامی فتنے سے بچنے کے لیے اس موئے مبارک کو اس طرح محفوظ کر دیا کہ وہ لوگوں کے ہاتھ نہ لگے۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا مزاج صوفیانہ زیادہ تھا۔ شاہ ولی اللہؒ کی طرح مصلحانہ کم تھا، پھر بھی آپ کے ارشادات یا معمولات میں اس موئے مبارک کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔

سید ابوالعلاء اکبر آبادیؒ کا واقعہ:

شاہ صاحبؒ نے اپنے والد کے ایک پیر سید ابولعلاء اکبر آبادیؒ کے تذکرے میں لکھا ہے کہ ان کا تصوف اتباع شریعت کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان کے ابتدائی مرید اس روش پر قایم رہے۔ ان کے بعد ع

بد نام کنندہ مرد نکو نامے

قسم کے لوگ آئے جنہوں نے خواہش نفسانی کا اتباع کیا اور اس فرمان الٰہی کے مصداق بنے:

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ. (الصافات:۱۱۳)

''اور ان کی اولاد میں کوئی اچھا کام کرنے والا ہوا اور کوئی اپنی جان پر صریح ظلم کرنے والا ہوا۔''

شاہ صاحبؒ نے ان کے صاحب زادے میر نور العلیؒ کے متعلق لکھا ہے کہ میرے والد نے ان سے کہا کہ آپ کے والد کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ جس کو اپنے منہ کا چبا ہوا پان عنایت کرتے تھے وہ بے ہوش ہو جاتا تھا؟ آپ نے جواب دیا کہ میں نے تو ان کا چبایا ہوا پان کئی دفعہ کھایا یہ بات کوئی کلیہ نہیں تھی۔

شاہ عبدالرحیم صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں نے میر نور العلی سے زیادہ کسی کو حق گو نہیں دیکھا۔ (صفحہ ۳۷)

یہ مثال ان اہل اللہ کی ہے جو مزاج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آشنا ہوتے ہیں اور شریعت حقہ کی حفاظت کو ہر صورت میں اہمیت دیتے ہیں۔ حال سے مغلوب ہو کر عوام کے لیے فتنے کا دروازہ نہیں کھلنے دیتے۔

اصلی نیکی خدمت خلق:

شیخ علیہ الرحمہ نے ایک گجراتی بزرگ کے حوالے سے فرمایا:

ایک گجراتی بزرگ ایک حوض پر وضو کرنے گئے، حوض پر چار عورتیں آ گئیں اور انہوں نے شیخ گجراتی سے کہا کہ ہمارے گھڑوں میں پانی بھر دو، انہوں نے چاروں کے گھڑے بھر دیے اور وضو کر کے گھر آ گئے۔

ان کے ایک دوست مجذوب تھے جو ان کے ساتھ رہتے تھے۔ گجراتی بزرگ نے نماز شروع کی اور بلند آواز سے تکبیر کہی تا کہ وہ مجذوب بے دار ہو کر نماز ادا کرلیں اور وہ ان کی آواز سے جاگ گئے اور جاگ کر ان سے کہا:

''ایں چہ شور وغلبہ آوردہ ای، کار ہماں بود کہ سبوے آں عورت پر آب کردہ دادہ ای۔''

''یہ کیا شور وغل مچا رہا ہے، اصل کام تو وہ تھا کہ تو نے ان عورتوں کے

گھڑے پانی سے بھر کر دیے تھے۔" (جلد۴، مجلس ۳۷، صفحہ۷۷٦)

حدیث میں آتا ہے:

اَلسَّاعِیُ عَلَی الْاَرْمِلَةِ وَالْمِسْکِیْنَ کَالْمُجَاهِدُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ.

"بیوہ عورتوں اور مسکینوں کی مدد کے لیے کوشش کرنے والا خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کے برابر ہے۔"

حسن اخلاق کا سبق:

خواجہ علیہ الرحمہ نے خواجہ اجل شیرازیؒ کے حوالے سے فرمایا:

خواجہ علیہ الرحمہ نے ایک نئے مرید کو یہ سبق دیا:

"آں چہ بر خود روانداری بر غیر نیز روامداد۔"

"جو بات تو اپنے لیے پسند نہیں کرتا وہ دوسروں کے لیے بھی پسند نہ کر، اور جو اپنے لیے پسند کرتا ہے وہ دوسروں کے لیے بھی پسند کر۔"

یہ مرید خواجہ صاحبؒ سے نماز، روزہ اور ذکر و اذکار کی تلقین کا انتظار کر رہا تھا، مگر خواجہ صاحبؒ نے صرف یہ نصیحت کی۔ یہ چلا گیا۔ عرصے کے بعد حاضر ہوا اور پھر درخواست کی کہ مجھے آپ نے پہلے بھی نماز اور اوراد کے بارے میں کچھ تلقین نہیں کی، اب میں دوبارہ حاضر ہوا ہوں، مجھے کچھ تلقین فرمایے۔ خواجہؒ نے پوچھا تمہیں جو اس وقت نصیحت کی تھی اس کا کیا ہوا؟ مرید حیران ہو کر خاموش ہو گیا۔ خواجہ صاحبؒ نے فرمایا جب تم نے پہلا سبق ہی یاد نہ رکھا تو اب دوسرا سبق کیا دوں؟

(جلد۱ مجلس۶ صفحہ۲۰۷)

خواجہ صاحبؒ نے حدیث نبوی کی تلقین کی تھی۔

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَا یُوْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰی یُحِبُّ لِاَخِیْهِ مَایُحِبُّ لِنَفْسِهٖ. (مشکوٰۃ:۴۲۲)

"اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے کوئی انسان

مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہ بات پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔"

اس حدیث میں بھائی سے صرف نسبی بھائی مراد نہیں ہے بلکہ نسبی بھائی ہو یا دینی بھائی ہو ہر قسم کا بھائی مراد ہے اور حضور علیہ السلام کی مشہور دعا کا اگر لحاظ کیا جائے تو پھر انسانی برادری کا ہر فرد جو بھائی ہے وہ مراد ہوگا۔ حضور علیہ السلام کی دعا یہ ہے۔

اَللّٰهُمَّ اَنَا شَاهِدٌ اَنَّ النَّاسَ کُلُّهُمْ اِخْوَةٌ.

(ابوداؤد، جلد۱، صفحہ۲۱۸)

"الٰہی میں گواہی دیتا ہوں کہ تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔"

تقویٰ اور عبادت:

شیخ علیہ الرحمہ نے دلی کی مشہور ولی خاتون فاطمہ بی بیؒ سام کا ذکر کیا اور فرمایا:

وہ بڑی صلاحیت و عفت کی مالک تھیں، حضرت بابا صاحبؒ ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے:

"آن زن مردیست کہ او را در صورت زناں فرستادہ اند۔"

"وہ تو ایک مرد ہے عورت کی صورت میں اسے بھیجا گیا ہے۔"

پھر شیخؒ نے فرمایا درویش لوگ نیک مردوں اور نیک عورتوں کے توسل سے دعا کرتے ہیں اور اس دعا میں عورتوں کا ذکر پہلے کرتے ہیں کیوں کہ نیک عورتیں گم نام ہوتی ہیں۔ "نیک زناں غریب باشند۔" شیخؒ نے غریب کا لفظ استعمال کیا ہے اردو مترجم صاحب نے اس کا ترجمہ "کم ہوتی ہیں" کیا ہے جو درست نہیں معلوم ہوتا۔

شیخ علیہ الرحمہ کا مطلب اگر یہی ہوتا تو آپ لفظ قلیل استعمال کرتے جو عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں کثیر الاستعمال ہے۔

عربی میں غریب کا مفہوم مسافر، اجنبی اور غیر مانوس آتا ہے ایک میں بھی غریب کا لفظ اجنبی اور بے گانہ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

بَدَاُ الْاِسْلَامِ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ غَرِیْبًا.

"اسلام کی ابتدا ہوئی اس حال میں کہ وہ ایک اجنبی چیز تھا اور آخر وقت میں بھی وہ ایک اجنبی اور مسافر کی طرح ہو جائے گا۔"

شیخ علیہ الرحمہ نے غریب کے لفظ کو اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ نیک عورتیں گم نام ہوتی ہیں، مرد تقویٰ وطہارت میں شہرت پا جاتے ہیں۔ لیکن گھر کی چار دیواری میں بیٹھنے والی عورتیں لوگوں سے پوشیدہ رہتی ہیں۔ اس گم نامی کی وجہ سے ان نیک عورتوں کا درجہ نیک مردوں کے مقابلے میں خدا کے نزدیک بلند تر ہوتا ہے اور اہل اللہ توسل میں انھیں مقدم رکھتے ہیں پھر شیخؒ نے فرمایا۔

"مے باید کہ فرزند آدم بطاعت وتقویٰ معروف آید، خواہ مرد باشد یا زن، چوں شیر از بیشہ بیروں آید کسے نپرسد کہ ایں شیر نر است یا مادہ۔"

"انسان کو چاہیے کہ وہ طاعت گذاری اور پرہیز گاری میں نام پیدا کرے چاہے مرد ہو چاہے عورت، شیر جب جنگل سے نکلتا ہے تو وہ شیر ہوتا ہے کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ یہ نر ہے یا مادہ ہے۔"

پھر آپ نے یہ شعر پڑھا:

گر نیک آیم مرا از یشاں گیرند
ور بد باشم مرا بد یشاں بخشند

"اے خدا! اگر میں نیکوکار ہوں تو ان نیکوں کے ساتھ میرا حشر کیجیے اور اگر میں برا بر ہوں تو ان نیکوں کے طفیل مجھے بخش دیجیے۔"

(جلد ۱، مجلس ۲۹، صفحہ ۲۵۸)

اچھوں کی صحبت میں بیٹھو:

شیخ علیہ الرحمہ نے ایک روز خواجہ حسنؒ سے پوچھا: تم کن لوگوں کے پاس بیٹھتے اٹھتے ہو، میں نے شیخؒ کے بعض مریدوں کے نام لیے، اس پر آپ نے خوشی کا اظہار کیا اور فرمایا:

مشائخ کا یہ طریقہ ہے کہ وہ جب کسی شخص کا حال معلوم کرنا چاہتے ہیں تو یہ پوچھتے ہیں کہ فلاں شخص کن لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے۔

"پرسند کہ با کیاں صحبت دارد، ہم ازاں معلوم شد کہ او کدام قبیل است۔"

"اس کے ہم مجلس لوگوں کے نام سن کر وہ حضرات سمجھ لیتے تھے کہ وہ کس لائن کا آدمی ہے۔"

پھر آپ نے یہ شعر پڑھا:

با عاشقاں نشیں و غم عاشقی گزیں
با ہر کہ نیست عاشق کم شو باو قریں

فرمایا یہ شعر خواجہ ابو سعید ابوالخیرؒ کا ہے:

"یعنی اہل محبت کے پاس بیٹھو اٹھو اور محبت کا غم کھاؤ اور جو شخص اہل محبت میں سے نہ ہو اس سے دور رہو۔" (جلد ۱، مجلس ۲۱، صفحہ ۲۵۷)

اچھی صحبت اختیار کرنے کے بارے میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

لَا تُصَاحِبْ اِلَّا مُؤْمِنًا وَلَا يَاْكُلْ طَعَامَكَ اِلَّا تَقِيٌّ۔

(مشکوٰۃ: ۴۲۶، بہ حوالہ ترمذی)

"ارشاد فرمایا ایمان والے کی صحبت اختیار کر اور تیرا کھانا پرہیز گار آدمی کھائے۔"

محدثین نے طعام سے دعوت کا کھانا (دعوۃ الطعام) مراد لیا ہے۔ طعام حاجت یعنی ضرورت کا کھانا، ہر ضرورت مند کو کھلانا چاہیے، قرآن کریم نے کہا:

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِينًا وَّيَتِيمًا وَّاَسِيرًا۔

اسیر اور قیدی غیر مسلم بھی ہوتے تھے جیسے بدر کے غیر مسلم قیدیوں کی خاطر مدارات کا آپ نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا تھا۔

دوسری حدیث میں فرمایا گیا:

اَلْمَرْءُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِہٖ فَلْیَنْظُرْ اَحَدُکُمْ مَنْ یُّخَالِلُ۔

(مشکوٰۃ: ۴۲۷ بہ حوالہ مسند احمد)

"ہر شخص اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے پس یہ دیکھنا چاہیے کہ کوئی شخص کس کے ساتھ دوستی کر رہا ہے؟"

ترک دنیا کیا ہے؟

صوفیائے چشت نے خاص طور پر فتنہ وفساد کی اس بنیادی وجہ اور اصل جڑ کو سمجھ لیا تھا جس کی طرف صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ دلائی تھی

وَاللّٰہِ مَا الْفَقْرَ اَخْشٰی عَلَیْکُمْ وَلٰکِنْ اَخْشٰی عَلَیْکُمْ اَنْ تَبْسَطَ عَلَیْکُمُ الدُّنْیَا کَمَا بَسَطَتْ عَلٰی مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ فَتَنَا فِسُوْھَا کَمَا تَنَا فَسُوْھَا وَتُلْھِیَکُمْ کَمَا اَلْھَتْھُمْ۔ (بخاری)

"خدا کی قسم! مجھے غربت کی طرف سے تمہارے لیے کوئی اندیشہ نہیں مگر میں تمہارے لیے اس خطرے سے ڈرتا ہوں کہ تم پر دنیا کی فراخی آجائے جیسا کہ اگلوں پر آئی اور وہ اس کشادگی میں ایک دوسرے کے ساتھ مقابلے میں پڑ گئے اور انھیں آخرت سے غفلت میں ڈال دیا تم بھی اس میں گرفتار ہو جاؤ گے۔"

دولت کی کشادگی کا یہ اثر فطری ہے، اس فطری اثر سے محفوظ رہنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے خدا ترسی اور تقویٰ کی قوت۔

یہ قوت تقویٰ دور نبوت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے صحابۂ کرامؓ کو حاصل تھی مگر بعد والوں کو حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تمہارے اندر خوفِ آخرت موجود ہے۔ اس کے باوجود مجھے خطرہ ہے اور جو طبقہ تقوے کی قوت سے محروم ہوگا اس کے بارے میں یہ خطرہ بدرجہ اولیٰ موجود ہے۔ اسی لیے بعد والوں کے لیے مال و دولت کو تقوے کا معاون کہا گیا۔ **نِعْمَ الْعَوْنُ لِلتَّقْوٰی اَلْمَالُ** اور انہی لوگوں کے حق میں فقر وافلاس

کو ایمان کے لیے خطرہ کہا گیا۔ کَانَ الْفَقْرَ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا۔

اہل تصوف نے فقر وافلاس کے فتنے کے مقابلے میں دولت وتمول کے فتنے کو زیادہ خطرناک سمجھا اور خواص امت اور اہل اللہ کے لیے جو عہد اول کے مسلمانوں کی زندگی کو پسند کرتے تھے ان کے لیے ترک لذات کی حکمت عملی کو ضروری قرار دیا۔

اس کے علاوہ اصحاب روحانیت نے اسلام کی قانونی تعلیم کے مقابلے میں صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی اور آپ کے ذاتی اسوۂ حسنہ کو اپنے لیے نمونہ قرار دیا۔

قانونی تعلیم (دسواں حصہ دولت کا ادا کر کے باقی دولت کی اجازت) عوام کے لیے رکھی گئی اور خواص کے لیے ہادی شریعت کی ذاتی زندگی کو واجب العمل سمجھا گیا اور اسے اصحاب تصوف نے اخلاقی وجوب کا درجہ دیا۔

قرآن کریم نے جس چیز کو بہترین نمونہ حیات کہا **اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ**. وہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی ہے۔ رسول پاک علیہ السلام نے ایک واقعہ پر ایک صحابی سے فرمایا:

> "اگر واقعی تجھے مجھ سے محبت ہے تو تو اس کے لیے آمادہ ہو جا کہ تیری طرف فقر وافلاس اس طرح دوڑ کر آئے جس طرح پانی نشیب کی طرف آتا ہے۔"

چشتی صوفیائے کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کو حقیقی اہمیت دی اور اسے محض سطحی قسم کا ناصحانہ فقرہ نہیں سمجھا اور عشق رسول کے ساتھ فقر وغربت کو ضروری قرار دیا۔

احادیث نبوی میں کتاب الرقاق (فقر اور فقرا کی فضیلت) میں کثرت سے احادیث منقول ہیں اور وہی اہل تصوف کا معمول ہیں۔

اسلامی حکم رانوں کی سادگی:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن ہستیوں (صحابۂ کرامؓ) کی خود تربیت فرمائی

تھی وہ بیک وقت صوفی اور درویش بھی تھے اور سیاسی منتظم اور فوجی جرنیل بھی تھے۔

عہد اول کے سیاسی حکم رانوں کے غزوات کا تذکرہ تو تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے لیکن ان حضرات نے سیاسی اقتدار اور مادی توسع کے باوجود فقر وسادگی اور خدمت خلق کے جو حیرت انگیز کارنامے پیش کیے ان کے ذکر سے یہ تاریخی کتابیں خالی نظر آتی ہیں۔ البتہ محدثین کرام نے حضرات صحابہؓ وتابعینؒ کی زندگی کے اس پہلو پر کچھ نہ کچھ روشنی ضرور ڈالی ہے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ واقدی کی فتوح الشام غزوات کی شان وشوکت سے بھری پڑی ہے لیکن شام کے ایک حصے حمص کے درویش صفت گورنر سعید ابن عامرؓ کی رعایا نوازی کے بے مثال تذکروں کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔

ملک شم کا یہ دولت مند شہر سعید ابن عامرؓ کی امارت کے دور میں مزید ترقی کرتا ہے لیکن اس علاقے کا امیر ملک شام کی دولت اور اس کے سامان عیش وعشرت کو ہاتھ نہیں لگاتا۔

خلیفہ دوم حضرت عمرؓ نے جب شام کا دورہ کیا تو سرکاری افسران سے کہا کہ اس علاقے کے غریبوں کی ایک فہرست مرتب کر کے مجھے دو۔

حضرت عمرؓ نے جب اس فہرست پر نظر ڈالی تو سب سے پہلے ایک نام پڑھا۔ سعید ابن عامرؓ پوچھا، یہ کون سعید ہیں؟ جواب دیا گیا، یہ ہمارے امیر ہیں، پوچھا، یہ سرکاری وظیفے کا کیا کرتے ہیں۔ بتایا گیا کہ تمام وظیفہ شہر کے غریبوں پر تقسیم کر دیتے ہیں۔ فرمایا۔ اچھا یہ ایک ہزار اشرفیاں انھیں میری طرف سے ہدیے کے طور پر دے دینا۔ سعید نے اس تھیلی کو دیکھ کر اِنَّـا لِلّٰہِ پڑھا، بیوی بولیں کیا ہوا۔ کیا امیر المومنین کو کوئی صدمہ پہنچا؟ بولے نہیں۔ بیوی نے کہا پھر کیا قیامت آگئی۔ بولے ہاں، اس سے بڑی اور قیامت کیا ہوگی، عمرؓ نے یہ تھیلی بھیجی ہے، دنیا مرا پیچھا کر رہی ہے۔

سعیدؓ وہ تھیلی لے کر مسجد میں بیٹھ گئے اور آنے جانے والے غربا پر تقسیم کر کے اٹھے۔ یہ فتوح الشام میں نظر آتا۔ صحابۂ کرامؓ کی ذاتی صفات مرتب کرنے والوں نے اس قسم کے حالات لکھے ہیں۔ (اسوۂ صحابہ: ۲۴۸)

دوسری مثال فارس کے شہر مدائن کے گورنر سلمان فارسیؓ کی ہے۔ عرب ایران غزوات کے ہنگامہ خیز واقعات سے تاریخ پُر ہے مگر مدائن کے گورنر سلمان فارسیؓ کی درویشی کا تذکرہ غزوات کی تاریخوں میں کہیں نہیں ملتا۔

سلمان فارسیؓ نے مجوسیوں سے مقابلہ کرنے والوں کے ساتھ بڑی بہادری سے کام کیا تھا مگر انہوں نے اس کی قیمت وصول نہیں کی بلکہ خدمت خلق اور عوام کے ساتھ حسن سلوک کے اخلاق کا مظاہرہ کر کے ان کے دلوں میں اسلام کی محبت اتاری اور اسلامی جہاد کا مقصد ہی یہ ہے کہ عقیدے اور رائے کے معاملے میں جو لوگ تشدد اور جبر سے کام لیتے ہیں انھیں اس ظلم سے باز رکھنا اور جب یہ حالت ختم ہو جائے تو اخلاق و محبت سے لوگوں کے اندر خدا کی وحدانیت پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔

عہد اول میں صحابۂ کرامؓ کا خصوصیت کے ساتھ یہی مشن و مقصد تھا۔ بعد والوں نے اس مشن پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی تاکہ ان کے عجمی طمطراق کے لیے جواز فراہم ہو جائے۔

سلمان فارسیؓ شہر سے گزر رہے تھے، ان کے لباس کی غربت دیکھ کر ایک سوداگر نے انھیں حمال (جھلی والا) سمجھا اور ان سے بوجھ اٹھانے کو کہا۔ سلمانؓ نے سوداگر کا بوجھ سر پر رکھ لیا، دو چار قدم چلنے کے بعد لوگوں نے انھیں پہچان لیا اور اس سوداگر کے پیچھے پڑ گئے، سوداگر نے معذرت کی کہ سامان اتار دیجیے مگر سلمان فارسیؓ نے فرمایا، ایسا نہیں ہو سکتا، میں نے جس نیکی کا ارادہ کر لیا ہے اسے پورا کر کے چھوڑوں گا اور یہ سامان سوداگر کے مکان تک پہنچاؤں گا۔ (اسوۂ صحابہ: ۱۰۲)

پنڈت کو اپنے جنیو سے محبت، عقیدے کی حفاظت کا جذبہ:

شیخ حسن علیہ الرحمہ سرکاری تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے پریشان تھے، انھوں نے شیخ علیہ الرحمہ سے اپنی پریشانی کا اظہار فرمایا، شیخؒ نے انھیں تسلی دیتے ہوئے ایک واقعہ سنایا جو شیخؒ کو ایک بزرگ نے سنایا تھا، فرمایا:

کسی جگہ کے حاکم شہر نے ایک پنڈت جی سے ناراض ہو کر ان کا مال و اسباب

ضبط کر لیا۔ اس پریشانی کے بعد وہ پنڈت جی ان کے ایک دوست کو ملے۔

''بعد ازاں آں برہمن مفلس و مضطرب شدہ، روزے در راہے مے رفت دوستے او رایش آمد و پرسید کہ۔ حال تو چیست؟ برہمن گفت نیکو و خوش، آں دوست گفت کہ ہمہ چیز از تو بستدند خوشی تو از کجاست؟ گفت زنار من باقیست!''

''دوست نے پوچھا، کیا حال ہے۔ وہ بولا، بہت اچھا ہوں، خیریت ہے دوست نے کہا تیرا سب کچھ تو چھن گیا پھر بھی کہتا ہے کہ خوش ہوں، برہمن نے کہا میرا جنیو تو میرے پاس ہے!''

پھر شیخؒ نے مجھے نصیحت فرمائی:

''توقف مواجب و نایافت اسباب دنیا ہیچ غمے باید خورد اگر ہمہ جہاں بر دوبا کے نیست، محبت حق باید کہ برقرار باشد۔''

''آمدنی کے رکنے اور اسباب دنیا کے میسر نہ آنے سے پریشان نہ ہونا چاہیے، اگر سارا جہاں بھی چھن جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، اللہ کی محبت برقرار رہنی چاہیے۔'' (جلد ۲ مجلس ۱۰، صفحہ ۳۷۲)

آج کے حالات سات سو برس پہلے کے حالات سے بالکل مختلف ہیں۔ آج ہم مسلمان اسی جگہ کھڑے ہیں جہاں کل وہ برہمن کھڑا تھا۔

وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ. (آل عمران: ۱۴۰)

''یہ زمانہ اپنی بھلائیوں اور برائیوں کے ساتھ لوگوں کے درمیان گردش کرتا رہتا ہے۔''

ہم مسلمانوں کے لیے موجودہ آزمائشی دور میں شیخ علیہ الرحمہ کی یہ نصیحت بہت اہم ہے، ہمیں ہر قسم کے دنیوی مفاد کے مقابلے میں اپنے عقیدے، ایمان اور اپنے دینی کیرکٹر کو عزیز رکھنا چاہیے، ہم سے سب کچھ چھن جائے مگر ہمارا اپنے دین پر قیام باقی رہے۔ یہ جذبہ ہی ایمان کی حفاظت کرے گا۔

اس قسم کے دور میں اگر ہم نے دنیوی مفاد، جاہ و مال اور شہرت کو عزیز رکھا تو ہم

اپنے دین سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے، کیوں کہ آج ساری دنیا اور اس کے مفادات شیطانی قوتوں کے ہاتھ میں ہیں وہ تو خدا تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنِ. (ذاریات:۵۸)

"بے شک اللہ تعالیٰ ہی روزی رساں ہے، صاحب قوت ہے زور آور ہے۔"

گر صد لشکر از خوباں بقصد دل کمیں ساز
بحمد اللہ والمنۃ بتے لشکر شکن دارم

ازدواجی معاملے میں عزیمت اور رخصت کا فرق

ایک مجلس میں شیخ علیہ الرحمہ نے اپنے مرید محمد گوالیاریؒ کے سوال اور اپنے جواب کا ذکر فرمایا:

"وقتے از من پرسید کہ مجرد بودن بہتر است یا متاہل، من گفتم کہ عزیمت تجرید است و رخصت تاہل۔"

"ایک دن انہوں نے سوال کیا کہ مجرد رہنا اور غیر شادی شدہ رہنا بہتر ہے یا شادی کرنا بہتر ہے۔ میں نے جواب دیا کہ مجرد رہنا عزیمت ہے اور شادی کرنا رخصت ہے۔"

پھر شیخؒ نے شرعی اصطلاح عزیمت اور رخصت کی تشریح فرمائی کہ اگر انسان یاد حق میں اتنا مشغول اور محور رہتا ہے کہ وہ جانتا ہی نہیں کہ خواہش نفسانی کیا چیز ہے تو اس کی اس محویت حق کا اثر اس کی آنکھوں، اس کی زبان اور دوسرے اعضائے جسمانی پر پڑتا ہے، اسے چاہیے کہ مجرد رہے اور اگر ایسا نہیں اور اس کے دل میں خواہش نفسانی کے وسوسے آتے رہتے ہیں تو اس کے لیے شادی کرنا افضل ہے۔ تو اس معاملے میں اصل چیز انسان کا ارادہ اور اس کا دلی جذبہ (ایمانی قوت) ہے جو مادی خواہشات پر حکومت کرتا ہے۔ (جلد۴، مجلس ۲۹، صفحہ ۲۱۷)

محدثین کرام نے حدیث نبوی کے لفظ باءۃ سے تین وسائل نکاح مراد لیے ہیں جن میں سے ایک قوت جماع ہے۔ شیخ علیہ الرحمہ نے یاد حق میں اتنی مشغولیت اور توجہ الی اللہ میں اتنے کمال کی شرط کے ساتھ تجرد کی زندگی کو افضل قرار دیا ہے۔

حضرات انبیا میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی مثال:

قرآن کریم نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی مدح میں فرمایا

وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ. (آل عمران:۳۹)

''وسردار و بے رغبت بزناں و پیغمبرے از نیکو کاراں۔''

(شاہ ولی اللہؒ)

''وہ سردار ہے اور عورتوں کی رغبت نہیں رکھتا اور صالح رسولوں میں سے ہے۔''

مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ترجمہ یہ ہے۔

''اور مقتدا ہوں گے اور اپنے نفس کو لذات سے بہت روکنے والے ہوں گے۔''

عربی لغت میں حصر کے معنی کسی چیز کو روکنا، کنٹرول کرنا، اسی روکنے سے خواہش نفس کو روکنا آتا ہے جسے ضبط نفس کہتے ہیں۔

بعض علمائے تابعینؒ نے حصور کی تشریح نامرد سے کی ہے لیکن قاضی عیاضؒ نے شفا میں اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نامردی ایک نقص ہے جو انبیائے کرام کی شایان شان نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

انما الفضل فی کونها موجودة ثم یمنعها اما بمجاهدة کعیسیٰ علیه السلام او بکفایة من الله عزوجل کیحییٰ علیه السلام. ثم هی فی حق من قدر علیها وقام بالوا جب فیها ولم تشغله من ربه درجة علیا وهی درجة نبینا صلی الله علیه وسلم الذی لم یشغله کثرتهن عن عبادة ربه.

(ابن کثیر جلد اول صفحہ۳۶۱)

فضیلت کی بات یہ ہے کہ انسان میں قوت نفسانی موجود ہو اور وہ اسے روک کر رکھے۔ حرام لذتوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حلال لذتوں کو بھی ترک کر دے۔

انبیائے سابقین میں اس کی دو مثالیں تھیں اور دونوں کی نوعیتیں الگ الگ تھیں۔

۱۔ ایک مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہے۔

آپ نے مجاہدات اور نفس کشی کی ریاضتوں کے ذریعے شہوانی قوت کو دبایا اور غیر شادی شدہ آسمان پر اٹھا لیے گئے۔ البتہ حدیث میں آتا ہے کہ آپ قیامت کے قریب آسمان سے زمین پر اتارے جائیں گے اور شادی کریں گے اور آپ کے اولاد ہوگی، اور آپ کا یہ قیام سات برس رہے گا اور اس طرح کل عمر شریف چالیس برس ہوگی۔ کیوں کہ جب آپ آسمان پر اٹھائے گئے اس وقت آپ کی عمر شریف ۳۳ برس کی تھی۔ (حاشیہ مشکوٰۃ: ۴۸۰ بہ حوالہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ)

۲۔ دوسری مثال حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ہے۔

آپ کو خدا تعالیٰ نے مجاہدہ و ریاضت کے بغیر ہی فطری طور پر ضبط نفس کی قوت کاملہ عطا کی تھی۔

ضبط نفس اور ازدواجی تعلق کی دونوں قوتیں پورے کمال کے ساتھ جس ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی گئیں وہ نبی آخر الزماں ہیں۔

قاضی عیاضؒ کی مذکورہ تشریح کے مطابق حضرت یحییٰ علیہ السلام دنیا سے غیر شادی شدہ ہی تشریف لے گئے لیکن محدث ابن کثیر دمشقی کے نزدیک حصور کے معنی گناہوں اور برائیوں سے رکنے والا رسول ہے۔ اس میں ازدواجی زندگی کی نفی نہیں ہے۔ اور اس کی دلیل ابن کثیرؒ کے نزدیک یہ ہے کہ آپ کے والد حضرت زکریا علیہ السلام نے دعا کی تھی:

رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً. (آل عمران:۳۸)

''خداوندا! مجھے اپنے خاص کرم سے پاکیزہ ذریت عطا فرما۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا بیٹا عطا فرما جس سے میری ذریت اور نسل چلتی رہے۔ (ایضاً:۳۶۲) لیکن بائبل تاریخ ابن کثیر کی تائید نہیں کرتی اور دونوں باپ بیٹوں (حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا علیہما السلام) کی یہودیوں کے ہاتھوں شہادت کے بعد ان کی نسل و ذریت کا کوئی تذکرہ بائبل میں نہیں کیا گیا۔

صاحب قصص القرآن نے قاضی عیاضؒ کی تحقیق سے اتفاق کیا ہے اور ان

دونوں محترم رسولوں کے تجرد اور ترک خواہشوں کی زندگی کو ان کے دور کی خاص مصلحت اور ضرورت قرار دے کر یہ لکھا ہے:

پہلا طریقہ (تجرد) اگرچہ بعض حالات میں محمود ہوتا ہے مگر فطرت انسانی اور اجتماعی حیات کے لیے غیر مناسب ہے۔ (جلد ثانی: ۳۸۲)

تجرد کے محمود ہونے کی مصلحت یہ معلوم ہوتی ہے کہ شہوت پرستی میں ڈوبی ہوئی دنیا کے سامنے ایک ایسی انسانی زندگی بھی آئے جو تمام جسمانی قوتوں سے آراستہ ہونے کے باوجود اپنی روحانیت کو غالب اور حاکم بنا کر دکھائے اور اس تجرد کی حیثیت ایک رسول و نبی کے حق میں معجزے کی ہے اور ایک ولی کے حق میں کرامت کی ہے۔

سادات کرام کی عظمت:

شیخ حسن علیہ الرحمہ نے ایک موضوع حدیث کے بارے میں شیخ علیہ الرحمہ سے سوال کیا جو عرصے سے ان کے دل میں کھٹک رہا تھا۔

عرض کیا کہ بعض علویوں (سیدوں) سے یہ سنایا گیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط تحریر فرمایا کہ میرے بعد اگر میرے اہل بیت میری امت کو فروخت کرنا چاہیں تو اسے فروخت کر سکتے ہیں مگر یہ خط ابو بکرؓ و عمرؓ نے پھاڑ دیا۔

شیخ علیہ الرحمہ نے اس کی تردید کی اور فرمایا یہ بات کسی مستند کتاب میں موجود نہیں ہے۔

پھر فرمایا:

> اما عزیز داشتن ایشاں و گرامی کردن فرزندان رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام واجب است، بعد ازاں فرمود کہ آں کہ آل رسول است ازو ناشائستی در وجوہ نیامدہ است و نیاید۔"

"بہر حال آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو محترم و مکرم سمجھنا واجب ہے۔ پھر فرمایا جو شخص آل نبی علیہ السلام میں سے ہو اس سے کوئی ناشائستہ حرکت واقع نہیں ہوئی اور نہ ہوتی ہیں۔"

پھر شیخ علیہ الرحمہ نے سمرقند کے ایک عالی نسب سید صاحب کا واقعہ سنایا کہ ان کی باندی کے پیٹ سے ایک لڑکا تھا، اس نے گھر میں پانی بھرنے والے سقے کی مشک میں تیر مار کر اس میں چھید کر دیا۔ سید صاحب نے اس سقے سے پوچھا کہ تیری مشک میں سے پانی کیوں گر رہا ہے؟ اس نے کہا آپ کے بچے نے اس میں سوراخ کر دیا۔ سید صاحب اس باندی کے پاس گئے اور اس سے پوچھا کہ صحیح صحیح بتا کہ یہ لڑکا کس کے نطفے سے ہے؟

اس نے بہت چھپایا مگر سید صاحب کی تلوار دیکھ کر ڈر گئی اور اقرار کیا کہ یہ لڑکا فلاں غلام کے نطفے سے ہے۔

سید صاحب باہر آئے اور لڑکے کی دو زلفیں تھیں انھیں کھول کر ایک زلف بنا دیا یعنی سیدوں کی علامت ختم کر دی، اس وقت سمرقند میں سید اور علوی سر پر بال رکھتے تھے اور دو زلفیں بنا لیتے تھے۔ (جلد ۵، مجلس ۱۸، صفحہ ۱۰۱۰)

شیخؒ نے اہل بیت نبوی کے احترام و ادب کو واجب قرار دیا کیوں کہ قرآن و حدیث دونوں میں اہل بیت نبوی کے ساتھ عقیدت و محبت قایم کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

پھر یہ بات بھی شیخ علیہ الرحمہ نے صاف کر دی کہ اصلی سید سے کوئی ناشائستہ بات سرزد نہیں ہوتی۔

صحابۂ کرامؓ کے درمیان باہمی محبت! بغض کی نفی:

شیخ علیہ الرحمہ نے ایک مجلس میں حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے درمیان محبت پر یہ واقعہ نقل فرمایا کہ ایک مجلس میں ایک صحابی کی پشت کے پیچھے ایک صحابی بیٹھے تھے اور یہ فرما رہے تھے:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے بار بار یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ میں اس جگہ گیا اور میرے ساتھ ابو بکرؓ اور عمرؓ تھے، میں نے فلاں کام کیا اور میرے ساتھ ابو بکرؓ اور عمرؓ تھے۔

ان صحابی نے اس بیان کرنے والے صحابی کو مڑ کر دیکھا تو وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے۔

''مقصود از تقریر ایں حکایت بیان موافقت و انصاف صحابہ بودہ است، فرمود کہ موافقت و انصاف صحابہ چنیں بودہ است۔''

''شیخ حسنؒ فرماتے ہیں کہ شیخ محبوب الٰہی کا اس واقعے کو سنانے سے مقصد یہ تھا کہ وہ واضح فرمائیں کہ صحابہ کی باہمی محبت اور انصاف ایسا تھا۔''

پھر فرمایا:

''وقتے عمرؓ مے گفت کہ اے کاش! من یک تار موئے بر سینہ ابوبکرؓ۔''

''ایک روز حضرت عمرؓ نے فرمایا: اے کاش! میں ابوبکرؓ کے سینے کا ایک بال ہوتا۔'' (جلد۴، مجلس ۱، صفحہ ۵۸۴)

مقبول بندوں کی موت پر تبصرہ:

شیخ علیہ الرحمہ نے اس مجلس میں خدا کے مقبول بندوں کی موت پر اور موت کے وقت ان کے چہروں پر خداوند عالم جل مجدہ کی ذاتی جلالت وعظمت کے سامنے پیش ہونے کے خیال سے آثار خوف طاری ہونے پر اور ایمان کی سلامتی اور عاقبت بالخیر ہونے کے نوافل پر نہایت تفصیل کے ساتھ گفتگو فرمائی اور چند نوافل تعلیم فرمائے جو بزرگوں کے معمولات تھے۔

قرآن کریم میں موت کے وقت ایمان پر ثابت قدم رہنے والوں کو ملائکہ رحمت کی طرف سے خدا کی جو بشارت ملتی ہے ان کا ذکر ان لفظوں میں کیا گیا ہے:

يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي.

(فجر:۳۰)

''اے دین اسلام پر پورے اطمینان اور شرح صدر کے ساتھ زندگی گزار کر خدا کے پاس چلنے والے! اپنے پروردگار کے پاس واپس چل، راضی خوشی، تیرا پروردگار بھی تجھ سے خوش ہے پس تو میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری خوشنودی اور رحمت کے باغ میں داخل ہو جا۔''

رحمت الٰہی کی اس عظیم بشارت کے باوجود مقبول بارگاہ بندوں پر خوف وخشیت کے جو آثار طاری ہوتے ہیں وہ مالک الملک کی جلالت شان کا تصور ہے جو ایمان کا تقاضا ہے۔

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ. (بقرہ:۶۲)

''خدا کے پیارے بندوں پر نہ خوف ہوگا اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔''

یہ نفی سزا اور آخرت کی تکلیفوں کے بارے میں ہے۔ وہ خوف کہ چہرہ زرد ہو جائے جلال حق کا اثر ہے۔ خواجہ حسنؒ فرماتے ہیں:

اس کے بعد دو رکعت نماز کا اور تذکرہ فرمایا، وہ نماز مغرب کے بعد اس کا ذکر اس طرح فرمایا کہ میرے ایک ہم جماعت دوست تھے ان کو مولانا تقی الدینؒ کہتے تھے وہ بڑے صالح اور سمجھ دار پڑھے لکھے تھے وہ ہمیشہ نماز مغرب کے بعد دو رکعت نماز ادا کرتے، پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد **وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ** اور دوسری رکعت میں فاتحہ کے بعد **وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ** پڑھتے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرماتے ہیں کہ میں نے انھیں خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ خدا تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا (معاملہ) کیا؟ کہنے لگے کہ جب میرا کام تمام ہو گیا تو حکم آیا کہ ہم نے اسے ان دو رکعتوں کے طفیل بخش دیا۔ حاضرین میں سے کسی نے سوال کیا کہ کیا اسے صلوٰۃ النور کہتے ہیں؟ فرمایا کہ نہیں اس کو صلوٰۃ البروج کہتے ہیں۔ صلوٰۃ النور اور دو رکعت نماز کو کہتے ہیں جس کی دونوں رکعتوں میں سورۂ انعام کی شروع کی آیات پڑھتے ہیں، پہلی رکعت **يَسْتَهْزِءُوْنَ** پر ختم کرتے ہیں اور دوسری رکعت میں **اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا** سے شروع کر کے **يَسْتَهْزِءُوْنَ** پر ختم کرتے ہیں۔ پھر اس وقت کی اور طلوع کے وقت (کی نماز کی) ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کہ جب رات آتی

ہے تو ایک فرشتہ کعبے کی چھت پر آ کر پکارتا ہے اے خدا کے بندو اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیو! خدائے تعالیٰ نے تمہیں ایک رات یہ عنایت فرمائی ہے اور ایک رات تمہارے لیے آنے والی ہے اور وہ رات قبر کی رات ہے۔ اس (آنے والی) رات کے لیے اسی رات کو کچھ ذخیرہ کرلو اور کچھ کام کرلو اور وہ یہ ہے کہ دو رکعت نماز پڑھو۔ پہلی رکعت سورۂ فاتحہ کے بعد پانچ مرتبہ **قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ** اور دوسری رکعت میں بھی یہی۔ اور جب دن نکلتا ہے تو یہی فرشتہ بیت المقدس کی چھت پر آتا ہے اور ندا دیتا ہے کہ اے بندگان خدا اور اے امتیان محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ نے تمہیں ایک دن عطا کیا ہے اور ایک دن تمہارے لیے آنے والا اور وہ روز قیامت ہے اور اس دن کے توشے کے لیے آج ایک کام کرلو اور وہ یہ ہے کہ دو رکعت نماز پڑھو۔ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد پانچ مرتبہ سورۂ اخلاص (قل ہو اللہ) پڑھو۔ اس کے بعد زبان مبارک سے ارشاد ہوا کہ شیخ جمال الدین ہانسوی علیہ الرحمۃ و الغفران نے اسے حدیث بتایا ہے۔ مجھے حدیث شریف کے الفاظ یاد نہیں رہے مفہوم یہی ہے جو بیان کیا گیا۔

اس کے بعد اولیا کی موت اور اس حال کا ذکر آیا جو اس کے بعد ہوتا ہے۔ اس ضمن میں فرمایا کہ اولیا انتقال کے وقت تک ایسے ہوتے ہیں جیسے کوئی سو رہا ہو اور اس کا معشوق بھی بستر میں آ گیا ہو۔ رحلت کے وقت اس سونے والے کی حالت ایسی ہوتی ہے گویا ایک نیند سے بے دار ہو گیا ہو اور وہ معشوق جس کی طلب میں ساری زندگی رہا تھا اس کو اپنے بستر میں موجود دیکھے۔ اندازہ کرو کہ اس کو کیسی خوشی اور فرحت ہوگی۔ حاضرین میں کسی نے سوال کیا کہ کیا بعض اولیا ایسے ہوتے ہیں جن کو یہیں مشاہدے کی نعمت حاصل ہو جاتی ہے؟ فرمایا کہ ہاں، لیکن یہ نعمت جو اس وقت دیکھتے ہیں جب وہ کمال کو پہنچتی ہے تو پھر بالکل اس سونے والے کی مانند ہوتے ہیں کہ جو نیند سے بے دار ہو تو اپنے معشوق کو اپنے بستر پر پائے۔ اس حدیث کے موافق کہ **اَلنَّاسُ نِیَامٌ فَاِذَا مَاتُوْا اِنْتَبَھُوْا** یعنی ساری خلقت نیند میں ہے جب موت آئے گی تو بے دار ہوگی یعنی یہاں جو جس طلب میں مستغرق ہے مرنے کے بعد اس کا

مطلوب اس کو ملے گا۔

اس کے بعد اولیا کی موت کے تذکرے میں حکایت بیان فرمائی کہ بدایوں میں میرے ایک دوست تھے۔ احمد نام، بڑے نیک اور عبادت گذار اور ابدال صفت اگرچہ بے پڑھے لکھے تھے لیکن ہمیشہ شرعی مسائل اور ان کے احکام کی تحقیق میں لگے رہتے اور ہر ایک سے یہی پوچھتے رہتے۔ یہاں تک کہ جب میرا دہلی آنا ہوا تو وہ بھی دہلی آ گئے۔ ایک روز راستے میں ملاقات ہوئی اور مجھے دیکھ کر بڑی گرم جوشی سے ملے۔ اس کے بعد میری والدہ کا حال پوچھا۔ ان کو میری والدہ کی بیماری کا حال تو معلوم تھا لیکن انتقال کی خبر نہ تھی میں نے کہا کہ والدہ تو اللہ کی رحمت کو پیاری ہوئیں۔ بولے تم سلامت رہو۔

اس قصے کے دوران ایک جوالقی (ملنگ) آیا اور نامناسب باتیں کرنے لگا جو اس مجلس میں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ خواجہ ذکرہ اللہ بالخیرؒ نے کچھ نہیں کہا اور جو توقع اس کی تھی اس کو پورا کیا۔ اس کے بعد حاضرین سے مخاطب ہو کر ارشاد کیا کہ ایسی باتیں بھی ہونی چاہییں۔ بہت سے لوگ آتے ہیں اور سر قدموں میں رکھتے ہیں۔ نذر لاتے ہیں پس اس طرح کے لوگ بھی آنے چاہییں کہ آ کر بے باکی سے جو چاہیے کہہ ڈالیں۔ اس طرح یہ چیزیں ان چیزوں کا کفارہ (کرنے والی) ہو جاتی ہیں۔

عوامی اذیتوں کی مصلحت:

شیخ علیہ الرحمہ نے عوام کے ہاتھوں پہنچنے والی اذیتوں کی مصلحت پر روشنی ڈالی اور کہا جس کا مطلب یہ ہے عقیدت مندوں کی عقیدت سے نفس کے اندر جو کبر و غرور کا شایبہ پیدا ہو جاتا ہے یہ گستاخیاں اس اثر کو دور کر دیتی ہیں اور ان کم زوریوں کے لیے کفارہ بن جاتی ہیں۔

یہ تصور اہل اللہ کے ہاں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور لوگوں کے ہاتھوں پہنچنے والی اذیتوں کو برداشت کرنے کی نفس میں طاقت پیدا کر دیتا ہے، پھر وہ مقربین بارگاہ الٰہی ان تکلیفوں کا خدا کی جناب میں شکوہ کرنے کے بجائے اپنے گناہوں کی معافی کے

طلب گار رہتے ہیں جو عبدیت کی حقیقی روح ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے:

اَلْمُسْلِمُ يُخَالِطُ النَّاسَ وَيَصْبِرُ عَلٰى اَذَاهُمْ اَفْضَلُ مِنَ الَّذِىْ لَا يُخَالِطُهُمْ وَلَا يَصْبِرُ عَلٰى اَذَاهُمْ.

(مشکوٰۃ: ۴۳۲)

”وہ مسلمان جو لوگوں کے ساتھ ملا جلا رہتا ہے اور ان سے پہنچنے والی اذیتوں پر صبر کرتا ہے وہ اس مسلمان سے افضل ہے جو اذیتوں سے گھبرا کر لوگوں سے میل جول نہیں رکھتا۔“

امام احمد ابن حنبلؒ کی دعا:

مشہور محدث ابن خزیمہ کہتے ہیں کہ میں نے امام احمدؒ کو خواب میں دیکھا اور پوچھا۔ آپ کے ساتھ خدا کا معاملہ کیا رہا؟ جواب میں امام محترم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اپنا فضل وکرم فرمایا اور مجھے سونے کی جوتیاں پہنائیں اور فرمایا اے احمد! ہم نے تم پر یہ انعام واکرام اس لیے کیا کہ تم نے میرے کلام کے مخلوق ہونے سے انکار کیا اور سخت تکلیفیں اٹھائیں۔ اے احمد! تم مجھ سے وہی دعا مانگو جو تمہیں سفیان ثوریؒ سے پہنچی ہے اور تم دنیا میں وہی دعا مجھ سے مانگتے تھے۔

چناں چہ احمد نے یہ دعا مانگی:

يَارَبِّ كُلِّ شَىْءٍ اَسْاَلُكَ بِقُدْرَتِكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ لَاتَسْاَلْنِىْ عَنْ شَىْءٍ وَاغْفِرْلِىْ كُلَّ شَىْءٍ.

(حیوۃ الحیوان: ۲۵۰)

”اے پروردگار ہر شے کے! میں تجھ سے اس قدرت کے وسیلے سے دعا کرتا ہوں جو ہر شے پر حاوی ہے تو مجھ سے کوئی باز پرس نہ کرنا اور میری ہر خطا کو بخش دینا۔“

یہ کمال عبدیت و نیاز مندی کا مقام ہے، دشمنوں کے ظلم کی شکایت نہیں، مالک

الملک سے یہ شکایت نہیں کہ اس نے بے نیازی کیوں اختیار کی؟ حسرت کی زبان میں یہ شکوہ نہیں۔

تیری محفل سے اٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال
دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارہ کردیا

بلکہ یہ التجا ہے کہ میری ہر خطا کو بخش دے اور اپنی باز پرس سے مجھے محفوظ رکھ۔

قبروں پر آیات قرآنی اور ان کی مرمت

شیخ علیہ الرحمہ نے خواجہ حسنؒ کے اس سوال پر کہ
''گورے کہ بر آوردہ مے باشد چوں خراب شود باز عمارت کردن آمدہ است؟''
''جو قبریں بوسیدہ ہو جاتی ہیں دوبارہ ان کی مرمت کرنا کیسا ہے؟''
جواب دیا:
''خیر ہر چہ خراب شود پیش عمارت نباید کرد، ہر چہ اندر اس بیشتر امیدوار رحمت بیشتر۔''
''فرمایا نہیں جو قبر خراب ہو جائے اس کی پھر تعمیر نہیں کرنی چاہیے جس قدر زیادہ فرسودگی ہوگی اسی قدر رحمت کی امید زیادہ ہوگی۔''

پھر شیخ علیہ الرحمہ نے ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو بزرگوں اور پیروں کے قدموں میں دفن ہونا چاہتے ہیں۔

شیخؒ نے اس کے جواب میں مولانا سراج الدین ترمذیؒ کا واقعہ بیان کیا جو بدایوں میں مقیم تھے۔ مولانا نے مکہ معظّمہ کا اس ارادے سے سفر کیا کہ ان کا مدفن مکہ معظّمہ ہی کے اندر بنے۔ مگر وہ واپس آ گئے۔ لوگوں نے وجہ پوچھی، انہوں نے کہا میں نے ایک روز خواب میں دیکھا کہ کچھ مردے مکہ سے باہر لے جائے جارہے ہیں اور کچھ مردے باہر سے مکہ میں لا کر دفن کیے جا رہے ہیں۔

میں نے پوچھا یہ کیا راز ہے؟ مجھے بتایا گیا کہ جو لوگ مکہ میں دفن کر دیے گئے تھے مگر وہ اس قابل نہیں تھے کہ ان کی قبریں یہاں بنیں انھیں باہر لے جایا جارہا ہے اور جو اس سرزمین کے قابل تھے مگر یہاں نہیں آ سکے تھے انھیں باہر سے یہاں لا کر دفن کیا

جارہا ہے۔

یہ خواب دیکھ کر میں بدایوں واپس آ گیا کہ اگر خدا تعالیٰ مجھے اس قابل سمجھے گا تو میرا مقصد خود حاصل ہو جائے گا۔ (جلد ۴، مجلس ۶۷، صفحہ ۹۱۵)

شیخ علیہ الرحمہ نے حسب معمول اپنے طرف سے کچھ فرمانے کے بجائے ایک بزرگ کا واقعہ بیان کر دیا اور اس واقعے کے حوالے سے بتا دیا کہ کسی کے قدموں میں اور کسی کے پہلو میں دفن ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ انسان کے پاس اپنے ایمان و عمل کا سامان ہونا چاہیے۔

ایک مجلس میں مُردوں کے لیے دعا کرنے کا ذکر ہوا۔ خواجہ حسنؒ نے سوال کیا:

''بر تربت ہا قرآن و دعاے مے نویسند چگونہ است؟ فرمود کہ
نمے باید نبشت و بر جامہ کفن نیز نمے باید نبشت۔''

''فرمایا: قبروں پر قرآن کریم کی آیات نہیں لکھنی چاہییں اور نہ کفن کے کپڑوں پر قرآنی آیات لکھنی چاہییں۔'' (جلد ۵، مجلس ۵، صفحہ ۹۹۵)

خواجہؒ نے صرف قبروں پر آیات قرآنی لکھنے (کندہ کرنے) کے بارے میں سوال کیا تھا، شیخؒ نے اس کے ساتھ کفن کے اوپر لکھنے کی بھی ممانعت کر دی۔

اس سلسلے میں شیخ علیہ الرحمہ کے سامنے حضرت جابرؓ کی یہ حدیث ہے:

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّجَصَّصَ الْقُبُوْرُ وَاَنْ يُّكْتَبَ عَلَيْهَا وَاَنْ تُوْطَاَ. (مشکوٰۃ:۱۴۸ ترمذی)

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو پختہ کرنے کی ممانعت فرمائی اور اس بات کی ممانعت کی کہ قبروں پر کچھ لکھا جائے اور قبروں کو پیروں سے روندا جائے۔''

حضرت جابرؓ کی روایت جسے مسلم نے روایت کیا ہے اس طرح ہے۔

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّجَصَّصَ الْقُبُوْرُ وَاَنْ يُّبْنٰى عَلَيْهِ وَاَنْ يُّقْعَدَ عَلَيْهِ.

(مشکوٰۃ:۱۴۸ ترمذی)

''حضور علیہ السلام نے قبر کو پکا کرنے، اس پر کوئی تعمیر کرنے اور اس پر بیٹھنے کی ممانعت فرمائی۔''

قبروں کو پختہ کرنے کی ممانعت کی وجہ شیخ محدث دہلویؒ نے لمعات شرح مشکوٰۃ میں یہ تحریر کی ہے:

فِيْهِ مِنَ الزِّيْنَةِ وَالتَّكَلُّفِ.

''اس میں قبروں کی زینت اور تکلف ہے۔''

حضرت قاسم ابن محمد ابن ابی بکرؓ اور سفیان تمارؒ تابعیؒ نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دونوں رفیقوں کی آرام گاہوں کی زیارت کی اور وہ ''مسنّم'' کوہان نما تھیں۔

شیخ دہلویؒ لکھتے ہیں قبر کے بارے میں سنت یہ ہے کہ وہ زمین سے ایک بالشت بلند اور کوہان نما ہو۔ ابن حبانؒ نے روضہ مبارک کی آرام گاہوں کی یہی شکل لکھی ہے۔
(لمعات کتاب الجنائز)

قاسم ابن محمدؒ کے الفاظ یہ بھی ہیں۔

مَبْطُوْحَةٌ بِبَطْحَآءِ الْعَرْصَةِ الْحَمْرَآءِ.

''یعنی ان تینوں آرام گاہوں پر وادی مکہ کی سرخ کنکریاں بچھی ہوئی تھیں۔''

اب کچی قبروں کی مرمت کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام حسن بصریؒ کچی قبروں پر مٹی لیپنے (تطیین) کو جائز قرار دیتے تھے۔ امام شافعیؒ استحباب کے قائل ہیں اور مشہور صوفی حضرت معروف کرخیؒ (بغداد میں آرام فرما ہیں راقم نے ان کی آرام گاہ کی زیارت کی ہے) اس سے اختلاف کرتے تھے۔ مٹی سے لپائی کرنے کی اباحت اس حدیث سے ثابت ہے جسے حضرت جابرؓ سے نقل کیا گیا ہے:

رُشَّ قَبْرُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ الَّذِيْ رَشَّ الْمَآءَ عَلٰى قَبْرِهٖ بِلَالُ ابْنُ رَبَاحٍ بِقِرْبَةٍ بَدَأَ مِنْ قِبَلِ رَأْسِهٖ حَتّٰى اِنْتَهٰى اِلٰى رِجْلَيْهِ. (مشکوٰۃ:۱۴۹ بحوالہ بیہقی)

"رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی آرام گاہ پر پر حضرت بلال ابن رباحؓ
نے مشکیزہ سے پانی چھڑکا اور سرہانے سے قدموں تک ایسا کیا۔"

شیخ محدثؒ لکھتے ہیں **بان یمسک تراب القبر عن الانتشار ویمنع الدروس.** تاکہ پانی سے مٹی جم جائے اور قبر مبارک منور و محفوظ رہے۔ قاسم ابن محمدؒ کے بیان میں یہ بھی ہے کہ روضہ مبارک کے تینوں مزارات پر وادی مکہ کی سرخ کنکریاں بچھی ہوئی تھیں۔

یہ سرخ رنگ کی کنکریاں مسجد نبوی کے صحن میں بھی بچھائی جاتی تھی اب نہیں معلوم کہ کیا صورت ہے۔

قبر کو بالکل مٹنے اور بے نشان ہونے سے بچانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل ایک قوی دلیل ہے کہ آپ نے مشہور بلند مرتبہ صحابی حضرت عثمان ابن مظعونؓ (جن کا صحابہ میں زہد مشہور تھا) کی قبر کے سرہانے ایک بھاری پتھر کھڑا کیا اور وہ پتھر آپ خود اپنے مبارک ہاتھوں سے اٹھا کر لائے اور زبان مبارک سے یہ الفاظ فرمائے:

اَعْلَمُ بِهَا قَبْرَ اَخِیْ وَاَدْفَنُ اِلَیْهِ مَنْ مَّاتَ مِنْ اَهْلِیْ.

(بہ حوالہ ابوداؤد مشکوٰۃ:۱۴۹)

"میں اس پتھر کے ذریعے اپنے بھائی کی قبر پر نشان کھڑا کر رہا ہوں اور میرے گھر والوں میں سے جو وفات پائے گا اسے میں عثمان کی قبر کے پہلو میں دفن کروں گا۔"

حضرت عثمانؓ وہ پہلے مہاجر ہیں جو مدینہ میں فوت ہوئے اور بقیع میں دفن کیے گئے۔

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ اس مصلحت کو ترجیح دیتے تھے کہ حدیث پاک میں یہ بھی آیا ہے کہ جس مومن کی قبر بے نشان ہو جائے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی مغفرت کر دی گئی۔

شیخ محبوب الٰہی علیہ الرحمہ اسی مصلحت کو ترجیح دیتے تھے۔

خواجہ کرخیؒ کے مزار کا کتبہ:

خواجہ معروف کرخی علیہ الرحمہ کا مزار بغداد میں قبرستان قدیم کے ایک تہ خانے میں واقع ہے جہاں ایک چھوٹی سی کنویاں ہے، جس کا پانی کچھ میٹھا اور کچھ کھاری ہے۔ اسی تہ خانے میں خواجہ کرخیؒ نے ساری زندگی گزاری۔ زائرین اس کنویاں میں سے پانی پیتے ہیں، پانی بہت ٹھنڈا ہے اور سینکڑوں سال سے برابر اس کا فیض جاری ہے، اس عاجز کو بھی وہ متبرک پانی پینے کی سعادت حاصل ہوئی۔

مزار پر ایک مطبوعہ کتبہ لگا ہوا ہے جو شیخؒ نے خواب میں کسی اپنے معتقد کو بتایا تھا۔ کسی نے سوال کیا۔ **مَاصَنَعَ اللّٰهُ بِکَ؟** اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا۔ شیخؒ صاحب نے جواب میں عربی کا یہ شعر پڑھا ؎

موت التقی لا انقطاع لها
قدمات قوم و هم فی الناس احیاء

"متقی کی زندگی ایسی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی، لوگ مر جاتے ہیں اور وہ لوگوں میں زندہ رہتے ہیں۔"

اسی تصور کے تحت شیخ کرخیؒ قبروں کے نشانات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے کیوں کہ وہ زندگی کا نشان تقویٰ کو قرار دیتے تھے۔ تقویٰ اصل زندگی ہے جو جسم کے چھپ جانے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔

عیال داری کی زندگی پر شیخؒ کا تبصرہ:

شیخ علیہ الرحمہ نے تجرد و تبتل کی زندگی گزاری اور شادی نہیں کی اور یہ شیخ کی اپنی ذاتی خصوصیت تھی۔ حدیث نبوی میں نکاح کے لیے اسباب نکاح کی استطاعت رکھنے کی شرط لگائی گئی ہے۔ حدیث یہ ہے۔

یَامَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْکُمُ الْبَاءَةَ فَلْیَتَزَوَّجْ
فَاِنَّهُ اَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَاَحْسَنُ لِلْفَرَجِ وَمَنْ لَمْ یَسْتَطِعْ
فَعَلَیْهِ بِالصَّوْمِ فَاِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ. (مشکوٰۃ:۲۶۷ متفق علیہ)

"اے جوانو! تم میں سے جو شخص نکاح کے وسائل کی طاقت رکھتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ شادی کرلے اور جو شخص طاقت نہیں رکھتا تو وہ روزہ رکھے، بے شک روزہ نفسانی خواہش کو توڑتا ہے۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد گرامی میں بڑی بلاغت سے کام لیا ہے، باء کی طاقت کو شرط قرار دیا ہے، عربی میں باء کے معنی کسی مکان میں قیام کرنا آتے ہیں اور پھر یہ لفظ عقد نکاح کے لیے کنایۃً ہوگیا اور اس سے نکاح کے وسائل قوت جماع اور مہر اور نفقہ مراد لیے جانے لگے۔

اَیْ مُؤْنَۃِ الْبَآءُ مِنَ الْمَھْرِ وَالنَّفَقَۃِ.

"یعنی عقد نکاح کا بوجھ، مہر اور نفقہ اٹھانے کی طاقت رکھتا ہو۔"

باء کا لفظ کئی طرح استعمال ہوتا ہے۔ باہ ہا کے ساتھ بھی آتا ہے جس کے معنی قوت جماع کے ہیں لیکن اہل زبان کے نزدیک باء ہمزہ کے ساتھ فصیح تر ہے، اور حدیث میں یہی لفظ آیا ہے جس کے معنی قیام کرنے کے ہیں۔ کچھ لوگ حدیث کے اس لفظ کا ترجمہ قوۃ جماع کرتے ہیں لیکن اس سے دوسرے فقرے کا تعلق قایم نہیں رہتا کیوں کہ جس میں جماع کی قوت ہی نہیں تو اسے روزہ رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

حاصل یہ کہ نکاح کے لیے وسائل نکاح جس میں قوۃ جماع، مہر اور نان نفقہ شامل ہیں، کا ہونا شرط ہے۔

شیخ محبوب الٰہی علیہ الرحمہ ایک پابند شریعت زندگی کے مالک تھے، آپ نے ذاتی طور پر اپنے لیے تجرد کی زندگی پسند فرمائی کیوں کہ آپ تجرد کی زندگی میں بھی خواہشات نفسانی پر کنٹرول رکھنے اور ضبط نفس کی قدرت پر اعتماد رکھتے تھے مگر آپ نے عام مسلمانوں کو عیال داری کی مسنون زندگی اختیار کرنے کا مشورہ دیا اور اس کے فایدے بیان فرمائے۔

مجلس ۴۸، جلد دوم میں گذر چکا ہے کہ آپ نے نفسانی وسوسوں کا علاج بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"یک خیریت مرد متاہل ایں است۔"

"عیال دار آدمی کی زندگی میں ایک خیر و بھلائی یہ ہے۔"

اور جب خواجہ حسن علیہ الرحمہ کے خادم ملیحؒ نے اپنی بیٹی کے نکاح کی شیرینی پیش کی تو آپ نے لڑکیوں کی پرورش کرنے کی فضیلت بیان فرمائی۔

کیا صوفیائے ہند مسلم حکم رانوں کے ایجنٹ تھے؟

مسلم حکم رانوں کے خلاف نفرت انگیز جھوٹا پروپگنڈہ قدیم تاریخی مسجدوں کے قانونی وجود کو خطرہ میں ڈال چکا ہے۔ اسی طرح صوفیائے ہند کے بارے میں مسلم حملہ آوروں کے فوجی اقدامات میں شرکت کے مسلسل جھوٹے پروپگنڈے سے صوفیائے کبار کی تاریخی درگاہیں خطرے میں پڑتی نظر آ رہی ہیں۔

سنگھ پریوار کے ترجمان اخبارات و رسائل اس طرح کے سفید جھوٹ اور بے شرمانہ پروپگنڈے سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ بعض مسلمان اہلِ قلم نے صوفیائے کرام کے بارے میں اس قسم کی باتیں تحریر کر دی ہیں جن سے فرقہ پرست اہل قلم فایدہ اٹھا رہے ہیں۔

ان مورخین میں مشہور ترقی پسند مورخ ڈاکٹر محمد اشرف مرحوم ہیں جنھوں نے اپنے ایک تاریخی طویل مضمون (عوامی تحریکیں) میں حضرات صوفیا کو سلاطین ہند کا لشکر دعا قرار دیا ہے۔

اسی طرح لکھنو کے مشہور دینی ماہنامہ (الفرقان جنوری ۱۹۹۳ء) میں مدیر صاحب نے اپنے اداریے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ چشتی صوفیا مسلمان حملہ آوروں کی فوجوں میں شامل ہو کر ہندوستان آتے رہے۔ اور اس سلسلے میں مدیر صاحب نے حضرت خواجہ بزرگ اجمیریؒ کا اسم گرامی شامل کیا۔

اور اس غلط تاریخی تصور سے متاثر ہونے کی نہایت افسوس ناک مثال یہ ہے کہ جنگ آزادی کے مشہور عالم رہنما مولانا محمد میاں صاحبؒ ناظم جمعیۃ العلماء الہند نے اپنی مقبول عام کتاب علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد دوم میں بھی ایسا ہی کچھ لکھا ہے۔

مدیر الفرقان لکھنؤ نے اپنے اس خود ساختہ تصور کو اہل دین اور اہل سیاست کے درمیان دانستہ تقسیم کار کے اصول کا نام دیا ہے اور اس کا آغاز حضرت امام حسنؓ اور امیر

معاویہؓ کی باہمی صلح کے ساتھ قایم کیا ہے۔

تاریخ کے اس مفروضہ تصور سے آج کے فرقہ پرستوں نے بڑا فایدہ اٹھایا ہے۔
اس لیے صوفیائے ہند کی زندگی کے اس پہلو کا گہرائی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور فرقہ پرستوں کو مسلمان اہل قلم کی جن تحریروں سے فایدہ اٹھانے کا موقع مل رہا ہے ان کا تاریخی تجزیہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اگرچہ فرقہ پرستوں کو ابھی تک اس میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔

کیوں کہ اس طبقے کی بے مثال قربانیاں (زہد و تقویٰ، ایثار و خدمت) اتنی گہری جڑیں رکھتی ہیں کہ اس مکروہ اور بے بنیاد پروپگنڈے سے وہ بے اثر نہیں ہو سکتیں۔

قرآن کریم نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا تھا:

اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کا ہر آنے والا دور گذرے ہوئے دور سے بہتر ہوگا۔

یہ وعدہ الٰہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطے سے آپ کے تمام جانشینوں (علمائے حق اور صوفیائے ربانی) کے ساتھ ہے۔

صوفیائے کرام داعیان اسلام تھے:

ان صوفیائے کبار کو ڈاکٹر آرنلڈ تھامس نے پریچنگ آف اسلام میں داعیان اسلام لکھا ہے اور ہندوستان میں اشاعت اسلام کو انھی بزرگوں کی اخلاقی اور روحانی طاقت وتصرف کا ثمرہ قرار دیا ہے، جن میں حضرت شیخ جلال الدین مخدوم جہانیاںؒ (گجرات)، شیخ محمد اسماعیل بخاریؒ (لاہور)، خواجہ معین الدین چشتیؒ (اجمیر) خواجہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، حضرت بابا فرید شکر گنجؒ (پنجاب)، حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ (پانی پت)، شیخ جلال الدین ایرانیؒ (سلہٹ آسام) کے اسمائے گرامی کی تصریح کی ہے۔
(دعوت اسلام: ۲۲۶)

اسلام پسندوں کا خیال:

اسلام پسندوں کے نام سے سیاسی اسلام کے علم بردار طبقے کو یاد کیا جاتا ہے، یہ

طبقہ تصوف اور صوفیا کی مخالفت میں توہب وسلفیت کا شکار ہو گیا ہے۔

علی گڑھ سے اس جماعت کا ایک سہ ماہی رسالہ تحقیقات اسلامی کے نام سے شایع ہوتا ہے۔ اس پرچے کی ایک اشاعت (جنوری ۱۹۹۲ء) میں صوفیائے کرام کے بارے میں ڈاکٹر تھامس کی کتاب مذکور کو انگریزوں کی سازش قرار دیا گیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ مسلمانوں کے اندر سے جوش جہاد نکالنے اور انھیں کرامات صوفیا کی طرف لگانے کی غرض سے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

حالاں کہ اس کتاب کے اصل محرک سر سید تھے اور سر سید نہ صرف کرامات اولیا کے بلکہ معجزات انبیا کے بھی منکر تھے۔

ان اسلام پسندوں کو پچھلی پچاس ساٹھ سالہ جدوجہد کی ناکامی کے بعد یہ تجربہ ہو گیا ہے اور اس گروہ کے قایدین اعتراف کر رہے ہیں کہ اسلام کے روحانی اور عرفانی نظام سے الگ رہ کر خالی اسلام کے سیاسی پہلو کو غالب کرنے کی جدوجہد ایک ناکام جدوجہد ثابت ہوئی ہے۔

مضمون نگار صاحب نے حضرت اجمیریؒ کے بارے میں مشہور تاریخی روایات کے خلاف یہ لکھا ہے کہ خواجہ بزرگؒ اس وقت اجمیر میں تشریف لائے جب اجمیر میں مسلم حکومت ہو چکی تھی اور اسلام کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

حالاں کہ اس سلسلے میں سیر الاولیاء کی روایت ہی کو معتبر مانا جا سکتا ہے جو حضرت سلطان المشائخ علیہ الرحمہ کے ملفوظات اور آپ کے مشائخ و مریدین کے حالات پر امیر خورد کی تالیف ہے۔ اس روایت میں حضرت خواجہ بزرگؒ کی اجمیر میں تشریف آوری پتھورا کے عہد میں بیان کی گئی ہے۔

اسی روایت میں رائے پتھورا کے زوال کا یہ سبب بیان کیا گیا ہے کہ

آپ نے ایک مسلمان پر ظلم و زیادتی کرنے پر پتھورا کے حق میں بددعا کی، جب وہ بار بار آپ کی درخواست پر بھی اپنے ظلم سے باز نہیں آیا اور پھر آپ کی بددعا سے سلطان معز الدین غزنوی کے مقابلے میں گرفتار ہو گیا۔

یہاں سے کتاب کے آخر تک اضافہ ہے جو حضرت مصنف مدظلہم نے کیا ہے اور ہماری سعادت کہ یہ اضافہ پاکستانی ایڈیشن میں کرنے کے لیے حضرت نے بھیجا۔ ہم اس کے لیے حضرت کے ممنون ہیں۔ (شریفی)

صوفیائے ربانی میں
حضرت شیخ المشائخؒ
کا مقام و مرتبہ

صوفیائے چشت میں حضرت خواجہ محبوب الٰہی سلطان نظام الدین اولیاءؒ قرآن و حدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔

ان کے شیخ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر علیہ الرحمہ اپنے اس بلند پایہ مرید کو مولانا نظام الدین کہہ کر آواز دیتے تھے۔

شہرت کے لحاظ سے حضرت محبوب الٰہیؒ کو صوفی کہا جاتا ہے، یہ صوفیائے ربانی میں بڑے اونچے مرتبے کے مالک تھے۔

ایک روز حضرت محبوب الٰہیؒ کی طبیعت خراب تھی، بخار میں مبتلا تھے دل بہلانے اور اپنا غم غلط کرنے کے لیے اپنے خاص مریدوں کو اپنے پاس بلایا اور ان سے فرمایا، تم لوگوں پر زندگی میں جو جو خاص تکلیفیں گزری ہیں اور تم نے جو خاص دکھ اُٹھائے ہیں وہ بیان کرو۔

ان مریدوں میں امیر خسروؒ، خواجہ محمدؒ، سید رفیع الدین ہارونؒ اور آپ کا عقیدت مند ہردیو، یہ لوگ شامل تھے۔

ہردیو، علاء الدین خلجی کی فوج میں ملازم تھا، خلجی ایک سخت مزاج مسلم حکمراں تھا، ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتا تھا، اس کے ہاتھوں ہردیو اور اس کے بال بچوں کو بھی تکلیفیں

اٹھانی پڑی تھیں۔

حکومتی طاقت و سیاست کے ستائے ہوئے لوگ ہندو ہوں یا مسلمان۔ اسی درویش کے سایۂ عاطفت میں پناہ لیتے تھے اور یہ درویش ان مظلوموں کو اپنے سینے سے لگاتا تھا۔

ہردیو بھی انھی دکھی لوگوں میں سے تھا۔ چناں چہ ہردیو نے اپنی زندگی کی وہ دکھ بھری کہانی اپنے شفیق شیخ کو سنائی، شیخ علیہ الرحمہ نے وہ دکھ بھری داستان سنی اور ہردیو کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

ہردیو کو نصیحت:

"اے ہردیو! اس زندگی میں دکھ اور مصیبتیں اس لیے آتی ہیں کہ انسان زندگی کی راحتوں اور اچھے وقت کو یاد رکھے اور سکھ اور راحت کی کثرت میں خدا کو نہ بھول جائے، اور دولت وحشمت کا غرور اس پر طاری نہ ہوجائے۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ نے قرآن کریم کے اس پیغام کی طرف اشارہ کیا، سورۂ حدید میں فرمایا:

لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ (حدید:۲۳)

"اے لوگو! قضا وقدر کی اس حقیقت پر نظر رکھو کہ ہر تکلیف وراحت خدا کی طرف سے ہے۔"

تقدیر کا یہ عقیدہ تمھیں مصیبت کی حالت میں مایوسی سے بچائے گا اور راحت کی حالت میں تکبر وغرور سے محفوظ رکھے گا۔

یہ تقدیر کا اخلاقی فلسفہ ہے — اردو شاعر کہتا ہے ؎

ہر چند چاہتا ہوں کہ شکرِ خدا کروں — فرصت نہ ہووے خندہ سے لب گو تو کیا کروں
مقامِ شکر ہے غافل، مصیبت دنیا — اسی بہانے سے اللہ یاد آتا ہے

خواجہ محمدؒ کی داستان غم!:

خواجہ محمدؒ نے اپنی داستانِ غم سناتے ہوئے کہا کہ میری ماں اور میرے نانا مجھے چھوڑ کر خدا کو پیارے ہوگئے، یہ میرے لیے بڑے دکھ کی بات تھی، مگر مجھے حضرت خواجہؒ کے دامنِ محبت میں پناہ مل گئی۔

حضرتؒ نے خواجہ محمدؒ سے فرمایا:

"اے محمد! اس دنیا مین جب ہر طرف سے انسان بے سہارا ہوجاتا ہے اور اس کے تمام رشتے ٹوٹ جاتے ہیں تو خداوند عالم اسے ایک ایسا سہارا عطا کردیتا ہے جو ساری مشکلات کو آسان کردیتا ہے۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ نے خواجہ محمدؒ کے ذہن میں یہ بات ڈالی کہ میرا دامن شفقت خدا تعالیٰ ہی کی مہربانی سے تجھے نصیب ہوا، یہ سہارا بھی خدا تعالیٰ ہی کی دین ہے، اسی کے کرم پر اپنی نظر رکھ، اسباب پر بھروسہ نہ کر۔

شیخؒ نے خواجہ محمدؒ کو قرآن کریم کی اس اعلانِ حقیقت کی طرف متوجہ کیا:

۱۔ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

(انعام:۱۷)

۲۔ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (یونس:۱۰۷)

"اللہ تعالیٰ، اے مخاطب! اگر تجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو اسے کوئی دوسری طاقت دور کرنے والی نہیں اور اگر وہ بھلائی سے ہم کنار کرنا چاہے تو اس خیر اور بھلائی کو کوئی روکنے والا نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ہر بات کی قدرت رکھتا ہے۔

وہ اپنے فضل وکرم سے (اپنی مصلحت عامہ) کے مطابق اپنے بندوں میں جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے، وہی حقیقت میں بخشنے والا مہربان ہے۔"

خواہشاتِ نفس کا حملہ سب سے بڑا دکھ:

سید رفیع الدین ہارونؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کو اپنے بے دکھی ہونے اور راحت کے ساتھ زندگی گذارنے کی داستان سناتے ہوئے کہا:

حضرت! میں تو جب سے آپ کی محبت کے سایے میں آیا ہوں مجھے کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی، آپ کی نظر عنایت سے راحت ہی راحت ہے۔

پھر میں اپنے کون سے دکھ کا اظہار کروں؟

شیخؒ نے فرمایا:

''رفیع الدین! بات یہ نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ تو نوجوان ہے اور نوجوانی کی عمر میں خواہشات نفس کے حملے کا ہر وقت خطرہ رہتا ہے، اس خطرے سے اپنے آپ کو بچانے اور محفوظ رکھنے کا خیال ایک نوجوان کو اس درجے پختہ اور پکا رکھنا چاہیے کہ وہ پکا خیال اس کے لیے مستقل پریشانی اور مستقل دکھ بن جائے۔ راحت اور سکھ آرام کی کیسی ہی حالت ہو، اس پریشانی اور اس دکھ سے ایک لحہ خالی نہ رہے۔''

شیخ علیہ الرحمہ نے اپنے مرید کو ایک بڑے خطرناک خطرے سے آگاہ کیا اور وہ خطرناک پوشیدہ خطرہ یہ ہے کہ کوئی مرید کسی بڑے سے بڑے پیر کے سایۂ شفقت میں آکر اور اس کے حلقۂ مریدین میں شامل ہو کر اپنے آپ کو خواہشات نفس کی ترغیبات کے حملے سے اور شیطانی اثرات سے محفوظ اور مطمئن نہ سمجھے، اور شیخ طریقت کی نظر التفات و کرم کا خیال اسے غلط فہمی میں نہ ڈال دے کہ اب میں فلاں شیخ کے دامن سے وابستہ ہو کر محفوظ ہو گیا، بلکہ اس مرید کو اب زیادہ ہوشیار رہنے اور زیادہ فکر مند رہنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ شیطان اسے بے فکر دیکھ کر اسے بے راہ کرنے کی فکر و جستجو میں زیادہ رہے گا اور یہ بے فکری اسے نقصان دے گی۔

خاندان ولی اللّٰہی کے شیخ طریقت شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلویؒ قادری سلسلے کے بڑے صاحبِ نسبت بزرگ تھے۔ شاہ ابوالعدل صاحب قادریؒ سے بیعت تھے۔

شاہ صاحبؒ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے تذکرے میں اس خطرے کی طرف آگاہ کرتے ہوئے سورۂ مائدہ (۱۰۹) پر ایک تشریحی حاشیہ لکھا، آیت یہ ہے:

یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَاعِلْمَ لَنَا اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ O

''جس دن (یعنی قیامت میں) اللہ تعالیٰ تمام رسولوں کو جمع کرے گا اور ان سے پوچھے گا کہ اے رسولانِ کرام! تمھیں اپنی اپنی امتوں کی طرف سے پیغام حق پہنچانے پر کیا جواب ملا؟

حضرات انبیائے کرم جواب دیں گے، الٰہی! ہمیں اس کی خبر نہیں، بلاشبہ تو ہی پوشیدہ باتوں کو خوب جانتا ہے۔''

شاہ صاحبؒ تشریح کرتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ حضرات انبیا سے یہ سوال منکرینِ حق کو سنانے اور انھیں ہوشیار کرنے کی غرض سے کرے گا۔ حضرات انبیا لاعلمی کا اظہار کریں گے۔ کیوں کہ حضرات انبیا دل کی باتوں سے بے خبر تھے، لوگوں کے ظاہری قول (ایمان یا کفر) سے باخبر تھے، اس لیے ان رسولانِ کرام نے اپنی اپنی امتوں کے جواب کو علم الٰہی کے حوالے کر دیا، وہی دل کی باتوں کو جانتا ہے۔'' (خلاصہ)

پھر شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''یہ ان کو سنایا جو مغرور ہیں۔ پیغمبروں کی شفاعت پر، تا معلوم کریں کہ اللہ تعالیٰ کے آگے کوئی کسی کے دل پر گواہی نہیں دیتا اور کوئی کسی کی شفاعت نہیں کرتا۔'' (مستند موضح القرآن: ۱۶۲)

یعنی شفاعت تو اسی کے حق میں ہوگی جس کے دل میں ایمان ہوگا اور دل کا ایمان اللہ کے علم میں ہے، وہ اپنے علم کے مطابق جس بندے کے حق میں شفاعت کی اجازت دے گا حضرات انبیا اسی کی شفاعت کریں گے۔

ا۔ لَا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَـهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا۔ (نباء:۳۸)

۲۔ یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا O (طٰہٰ:۱۰۹)

پہلی آیت میں بلا اجازت شفاعت کے لیے زبان کھولنے کی بھی نفی کی گئی ہے، وسری آیت میں کہا گیا ہے کہ بالفرض اگر کوئی شافع بے محل زبان کھولے گا بھی تو اس ی سفارش بے سود رہے گی۔

دونوں آیتوں میں آخر کے دونوں فقرے () تاکید کے طور پر لائے گے ہیں۔ کیوں کہ جو شفاعت اجازتِ حق (بالاذن) ہوگی وہ صحیح وصواب بھی ہوگی اور خدا کی سندیدہ بھی ہوگی۔

میر خسروؒ کی داستانِ غم:

امیر خسروؒ نے اپنے محبوب شیخ کو اپنی داستانِ غم سناتے ہوئے کہا:

حضرت مخدومؒ (محبوب الٰہیؒ) نے میری درخواست کو شرف قبولیت عطا کر کے یرے نانا کے مکان میں قیام کرنے منظور کر لیا تھا۔

میرے نانا جب دلّی سے چلے گئے تو میرے ماموں نے اپنا مکان خالی کرا لیا اور خدوم کو اس زحمت اُٹھانی پڑی۔

یہ زحمت میری زندگی کی سب سے بڑی تکلیف ثابت ہوئی۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے جب امیر خسروؒ کی یہ بات سنی تو پلنگ سے اُٹھ کر بیٹھ گئے، اور ہنس کر امیر خسروؒ سے فرمایا:

خسرو! تیرے ماموں نے جو فعل کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سب کو اپنے خانۂ تن سے اپنی خواہشات کو نکال دینا چاہیے۔

خسرو! تیرے ماموں نے اپنے مکان سے مجھے نہیں نکالا، بلکہ میرے اس غرور و گھمنڈ کو میرے دل سے نکالا جو غرور لوگوں کے ہاتھ پاؤں چومنے سے میرے دل

میں پیدا ہو رہا تھا۔

معتقد لوگ آتے ہیں اور میرے ہاتھ پیر چومتے ہیں اور اس وقت میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ میں وہی تو ہوں جس کو خسرو کے ماموں نے اپنے گھر سے نکالا تھا۔

یہ خیال آتے ہی میرے نفس کی اصلاح ہو جاتی ہے۔

پھر اے خسرو! تو اس واقعے پر افسوس کیوں کرتا ہے، جب مجھے افسوس نہیں ہوتا۔ تیرے ماموں کا مجھ پر وہ احسان تھا کہ مجھے اس نے اپنے گھر سے نکالا۔

سچا صوفی عقیدت کے فتنے سے بچتا ہے:

سچا صوفی اپنے نقاد اور نکتہ چیں کی قدر کرتا ہے، کیوں کہ وہ اپنے ساتھ ہونے والی عقیدت کو بیلنس میں رکھتا ہے تا کہ اہلِ عقیدت اپنی عقیدت سے صوفی اور شیخِ طریقت کو غفلت میں نہ ڈال دے— جو صوفیا کے حق میں بڑا فتنہ ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اہلِ عداوت کی حاسدانہ عداوت کو برداشت کرنا صوفیانہ عاجزی کی بات ہے لیکن یہ اخلاقی صفت ایک صوفی ربانی کی عقل مندی اور ہوش مندی پر بھی دلالت کرتی ہے۔

ایک عارف صوفی اہلِ عقیدت کو عقیدت کے اظہار میں غلو اور زیادتی سے روکتا ہے مگر پھر بھی عوام کی بے جا عقیدت سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔ البتہ وہ اس کی اصلاح اپنے حاسدوں کی برائی سے کرتا ہے۔

حاسدوں کی برائی صوفی کو اپنی حقیقی بے کسی اور عبدیت کے عرفان پر قائم رکھتی ہے۔

بادشاہوں کی شان و شوکت ظاہری اور عارضی ہوتی ہے، یہ طبقہ اپنی ظاہری شان و شوکت کے اظہار کی غرض سے اپنی شان میں مدح سرائی اور تملق کو پسند کرتا ہے، بہ خلاف صوفیائے کرام کے، جن کی عظمت دلوں میں ہوتی ہے۔

شاہ ابوالمعالیؒ کا واقعہ:

شاہ ابوالمعالیؒ (۱۱۱۲ھ) کا واقعہ ہے کہ ان کا پڑوسی ان کی مقبولیت کو دیکھ کر ان سے بہت جلتا تھا اور حسد کی آگ میں جلتا بھنتا رہتا تھا اور شاہ صاحبؒ کی شان میں گستاخیاں کرتا رہتا تھا۔ شاہ صاحبؒ کے خلاف مختلف طریقوں سے مخالفانہ پروپیگنڈہ کرتا رہتا تھا۔

یہ مخالف پڑوسی انتقال کر گیا، شاہ صاحبؒ کو اس کے مرنے سے اس قدر صدمہ ہوا کہ سات، آٹھ دن تک اس کی موت کا سوگ مناتے رہے، نہ کھاتے نہ پیتے اور روتے رہتے۔ مریدین کو بڑی حیرت ہوئی، مریدین خوش تھے کہ ہمارے پیر کا دشمن مر گیا، ایک دشمن سے ہمارے پیر کا پیچھا چھوٹ گیا۔

ان مریدین نے اپنے پیر سے ایک دشمن کے مرنے پر اس قدر سوگ منانے کی وجہ معلوم کی، شیخ نے کہا:

یہ دشمن پڑوسی میرے اعمال نامے کی سیاہی کا غسّالی تھا، یہ میرے داغ دار دامن کا دھوبی تھا، اس نادان کی گالیوں اور برائیوں سے میرے دل کی غفلت اور غلط فہمی دور ہوتی تھی، تم جیسے عقیدت مندوں کی بے جا عقیدت سے میرے دل پر غفلت کا اور اپنی حقیقت کی طرف سے جہل کا جو غبار چھا جاتا تھا وہ اس حاسد پڑوسی کی گستاخیوں سے دور ہو جاتا تھا۔

اب مجھے اس خطرے کی طرف سے زیادہ فکر مند رہنا پڑے گا۔

شاہ ابوالمعالی صاحبؒ انبیٹھ ضلع مظفر نگر میں آرام فرما ہیں۔

صوفیا کی کرامات، روحانی قوت کا مظاہرہ:

حضرات صوفیا کی کرامات پر تعجب و حیرت کرنے والے دراصل ان کی روحانی قوت اور ان کی نفس کشی کی ریاضت سے واقف نہیں ہوتے۔

کرامت ظہور ہے ریاضت کا، خواہشات کو مٹانے کا۔ شاہ ابوالمعالی صاحبؒ کی ایک کرامت مشہور تھی، وہ فرماتے تھے "کلمۂ طیبہ کے دو کلموں، نفی اور اثبات (لا الٰہ-نفی

اور الا اللہ-اثبات) میں موت و حیات کی قوت پوشیدہ ہے، چناں چہ تھانسیر کی ایک مجلس صوفیا میں شاہ ابوالمعالی صاحبؒ نے جب اپنا یہ قول دوہرایا تو اہلِ مجلس نے اس قول اور کلمۂ توحید کی اس قوت کا مشاہدہ کرانے کی درخواست کی۔

شاہ صاحبؒ کھڑے ہوئے اور خانقاہ کے صحن میں بندھی ہوئی ایک گائے کے کان میں لا الٰہ (کلمہ نفی) کی آواز پھونکی، وہ گائے اسی وقت ڈھیر ہو گئی۔

شاہ صاحبؒ نے اس کے بعد اس کے دوسرے کان میں الا اللہ (کلمہ اثبات) کی صدا پھونکی، اس سے وہ گائے زندہ ہو کر کھڑی ہو گئی۔

اہلِ اسباب اور تدبیری نظامِ فطرت پر نظر رکھنے والے اس قسم کی کرامتوں کا مذاق اڑائیں گے، اسے دل لگی سمجھیں گے، لیکن یہ مذاق نہیں ہے بلکہ روحانی قوت کا کرشمہ ہے۔

یہ روحانی قوت خدا تعالیٰ کی عظمت و قدرت پر بہ درجۂ کمال یقین و ایمان سے پیدا ہوتی ہے، صوفیائے ربانی اپنے دل میں غیر اللہ کی عظمت کا شایبہ بھی پیدا نہیں ہونے دیتے۔ اہلِ عقیدت کی عقیدت مندی سے اپنے دل میں اپنی عظمت کا جو تصور پیدا ہوتا اور اپنے اندر عقیدت سے جو تکبر کا شایبہ جنم لیتا وہ اس کا علاج اپنے دشمنوں کی دشمنی اور گستاخیوں سے کرتے تھے۔

آج کے لوگوں نے حضراتِ صوفیائے کبار کی کرامتوں کی نقل اتار کر اور معمولی لوگوں کی طرف کرامت کے واقعات منسوب کر کے کرامتوں کے نام کو بدنام کر رکھا ہے۔ اتفاقات کو کرامت کہہ دیا جاتا ہے، حالاں کہ حیرت انگیز اتفاقیہ واقعات کبھی کبھی بدقماش قسم کے لوگوں سے بھی ظاہر ہوتے ہیں۔

کیا جادو کا تماشا دکھانے والے بازی گر بڑے بڑے حیرت انگیز واقعات کا تماشا نہیں دکھاتے؟ چوہے کو بلی اور بلی کو چوہا بنا کر دکھایا جاتا ہے۔

قدم قدم پر کرامتیں ظاہر نہیں ہوتیں، زندگی بھر کی ریاضتوں اور نفس کشی کی جدو جہد کے نتیجے میں ان حضراتِ اولیا کے ہاتھ پر اِکا دُکا کرامت ظاہر ہوتی تھی ورنہ حضراتِ صوفیا کی عام زندگی ایک عام آدمی جیسی ہوتی تھی۔

حاصل یہ کہ معجزہ نبوت کی قوت کا جلال ہے اور جلالِ نبوت کا ظہور ہے اور کرامت ولایت کی قوت کے جلال کا ظہور ہے۔

اہل دنیا اور اہل باطل کے ہاتھ پر جو خلاف عادت اور فرق عادت واقعات ظاہر ہوتے ہیں انھیں اہل کلام کی اصطلاح میں استدراج کہا جاتا ہے۔

یہ استدراج (شعبدہ بازی) تھا کہ بنی اسرائیل کے سامری نے سونے سے بنی ہوئی گائے بچھیا میں گائے کی آواز (بھائیں بھائیں) پیدا کر کے دکھائی تھی۔

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ. (طٰہٰ:۸۸)

"پھر سامری ان کے لیے ایک بچھیا کی مورت بنا کر نکال لایا جس میں گائے کی سی آواز نکلتی تھی۔"

یہ آواز کیسی تھی؟ مولانا آزادؒ نے لکھا ہے کہ اس بچھیا کی مورت اور اس مجسمے میں ایک ایسی کل اور ایسا پرزہ لگا دیا تھا جس میں سے آواز نکلتی تھی، اس طرح کہ اس مورت میں پیچھے کے سوراخ سے ہوا داخل ہوتی تھی اور منہ کی طرف کے سوراخ سے وہ ہوا خارج ہوتی تھی، یہ ہوا اس پرزے کو حرکت دیتی تھی اور اس میں سے آواز نکلتی تھی۔

اس وقت مصر ایک متمدن ملک تھا، کوئی پس ماندہ جگہ نہ تھی۔

مصر کی جادوگری کیا تھی؟

یہ وہی مصر تھا جس کے جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں اپنی بہترین شعبدہ بازی کا مظاہرہ کیا۔

فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى. (طٰہٰ:۶۶)

"پھر ان جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں موسیٰ کے خیال میں اس طرح آئیں کہ وہ دوڑ رہی ہیں۔"

محدثین (ابن حجرؒ اور ابوبکر حصاصؒ) نے وضاحت کی ہے کہ یہ ان جادوگروں کی شعبدہ بازی تھی انھوں نے لاٹھیوں اور چمڑے کی رسیوں کے اندر پارہ بھر دیا تھا اور اس

میدان کے نیچے آگ جلا دی تھی، جس پر اوپر کی سطح پر مٹی تھی۔

ان ساحروں نے جب وہ رسیاں اور لاٹھیاں اس میدان میں ڈالیں تو وہ پارے کی گرمی سے اوپر کو اُڑنے لگیں اور سانپ کی طرح معلوم ہونے لگیں۔

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا نے اس تمام شعبدہ بازی پر پانی پھیر دیا اور ان رسیوں اور لاٹھیوں کو ٹھنڈا کر دیا۔ (قصص القرآن، جلد اول، ص ۴۱۹)

اسرائیلی روایات میں آتا ہے کہ سامری نے جبرئیل امین کے گھوڑے کے پیر کے نیچے سے مٹی اٹھائی تھی، وہ مٹی اس بچھیا میں ڈال دی، اس کی تاثیر سے اس مورت اور مجسمے میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔

اہلِ تحقیق نے اس کی تردید کی ہے۔

حضرت ابراہیم ابن ادہمؒ کا واقعہ:

شیخ علیہ الرحمہ نے ایک مجلس میں بلخ و بخارا کے مشہور صوفی ابن ادہمؒ کے حوالے سے یہ نصیحت کی تھی کہ جوانی میں دولت حاصل کرنے کی ہوس سب سے بڑا خطرہ اور سب سے بری پریشانی ہے۔

دولت ہی سے ہر خواہش پوری ہوتی ہے۔ چناں چہ بخارا کے ایک نوجوان سوداگر کا واقعہ ہے کہ وہ حضرت ابراہیمؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوا اور عبادت و ریاضت میں اس قدر ترقی کی کہ شیخ ابن ادہمؒ کو اس کی عبادت گذاری پر تعجب ہونے لگا، وہ اپنے شیخ سے بھی آگے بڑھ گیا۔

شیخ نے اس نوجوان تاجر کے باطنِ حال پر توجہ کی، مراقبے کے ذریعے اس کے باطنی اخلاق کا پتا چلایا کہ وہ کیا ہیں؟

شیخ پر منکشف ہوا کہ اس نوجوان سوداگر کی کمائی ناپاک ہے، اس کی ناپاک کمائی نے اسے دولت مند کر دیا ہے۔

شیطان نے اسے اپنی خبیث کمائی کے گناہ اور طعامِ خبیث کے اثرات کی طرف سے غافل کرنے کے لیے اسے کثرتِ عبادت، کثرتِ صوم صلوٰۃ میں مشغول کر دیا ہے۔

شیطان نے اس تاجر کو اسی غلط فہمی ڈال دیا ہے کہ صوم وصلوٰۃ کی کثرت تجھے کسی
خبیث کی معصیت سے محفوظ رکھے گی، نماز روزے کی کثرت، فرائض کے ساتھ نوافل
گذاری، شب بے داری، مال خبیث سے خیر وخیرات اور سخاوت کی کثرت کسبِ حرام
کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گی۔

اس شیطانی غلط فہمی کے سبب اس نوجوان کی عبادت گذاری اپنے شیخ طریقت
سے آگے بڑھ گئی ہے۔

شیخ نے اس کے باطن کا حال معلوم کر کے اس کے نفس کا علاج کیا کہ اسے اپنے
ساتھ کھانے پینے کی تاکید کردی، شیخ کی اس حکیمانہ تدبیر کی وجہ سے یہ نوجوان ناپاک
غذا سے بچ گیا اور جس قدر اس کا پیٹ ناپاک غذا سے محفوظ رہا اسی قدرت اس کی
عبادت میں اعتدال پیدا ہوتا رہا، یہاں تک وہ اپنے فطری معمول پر آگیا۔

ایک ہندو کی ذہنی تکلیف کو دور کیا:

ہر انسان کا دکھ، جسمانی ہو یا ذہنی ہو، صوفیائے حق برداشت نہیں کرتے تھے۔ وہ
انسان مسلم ہو یا غیر مسلم، بہ ہر حال انسان ہو۔

انسان تو پھر ابن آدم ہے، ان اہلِ دلی سے تو حیوانات کی تکلیف بھی برداشت
نہیں ہوتی تھی۔ چناں چہ شیخ کا واقعہ ہے کہ اپنے ایک غیر مسلم ہندو ہردیو کی ذہنی
تکلیف کو اس طرح دور کیا۔

دہلی کا ایک دکان دار ہردیو سے کہتا ہے کہ تم مسلمان حکومت کے ذمی ہو، ہردیو
اس کا ذکر شیخ سے کرتا ہے اور ذمی کے معنی پوچھتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہم سب خدا کے ذمی ہیں، کوئی انسان کسی انسان کا ذمی نہیں ہو سکتا۔
کیوں کہ کسی کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسان کی ویسی
حفاظت کر سکے جیسی خدا اپنے بندوں کی حفاظت کرتا ہے۔"

شیخ علیہ الرحمہ نے ذمی اور حربی کی فقہی بحث کو نہیں چھیڑا، عرف عام کے لحاظ
سے ذمی کے اور اہل ذمہ کے سیاسی تصور میں ایک قسم کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہے اور اس

مسلمان دکان دار نے اسی پہلو کے لحاظ سے ہردیو کے ساتھ چھیڑ خانی کی اور اسے مسلم
حکومت کا محکوم بتانا چاہا اور اس طرح ہردیو پر اپنی برتری ظاہر کی کہ ہم مسلمان ہیں،
ہماری حیثیت حاکم کی ہے، تم ہندو ہو، تمہاری حیثیت رعایا اور غلام کی ہے۔

شیخ علیہ الرحمہ نے ذمی کا جو مفہوم بیان کیا وہ ایک روحانی نکتہ نہیں ہے، بلکہ ایک
حدیث نبوی کی ترجمانی ہے۔

شیخ نے اس حدیث کا حوالہ نہیں دیا، کیوں کہ ہردیو کے لیے حدیث کا حوالہ بے
کار تھا، البتہ اس حدیث نبوی کو ایک روحانی نکتے کے طور پر پیش کیا۔

حدیث نبوی یہ ہے:

عن انسؓ قال قال رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم من صلى صلاتنا واستقبل قبلتنا ولكل ذبيحتنا فذالک المسلم الذى له ذمة اللّٰه و ذمة رسوله فلا تخفرو اللّٰه فى ذمته.

(بہ حوالہ بخاری شریف، مشکوٰۃ:۱۲)

"یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص ہماری طرح نماز پڑھے اور
ہمارے قبلے کی طرف منہ کرے اور ہمارا ذبیحہ استعمال کرے وہ مسلمان
ہے اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی ذمے داری میں ہے اور اللہ اور اس کے
رسول کی حفاظت میں ہے۔ پس اے لوگو! تم اللہ تعالیٰ کی حفاظت کو
توڑنے کی کوشش نہ کرنا۔"

محدثین لکھتے ہیں کہ

اى لاتخونو اللّٰه فى عبده ولا تتعرضوا فى حقه من ماله و ذمه و عرضه. (مرقاۃ)

"مسلمان کے مال، اس کی جان اور اس کی آبرو خدا کی حفاظت میں
ہے۔"

ان تینوں باتوں میں مسلمان کو نقصان نہ پہنچاؤ، یہ خدا کی امانت میں خیانت کرنا

ہے۔ حضرت شیخؒ نے اس حدیثِ نبوی کی ترجمانی فرمائی اور ہر دیو کی دل داری فرمائی۔

قرآن کریم نے کہا:

فَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ. (یوسف:۶۴)

اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں کا بہترین محافظ ہے، کیوں کہ وہ تمام عارضی اور وقتی مہربانی کرنے والوں سے زیادہ اپنے بندوں پر مہربانی کرتا ہے، وہ حقیقی مہربان ہے۔ دوسرے مجازی مہربان ہیں اسی کی رحمت متوجہ ہوتی ہے تو عالم اسباب میں۔ کسی انسان کے لیے ہم دردی اور محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، ورنہ نہیں! ۰

قرآن کریم نے اپنے رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ. (آل عمران:۱۵۹)

"اے نبی محترم! یہ خدا تعالیٰ ہی کی مہربانی اور اس کا کرم ہے کہ آپ نرم دل واقع ہوئے ہیں۔"

غالب کہتے ہیں

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہوجائے گا

حضرت شیخؒ نے اسلام کے اس حکم کی طرف اشارہ کیا کہ اسلامی حکومت میں (جس کا قانون قرآن وسنت ہو، یہ خلافت اسلامی ہے) کسی ذمی کو ذمی کہہ کر اس کی توہین کرنا جائز نہیں، پھر ہندوستان کی مسلم حکومت پر اسلامی خلافت کا اطلاق نہیں ہوتا، یہ حکومتیں مسلم خاندانوں کی حکومتیں تھی اور ان حکومتوں کی غیر مسلم رعایا کو ذمی کہہ کر انھیں مطعون کرنا اور چڑانا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟

قرآن کریم سورۂ انعام (۱۰۸) کی مشہور آیت ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ.

"اے مسلمانو! تم ان چیزوں کو (جان دار ہوں یا بے جان) جنھیں یہ اہل شرک خدا تعالیٰ کے علاوہ پوجتے ہیں برا نہ کہا کرو، ان کے لیے توہین آمیز

الفاظ استعمال نہ کیا کرو۔"

اس آیت پر فقہانے بڑا تفصیلی کلام کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ کسی غیر مسلم کو اس کے برے خیالات کے حوالے سے اسے مطعون کرنا، چڑانا جائز نہیں، یہاں تک کہ قرآن کریم کی ان آیات کا پڑھنا اور تلاوت کرنا بھی اس نیت سے درست نہیں جن آیات میں شرک کی مذمت کی گئی ہے۔

تبلیغ و دعوت کے موقعے پر بھی کسی کافر و مشرک کو اگر مخاطب کرنا ہے تو ایسے الفاظ سے مخاطب کرنا چاہیے جن الفاظ میں اس کی دل آزاری اور توہین نہ ہو۔

ذمیوں کے حقوق:

ذمیوں کے حقوق انسانی کے بارے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ ارشاد گرامی کافی ہے جسے قاضی ابو یوسفؒ نے اپنی کتاب (کتاب الخراج) میں نقل کیا ہے۔

اموالهم كاموالنا وانفسهم كانفسنا واعراضهم كاعراضنا.

"ان اہل ذمہ کے املاک واموال اور ان کی جانیں اور ان کی آبرو عزت ہمارے جان ومال اور آبرو کے برابر ہے۔"

ہندوستان، مقام دعوت:

حضرت صوفیائے ربانی کے روادارانہ نظریات اور کردار کا بہ غور مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ حضرات صوفیائے حق ہندوستان کو مقام دعوت کے طور پر اہمیت دیتے ہیں اور ہندوستان کے لیے صرف ایک رہائشی وطن کا تصور نہیں رکھتے، بلکہ ایسا وطن عزیز جس کی حیثیت ایک داعی الی الحق امت کے لیے مقام دعوت کی ہے۔

یوں تو ساری دنیا مسلمانوں کے لیے مقامِ دعوت ہے اور دنیا کی تمام محروم قومیں داعی برحق کی امت دعوت ہیں، لیکن بہ طور مقامِ دعوت ہندوستان کی خصوصیت یہ ہے

کہ اس سرزمین ہند نے سیاسی قوت سے نہیں بلکہ اسلام کی قوت توحید ومساوات سے متاثر ہو کر اسلام کو اپنے سینے سے لگایا۔

یہ ہیں اللہ والے!

خدا کے بندوں کو اسی قسم کے اللہ والوں کی ضرورت ہے۔ غالب کہتے ہیں ؎

ابن مریم ہو کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

ایک شاعر نے یار باوفا کی تعریف میں کہا ہے ؎

دے ساتھ وقتِ بد میں کون ایسا آشنا ہے
ہے قابلِ پرستش، جو یار باوفا ہے

صوفیائے حق نے مسلم معاشرے کو سنبھالا:

ان صوفیائے ربانی کی بنیادی خدمت یہ ہے کہ اس طبقہ اہل صفا نے مسلم سماج کو سنبھالا، مسلم حکومتوں کے دور میں دو طبقے تھے۔ ایک طبقہ امرا و اصحاب دولت کا، یہ لوگ حکمران خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور انھی کے پاس بڑی بڑی جاگیریں اور زمین داریاں تھیں۔ دوسرا طبقہ عام مسلمانوں کا تھا، جو محنت کش، پیشہ ور تھے۔ ان امرا کے نوکر و چاکر تھے۔ یہی طبقہ اکثریت میں تھا، اسی طبقے میں نومسلموں کی اکثریت تھی۔

اس طبقے کو سنبھال کر رکھنے، ان کی دل جوئی کرنے اور انھیں دین توحید پر قایم رکھنے کا کام ان صوفیائے حق نے انجام دیا۔

صوفیائے حق کی دل داری اور خدمت اس محنت کش اور ذلت زدہ طبقے کو حاصل نہ ہوتی تو پس ماندہ ہندوؤں میں دینِ توحید نہ پھیلتا۔ کیوں کہ یہ پس ماندہ لوگ اپنے ہندو برہمن رسوم سے تنگ آ کر ہی اسلام قبول کرتے تھے، پھر اسلام میں آ کر انھیں مسلم شرافت پرستوں کی ذلت آمیز رویے سے سابقہ پیش آتا تھا۔

صوفیائے کرام کی خانقاہیں تھیں جو ان کی اشک شوئی کرتی تھیں۔

حضرت شیخ المشائخ علیہ الرحمہ کی اپنی داستان غم:

حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے تمام مریدین خاص سے ان کے دکھ درد کی کہانیاں سنیں اور سن کر ان مریدین کو حسب حال نصیحت کی اور ایک شیخ روحانی کا جو فرض ہوتا ہے وہ ادا کیا اور شیخ علیہ الرحمہ کا یہی مقصد تھا۔

شیخ نے ان سب کی داستانیں سننے کے بعد اپنی داستان انھیں سنائی۔ فرمایا اب تم میری داستان سنو!

ایک اجنبی شخص میرے پاس آیا اور اس نے مجھ سے کہا دنیا میں سب سے زیادہ خوش نصیب آپ ہیں۔ جو نعمتیں بادشاہوں کو میسر نہیں وہ گھر بیٹھے سب لوگ آپ کے قدموں میں لا کر رکھتے ہیں۔ دنیا کے ہر آدمی کو طرح طرح کی فکرات ہیں مگر آپ کو نہ کھانے کا فکر ہے، نہ کپڑے کا فکر ہے، نہ مکان کا فکر ہے، نہ خدمت گاروں کا فکر ہے کہ بغیر فکر آپ کے لیے ہر چیز موجود ہے۔

مجھے اس اجنبی کی یہ بات سن کر رونا آ گیا اور میں نے اس سے کہا کہ یہ ہدیے اور سب نعمتیں اس واسطے لوگ مجھے دیتے ہیں کہ وہ لوگ کسی نہ کسی دکھ میں مبتلا ہوتے ہیں اور یہ عقیدہ لے کر آتے ہیں کہ میری دعا سے ان کا دکھ درد دور ہو جائے گا۔ اس طرح صبح سے شام تک اگر پچاس دکھیا بھی میرے پاس آئیں تو مجھے ان کے پچاس دکھ سننے پڑتے ہیں اور جب میں ان کے دکھ دور ہونے کے لیے خدا سے دعا کرتا ہوں تو ہر ایک کا دکھ اپنے اوپر طاری کرتا ہوں، کیوں کہ اس کے بغیر دعا قبول نہیں ہوتی۔ بس جو آدمی رات دن پچاس دکھوں میں مبتلا رہتا ہو اس کو نہ نعمتوں میں مزا آ سکتا ہے نہ خدمتوں میں نہ کسی اور چیز میں۔

شیخ نے اس اجنبی شخص سے یہ نہیں فرمایا کہ یہ تمام نذرانے جو میرے پاس آتے ہیں، میں انھیں اپنے کام میں نہیں لیتا، بلکہ شام ہونے سے پہلے میں ان تمام تحفوں اور نذرانوں کو آنے والے ضرورت مندوں پر تقسیم کر دیتا ہوں۔ یہ بات شیخ نے تواضع و

کساری کے طور پر نہیں فرمائی، ورنہ حقیقت یہی تھی۔

اعظ اور صوفی کی دعا میں فرق:

واعظ اور صوفی (حقیقی) کی دعاؤں میں یہ فرق ہے کہ واعظ کی دعا قال ہوتی ہے، صوفی کی دعا حال ہوتی ہے۔ قال کا تعلق زبان سے ہے، حال کا تعلق دل سے ہے۔

بنیادی طور پر تصوف نام ہی حال کا ہے، دل کے اخلاص کا ہے۔ حال میں قول و اقرار ضرور ہوتا ہے مگر پورا زور دل اور باطن کی کیفیت پر ہوتا ہے۔ اسی باطنی کیفیت کی اہمیت ہوتی ہے۔

قرآن کریم نے دعا کا طریقہ سکھاتے ہوئے دو باتوں کی ہدایت کی، ایک ہدایت یہ کی کہ دعا تضرع کے ساتھ کی جائے، دوسری ہدایت یہ کی کہ دعا خفیہ طور پر کی جائے، اعلانیہ نہ ہو، چھپا کر ہو، چپکے چپکے ہو۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ O (اعراف:۵۵)

"لوگو! اپنے پروردگار کو پکارو، آہ وزاری کے ساتھ اور پوشیدگی کے ساتھ
اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

قرآن کریم نے دعا کے لیے جو دو ہدایتیں دیں ان کا حاصل یہی ہے کہ دعا کو حال بنایا جائے، دل کی آواز بنایا جائے، صرف زبان سے الفاظِ دعا ادا کرنے پر اکتفا نہ کیا جائے۔

اردو والے تضرع کا ترجمہ، عاجزی اور گڑگڑانا کرتے ہیں، لیکن اس عربی لفظ کا صحیح مفہوم آہ وزاری ہے۔ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ نے "بہ زاری" کے لفظ سے ترجمہ کیا ہے۔ فارسی میں زاری کے معنی عاجزی کے ہیں۔

تضرع میں عاجزی کے ساتھ درد دل کا ہونا ضروری ہے، یعنی دکھ درد کا احساس۔ اپنے لیے دعا کرنے میں اپنے ذاتی دکھ درد کا احساس ہو اور دوسرے کے

لیے دعا کرنے میں جس کے لیے اور جس کی ہم دردی میں دعا کر رہا ہے اس کی مصیبت کا قلبی احساس ہو، اس کی مصیبت اپنے اوپر طاری کی جائے۔

لغوی اعتبار سے تضرع کے مادہ (ضَرَعَ باب نَصَرَ سے) میں اخفاء کا مفہوم موجود ہے۔ ضَرَعَ کہتے ہیں چپکے چپکے نزدیک آنا۔ باب فتح سے اس کے معنی عاجزی اختیار کرنا ہے۔

حقیقی عاجزی (بناوٹی نہیں) میں اخفا ہوتا ہے اس لیے عاجزی اور اخفا لازم و ملزوم ہیں۔ قرآن کریم نے تضرع کے بعد خفیہ کا لفظ محض تاکید و توضیح کے طور پر استعمال کیا ہے۔

رواجی دعا:

ایک دعا محض رواجی اور رسمی ہوتی ہے، تضرع کے لفظ سے اس رواجی دعا کی نفی کرنی مقصود ہے۔

رواجی دعا میں صرف دکھاوا ہوتا ہے، اپنی عبادت اور دعا گوئی کی شہرت مقصود ہوتی ہے، تاکہ لوگ مجھے بڑا دعا گو بزرگ سمجھ کر میری طرف رجوع ہوں۔

سرسید کا نظریۂ دعا:

سرسید کے تذکرے میں آتا ہے کہ وہ دعا کی تاثیر کے قایل نہیں تھے، ان کا نظریہ یہ تھا کہ دعا صرف عبادت کی حیثیت رکھتی ہے، کیوں کہ خدا نے حکم دیا ہے کہ مجھ سے دعا کرو، اس تعمیلِ حکم کا ثواب ملتا ہے لیکن دعا کرنے سے حالات نہیں بدلتے۔ خدا تعالیٰ نے جو نظامِ فطرت مقرر کر دیا ہے اس میں دعا سے تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ ہونا وہی ہے جو مقرر و مقدر ہو چکا ہے۔

میرے خیال میں سرسید کے سامنے رواجی دعائیں تھیں، جنھیں وہ بے روح سمجھتے تھے، اہلِ دل کی حقیقی دعاؤں کا انھیں تجربہ نہیں تھا، ورنہ وہ دعا کو بے اثر قرار نہ دیتے۔

وسروں کے لیے دعا کی فضیلت:

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

دعوة المرء المسلم لاخيه مظهر الغيب مستجابة عند راسه ملک موکل کلما دعاء لاخيه بخير قال الملک الموکل به، آمين ولک ولک مثل. (مشکوٰۃ ۱۹۴ بہ حوالہ مسلم)

"مسلمان شخص کی دعا اپنے بھائی کے حق میں اس کے پیٹ پیچھے قبول ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ اس کام کے لیے مقرر کر رکھا ہے کہ جب کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے لیے بھلائی کی دعا کرے تو وہ فرشتہ اس کی دعا پر آمین کہے اور یہ کہے کہ اے دعا کرنے والے تیرے حق میں بھی یہ دعا قبول کی گئی۔"

دعاء الخیر کی یہ فضیلت اس لیے ہے کہ دوسروں کے لیے دعا کرنے میں اگر وہ عا قرآنی ہدایات کے مطابق ہے تو اس سے ایمانی اور انسانی ہم دردی کا پوشیدہ جذبہ اہر ہوتا ہے، یہ ایثار ہے، اپنے دکھ درد کے مقابلے میں دوسرے کے دکھ درد کو ترجیح یتا ہے، بلکہ دوسرے کے درد کو اپنا درد سمجھتا ہے۔

یہ صفت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاص امتیوں (اولیاء اللہ) کی ہے، اس صفت (دردمندی) کا رنگ جب دعا کرنے والوں میں پیدا ہوتا ہے تو خدا ند عالم اس دعا کو رَد نہیں کرتا، کسی نہ کسی صورت میں اسے قبول کرتا ہے۔

ردمندی کا جذبہ:

قرآن کریم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صفت (دردمندی) کو ان فاظ میں بیان کیا ہے:

عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ. (توبہ:۱۲۸)

"لوگو! جو مصیبت اور سختی تم پر پڑتی ہے وہ رسول پاک (صلی اللہ علیہ وسلم)

پر گراں ہوتی ہے، تمہاری مصیبت اس نبی رحمت کی اپنی مصیبت بن جاتی ہے۔"

حضور علیہ السلام کی اس صفت وشان میں (**عَنِتُّمْ**) کا خطاب عام ہے، یعنی اے انسانو! (**اَیُّهَا النَّاسُ**) تمہاری ہر تکلیف۔

اہل ایمان اس خطاب میں بہ درجہ اولیٰ داخل ہوں گے، لیکن اس خطاب کو خاص کرنا یعنی اے ایمان والو! (**اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا**) کا مفہوم قرار دینا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رحمۃ للعالمین سے مطابقت نہیں رکھتا۔

حاصل یہ کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں بندگان حق کے بارے میں اسی لیے قبول ہوتی تھیں کہ آپ ہر مصیبت زدہ کی مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھ کر اور اپنی مصیبت کی طرح اس کو محسوس کر کے اس کو دور کرنے کی خداوند عالم سے دعا کرتے تھے --- اور موجودہ عالم برزخ میں بھی کرتے ہیں۔

عظمت رسالت کے پہلو سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں خدا کے پیارے بندے کی دعائیں تھیں، خدا تعالیٰ اپنے محبوب کی دعاؤں کو (مصلحت خیر کے مطابق) قبول کرتا تھا۔ یہ پہلو بھی عظیم ہے مگر پہلی صورت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے لیے کم نہیں کہ آپ کا سینہ تمام مخلوق خدا کی شفقت وہم دردی کا گنجینہ اور خزینہ تھا اور یہ پہلو آپ کے مقامِ دعوت سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام:

قرآن کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف کرتے ہوئے کہا:

اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ ○ (ہود:۷۵)

"بے شک ابراہیم (علیہ السلام) بردبار، برداشت کرنے والے، دردمند (ترس گار، نرم دل) اور خدا کی طرف رجوع (توجہ) کرنے والے، رجوع رہنے والے ہیں۔"

اَوَّاهٌ کا بہترین ترجمہ دردمند ہے جو شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے کیا ہے، **اَوَّاهٌ**

کا مادہ "آہ" ہے، یہ مبالغہ کا صیغہ ہے، یعنی کثرت سے آہیں بھرنے والا۔ اردو والے کہتے ہیں ہائے ہائے کرنے والا۔ غالب کہتے ہیں ۔

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں

مفسرین نے مبالغے کا مفہوم اس طرح ادا کیا:

کثیر النار علی الذنوب و کثیر التاسف علی الناس.

"اپنے گناہوں پر کثرت سے آہ و زاری کرنے والا اور لوگوں کے مصایب پر کثرت سے افسوس کرنے والا۔"

آنسوؤں میں خونِ جگر:

اقبال مرحوم نے انسانی درد وغم کے احساس کو خونِ جگر سے تعبیر کیا ہے، کہتے ہیں:

تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر کیا لذت اس رونے کی
جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکے
مسجد تو بنادی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی تھا برسوں میں نمازی بن نہ سکا

دعا کا صفتِ ربوبیت سے تعلق:

دعا کے بارے میں قرآن کریم فرماتا ہے:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ۝ (غافر:۶۰)

"اے لوگو! تمہارا رب اور تمہارا پروردگار حکم دیتا ہے کہ مجھے پکارو، مجھ سے دعا کرو، اور میرے سامنے دست سوال دراز کرو، میں قبول کروں گا، میں

تمہاری دعا پر پہنچوں گا۔ بے شک جو لوگ مجھ سے سوال کرنے میں عار محسوس کرتے ہیں وہ متکبر ہیں اور تکبر کرنے والوں کی سزا میرے پاس جہنم کا عذاب ہے۔"

خدا تعالیٰ نے اس حکم میں اپنی صفت ربوبیت اور شان پروردگاری کے حوالے سے حکم دیا کہ مجھ سے طلب کرو۔

رب کسے کہتے ہیں؟

اس آیت کریمہ کے اسلوب و پیرایے میں پہلی حکمت تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی صفت رب کو نمایاں کر کے حکم دیا۔

رب کون ہے؟

رب، رب العالمین ہے اور رب العالمین کے معنی یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی خود پرورش کر رہا ہے۔ کیوں کہ خالق ہے، اپنی مخلوق کے ہر طبقے کو زندہ رکھنے کے لیے اس کی پوری مدد کر رہا ہے۔

یعنی رب وہ ہے جو بے طلب دیتا ہے، بے مانگے عطا کرتا ہے۔ عطا کرنے اور مدد کرنے کو اس نے خود ہی اپنی ذمے داری قرار دیا ہے۔

ہم بندے اگر اپنی طرف سے کہیں کہ وہ خالق کل ہماری پرورش کا ذمے دار ہے تو ہمارے منہ سے ایسی بات گستاخی ہوگی۔

البتہ اس نے خود ہی اس بات کا اطمینان دلایا ہے اور فرمایا ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا.

(ہود:۶)

"زمین پر چلنے والا کوئی جان دار ایسا نہیں جس کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمے نہ ہو۔"

رب کا تعارف کراتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے قرآن

نے کہا:

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ○ قَالَ رَبُّنَا الَّذِىْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَىْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ○ (طٰہٰ: ۴۹-۵۰)

"فرعون نے کہا، اے موسیٰ و ہارون! تمہارا رب کون ہے؟ موسیٰ نے جواب دیا ہمارا رب وہ ہے، جس نے ہر شے کو وجود بخشا اور اس کی رہنمائی کی۔"

جو معدوم تھا وہ کیا طلب کرتا؟ بے طلب اسے وجود عطا کیا اور پھر ہر شے کو اس کے حسب حال زندہ رہنے کا فطری شعور عطا کیا اور اس کا سروسامان کیا۔ یہ ہے رب العالمین کا تعارف۔

استاد داغ نے رب العالمین کی تشریح کی اور کہا:

بے طلب جو ملا، ملا مجھ کو — بے غرض جو دیا، دیا تو نے
جس قدر میں نے تجھ سے خواہش کی — اس سے مجھ کو سوا دیا تو نے
داغ کو کون دینے والا ہے — جو دیا اے خدا دیا تو نے

صوفیائے اسلام اور ہندوستان کے سنت سادھو:

صوفیائے اسلام اور ہندوستان کے سنت سادھوؤں کے درمیان یہ فرق ہے کہ ہندوستان کے بدھا اور مہابیر (جین) نے اس دکھ بھری دنیا سے تنگ آ کر اسے چھوڑ دیا اور تارکِ دنیا ہو گئے اور اسلام کے صوفیا نے دکھ بھری دنیا میں رہ کر دکھی انسانوں اور مصیبت زدہ انسانوں بلکہ حیوانوں کے دکھوں کا علاج کیا، ہر درد و دکھ کو اپنا دکھ قرار دے کر دوا و دعا دونوں سے مصیبت زدہ مخلوق کی مدد کی۔

ترکِ دنیا (رہبانیت) اسلام میں ممنوع قرار دی گئی ہے، اس لیے صوفیائے اسلام نے ترک کی جگہ قلت اور تجرد کی زندگی کو اپنایا یعنی اپنی ذاتی زندگی کو دنیوی علائق اور عیال داری کے جھمیلوں میں کم سے کم مبتلا کیا۔

جسم کی نفسانی خواہشات کا علاج روزوں اور کم سوتے (قلت طعام اور قلت

نیام اور قلت صحبت انام) سے کیا۔

اس طرح ذاتی مصایب کے علاج کے لیے جو وقت خرچ ہوتا اسے بھی مخلوق خدا کی مددگاری میں خرچ کیا۔

مثل مشہور ہے کہ دنیا دوسروں کے دکھ رو کے سنتی ہے اور ہنس کے اُڑاتی ہے، یہ فطرت انسانی کا نہایت کم زور پہلو ہے۔

حضرات صوفیا نے اس فطری کم زوری کو خوف خدا کے جذبے اور نفس کشی کی ریاضتوں سے دبایا اور اپنا یہ رویہ رکھا کہ رو کے سنتے تھے اور رو کے ہر مصیبت کا علاج کرتے تھے۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اس مشن (دردمندی اور ہم دردی) کے داعی تھے مگر آپ کی عیال داری کا دایرہ وسیع تھا اور یہ آپ کے مقام نبوت اور مقام دعوت کی خصوصیت تھی کہ عیال داری اور کثرت ازواج کی مصلحت پر صنف نازک اور صنف کم زور کے ساتھ ہم دردی اور کفالت کا پہلو غالب تھا۔

خواہش نفس کی مصلحت برائے نام تھی۔

عقیدت کا فتنہ اور انبیائے کرام:

صوفیائے ربانی عقیدت کے فتنے (غرور نفس) کا علاج اپنے حاسدوں کی برائیوں اور گستاخیوں سے کرتے تھے، مگر حضرات انبیائے کرام کا معاملہ صوفیا سے مختلف ہے۔

حضرات انبیا اہل ایمان و محبت کی عقیدت کو دایرے میں رکھنے کی پوری کوشش، قولی تنبیہات اور عملی کردار کے نمونے دونوں طریقوں سے کرتے تھے۔

پھر خدا تعالیٰ کی طرف سے انبیا کے باطن اور ان اخلاق کی مکمل حفاظت کی جاتی تھی اور ان حضرات کے اندر اہل عقیدت کی عقیدت مندی سے کسی قسم کی غفلت، انانیت اور غرور نفس کا ادنیٰ شایبہ بھی پیدا نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔

رہا معاملہ اہل حسد کے بغض و عناد کا تو انبیائے کرام کے ساتھ ہر قسم کی دشمنی اور

کدورت درجۂ کفر کا گناہ قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ نبی کا مقامِ نبوت اور نبوت کی صداقت روشن آفتاب کی طرح واضح اور یقینی ہوتی ہے۔

نبوت و رسالت کا منصب خداوندی سلطنت کا سرکاری منصب ہے۔

ولایت آسمانی منصب اور سرکار خدوندی کا وہ ہی منصب نہیں ہے بلکہ ولایت اور تقرب الی اللہ کا مقام انسان کے اپنے کسب اور اپنی صالح جدوجہد سے ہے، اس منصب پر ایمان لانا فرض ہے۔

بہ خلاف ولایت کے — ولی پر عقیدہ رکھنا اور کسی ولی کو ولی جاننا ضروری نہیں ہے، کیوں کہ ہر ولی کی ولایت میں اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ وہ ولی نہ ہو بلکہ ریا کار ہو۔

ضروری وضاحت:

مشہور شارح تصوف و تاریخ جناب ڈاکٹر خلیق احمد نظامی مرحوم کے ایک مضمون سے اخذ کیا گیا جو ڈاکٹر صاحبؒ نے خواجہ حسن نظامی مرحوم کی یاد میں شائع کیے گئے تذکرے میں نقل کیا ہے۔ (مارچ ۲۰۰۰ء)

تحفہ خواتین

ستر بڑے گناہ

تاریخ اسلام

اشاعت اسلام
یعنی
دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا؟

اللہ سے شرم کیجیے

اشرف الجواب